قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جنوری 2026 قیمت ₹25

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

علی گڑھ اردو کتاب میلہ کی تصویری جھلکیاں

اردو دنیا

ماہنامہ

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:28، شمارہ:1، جنوری 2026

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال

معاون مدیر : نایاب حسن

مشیر : حقانی القاسمی

معاونین : شاداب شمیم، فیضان الحق، محمد فرقان عالم

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

سالاسار امیجنگ سسٹمس

A-97، سیکٹر 58، نوئیڈا۔ 201301 (یوپی)

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد امتیاز حسن

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/25 روپے سالانہ -/240 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس:26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔ 500002

فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ

- ہماری بات 4

خطوط

- ربط و التفات قارئین کے خطوط 5

رپورٹ

- علی گڑھ اردو کتاب میلہ ادارہ 7

زبان و تعلیم

- امتزاجی تعلیم: عصر حاضر کی ایک ناگزیر ضرورت محمد مہتاب عالم 20

ادب: زاویے اور جہات

- ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور مراثی انیس کے خواتین کردار شعیب نجمی 23

- عبدالحلیم شرر کی تاریخی ناول نگاری احسان عالم 28
- نیر مسعود کی تحقیقی خدمات صالحہ عاصم 31
- ماحولیاتی تنقید: مسائل و امکانات محمد اویس ملک 34

شخصیات

- ندا فاضلی کی نظم نگاری حبیب الرحمٰن 37

- ڈاکٹر منشاءالرحمٰن خان منشا کی غزل گوئی شیخ عمران 40
- قیصر الجعفری کی غزلیہ شاعری محمد اویس سنبھلی 43
- ڈاکٹر بشریٰ رحمٰن کی ادبی خدمات ذاکر حسین ذاکر 46

فلم اور اردو

- بالی وڈ اور اردو: زبان، ثقافت اور شناخت کا امتزاج عبدالحافظ فاروقی 48
- ڈراما 'انارکلی' اور فلم 'مغل اعظم' کا تقابلی مطالعہ وسیم احمد 51

گوشۂ دھرمیندر

- دھرم جی کی یاد میں فرحان حنیف وارثی 53

- دھرمیندر: انسانیت اور اداکاری کا سنگم منتظر قائمی 58
- دھرمیندر: مداح اردو محی الدین عبداللطیف 61

صحافت

- قانونی صحافت میں روشن مستقبل کے امکانات خواجہ عبدالمنتقم 63

یاد رفتگاں

- پروفیسر دیوان حنان خاں... معصوم مرادآبادی 66

خصوصی گفتگو

- مظہر الزماں خاں سے انٹرویو محمد ارشاد عالم 68

نیا آسماں، نئے ستارے

- 'لالہ رام نرائن لال' اور 'رام دیال اگروالا' کی خدمات مریم صبا 71

کتابوں کی دنیا

- تبصرہ و تعارف ادارہ 74

خبرنامہ

- اردو دنیا کی خبریں ادارہ 86

ہماری بات

انسانی تاریخ میں علم وفن کی حصولیابی اور نئی نسل تک اس کی منتقلی کا ایک موثر اور بنیادی وسیلہ کتابیں ہیں۔ کتابوں کے ذریعے سے ہی یہ ممکن ہو سکا کہ انسان اپنے افکار وخیالات اور مشاہدات وتجربات کو محفوظ کر سکے۔ اگر ان کی حفاظت کا بندوبست نہ ہوتا تو انسانی ترقی ناممکن تھی۔ ہر نئی نسل اپنے بزرگوں کے علم وفن سے ناواقف ہوتی اور اسے از سرِ نو چیزوں کو سیکھنے کی ضرورت پیش آتی۔ گویا انسانی تہذیب کے ارتقا میں ہر نسل ایک بچے کی طرح اپنی زندگی کی شروعات کرتی اور چند مشاہدات وتجربات کے علاوہ زبانی سطح پر جو چیزیں منتقل ہو سکتیں انھیں تک محدود رہتی اور پھر فنا ہو جاتی۔ اس طرح انسان علوم وفنون کے باریک نکات سے دیر تک مستفید نہیں ہو سکتا تھا۔ کتابوں نے زبانی علوم کو ایک دستاویزی شکل عطا کی اور انھیں مستقبل میں آنے والوں کے لیے محفوظ کر دیا۔ اس طرح ہر نسل اپنے پیشرووں کے افکار وخیالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پروان چڑھتی ہے اور علوم وفنون کے نئے معرکے سر کرتی ہے۔ گویا کتابیں انسانی تاریخ کا نہ صرف ایک مضبوط حوالہ ہیں بلکہ انسانی ترقی کا زینہ بھی ہیں۔

کتابوں نے زمانہ قدیم سے لے کر اب تک ہر میدان میں انسانوں کی رہنمائی کی ہے۔ علوم وفنون کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں حوالہ جاتی کتب موجود نہ ہوں اور ان سے استفادہ نہ کیا جا رہا ہو۔ گزرتے وقت کے ساتھ ان کتابوں کی اہمیت و افادیت کے پہلو مزید روشن ہوتے جا رہے ہیں۔ اسی وجہ سے نہ صرف پرانی کتابوں بلکہ نئے نئے موضوعات پر تازہ مطبوعات کی پیش کش میں اضافہ دیکھنے کو مل رہا ہے۔ یہ صورت حال اس بات کی علامت ہے کہ کتابوں نے اپنی بادشاہت کا ہر زمانے میں لوہا منوایا ہے۔ ابلاغ وترسیل کے دوسرے تمام تر ذرائع کے باوجود کتابوں کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اکیسویں صدی کو گذشتہ صدیوں سے اس اعتبار سے الگ تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس نے الیکٹرانک میڈیا، ڈیجیٹلائزیشن، تکنیکی وسائل اور سوشل میڈیا کے سبب ایک منفرد طرزِ زندگی کی نمائندگی کی ہے۔ ان وسائل کے استعمال نے آج کے نوجوان کو زیادہ حساس، جذباتی، تیز رفتار اور باریک بیں بنا دیا ہے۔ ایسے میں سب سے زیادہ خطرہ کتابوں سے قربت اور استفادے کو لاحق ہے۔ اسی وجہ سے ان خدشات کا اظہار کیا جاتا ہے کہ نسلِ نو کتابوں سے دور ہوتی جا رہی ہے اور اس کے اندر سنجیدگی وٹھہراؤ میں کمی دیکھنے کو مل رہی ہے۔ لیکن جب گہرائی سے اس کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ آج ریڈرشپ میں غیر معمولی اضافہ دیکھنے کو مل رہا ہے۔ یہ نسل اوہام پرستی اور سنی سنائی باتوں پر عمل پیرا ہونے کے بجائے تحقیق وجستجو کو ترجیح دیتی ہے اور زیادہ تر معلومات خود پڑھ کر حاصل کرتی ہے۔ معلومات حاصل کرنے کا اس کا طریقہ مختلف ہو سکتا ہے، لیکن وہ مسئلے کی اصل تک پہنچنا چاہتی ہے۔ انٹرنیٹ، سوشل میڈیا اور ڈیجیٹل پلیٹ فارم پر اپنی غیر معمولی موجودگی درج کرانے کے باعث وہ معلومات کو اولاً یہیں تلاش کرتی ہے۔ ایسے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی نسل کی کتابوں سے دوری کا رونا رونے کے بجائے کتابوں کو اس تک صحیح طریقے سے پہنچانے کی تدبیر کی جائے۔ یہ نسل اپنے مقصد کے تئیں پرعزم اور حوصلہ مند ہے۔ اس لیے اگر اس کے مزاج کی کتابیں تیار کر کے پیش کی جائیں تو وہ ان سے بھرپور استفادے کے لیے بیقرار ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر عمر اور میدان کے قارئین کو ذہن میں رکھتے ہوئے کتابیں تیار کی جائیں اور انھیں منظم طریقے سے نئی نسل تک پہنچایا جائے۔ نئی نسل سیکھنے اور عمل کرنے پر یقین رکھتی ہے۔ اسے اگر کتابوں سے آشنا کرنا ہے تو ہمیں اپنے طرزِ تخلیق وپیش کش کو بھی بدلنا ہوگا۔ کتاب کلچر کو فروغ دینے کے جدید ترین وسائل سے کام لینا ہوگا۔ نیز معیاری کتابوں کی ترتیب وتیاری کے ساتھ نئے پلیٹ فارم پر ان کی دستیابی کو بھی ممکن بنانا ہوگا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی جو کہ حکومت ہند کے شعبہ اعلیٰ تعلیم کے ماتحت فروغ اردو کا ایک فعال ادارہ ہے، نئی نسل میں کتاب کلچر کو فروغ دینے کے لیے کوشاں ہے۔ اس سلسلے میں کونسل نے کئی قابل ذکر کارنامے انجام دیے ہیں۔ علم طب، سائنس، تاریخ، جغرافیہ، زبان وادب اور ادب اطفال کے نئے تقاضوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے کتابوں کی طباعت سے لے کر مختلف شہروں میں کتاب میلوں کا اہتمام اس کی زندہ مثال ہے۔ حالیہ دنوں میں کتاب میلوں کے ساتھ مختلف ادبی وثقافتی پروگراموں کے انعقاد اور ان میں نئی نسل کی شمولیت نے کتاب کلچر کو فروغ دینے میں کونسل کی کوششوں کو بامعنی بنا دیا ہے۔ اسی ضمن میں علی گڑھ اردو کتاب میلہ (22 تا 30 نومبر 2025) کا انعقاد بھی شامل ہے۔ جہاں نئی نسل کی ایک بڑی تعداد کی شرکت نے اسے کامیاب بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس میلے میں نوجوانوں کی موجودگی اردو زبان و ادب سے ان کی گہری وابستگی کا ثبوت ہے اور کتاب کلچر کے فروغ کی زندہ مثال ہے۔

ربط والتفات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گزارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

دسمبر 2025 کا اردو دنیا تمام تر تحقیقی وتنقیدی مشمولات کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔ صد شکریہ ونوازش! غالب کے یوم پیدائش کے حوالے سے آپ کی پرمغز گفتگو، علمی وادبی مباحث کے در کھولتی ہے۔ نیز غالب کی قدآوری اور عظمت کے اعتراف کا ایک زریں باب بھی ہے۔ مشکور ہوں کہ آپ نے میرے تاثراتی پیغام کو''ربط و التفات'' کے صفحات پر جگہ دی۔ مقالات ومضامین جدید تر موضوعات پر مبنی ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ عصر حاضر کی تمام تر ادبی سرگرمیوں کا احاطہ کرنا اردو دنیا کی ترجیحات میں شامل ہے۔ ''انداز بیاں اور'' کے تحت عظیم المرتبت شاعر پر خصوصی گوشہ اور دیگر مضامین ادبیت، علمیت نیز تحقیق کے نئے زاویوں پر مشتمل ہیں۔ سال نو کی پرخلوص مبارکباد!

ڈاکٹر رضوانہ پروین ارم: صدر شعبۂ اردو' جمشید پور ووِمنس یونیورسٹی' جمشید پور (انڈیا)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند، نئی دہلی کی جانب سے شائع ہونے والا ماہنامہ ''اردو دنیا'' دسمبر کا شمارہ مجھے وقت پر ڈاک سے موصول ہوگیا۔

ماہنامہ اردو دنیا ایک خالص علمی وادبی نوعیت کا رسالہ ہے، رسالے میں پوری اردو دنیا کے نامور ادیبوں، قلمکاروں اور دانشوروں کے دلچسپ، معلوماتی غیر سیاسی مثبت انداز میں لکھے گئے غیر مطبوعہ مضامین فیچرز شائع ہوا کرتے ہیں

موجودہ شمارے کے مشمولات کو دیکھتے ہی اندازہ ہوگیا کہ سبھی تحریریں ادبی وعلمی تقاضوں کو پورا کر رہی ہیں۔ رسالہ اردو دنیا زبانِ اُردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا ایک بہترین رسالہ ہے۔ اس کا ہر شمارہ 100 رنگین صفحات پر مشتمل ہوتا ہے ساتھ ہی کا فوٹوز ودلچسپ مضامین کے ساتھ طلبا واساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور زبان کے عام قارئین کے علمی وادبی ذوق کو پورا کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ کونسل کی جانب سے ماہنامہ خواتین دنیا، بچوں کی دنیا اور سہ ماہی فکر و تحقیق بھی پابندی سے شائع ہوا کرتے ہیں۔ اُردو کتابوں کی اشاعت میں کونسل بہت اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ پروردگار عالم کونسل کے سبھی عہدیداروں و عملے کو صحت و سلامتی عطا فرمائے رکھے کہ زبان اُردو کی ترقی کے لئے بہت محنت کرتے ہیں۔

افضل بیگ: بنگلور، کرناٹک

ماہنامہ ''اردو دنیا'' دسمبر 2025 کا شمارہ موصول ہوا، اداریہ کافی اہم ہے جس میں غالب کے حوالے سے بہت ہی فکری گفتگو کی گئی ہے، اختصار کے ساتھ غالب اور تنقید غالب پر جو باتیں کی جاسکتی تھیں وہ کی گئی ہیں۔ رسالہ کے مشمولات بہت ہی فکری اور معنی خیز ہیں گوشۂ غالب کے تحت ''دکن اور دیوان غالب کی شرحیں''، ''غالب کی فارسی شاعری''، ''غالب کی شاعری اور تمنا کا دوسرا قدم'' اور'' جدت خیال اور ندرت بیان کا شاعر: غالب'' جیسے مضامین معلوماتی ہونے کے ساتھ فکری بھی ہیں جن سے غالب کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

انڈین نالج سسٹم اور زبان وتعلیم کے ضمن میں ''انڈین نالج سسٹم اور موجودہ تعلیمی نظام کا تقابلی مطالعہ''، ''شمولیاتی تعلیم کی روشن دنیا'' اور''خواتین میں اعلیٰ تعلیم کا فروغ'' جیسے مضامین تعلیم سے متعلق قدیم ہندوستانی روایت، خصوصیات اور تعلیم گاہوں پر مرکوز ہونے کے ساتھ طریقۂ تعلیم اور تعلیم کے میدان میں خواتین کی ترجیحات کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ شخصیات، یادرفتگاں، ابلاغیات، گوشۂ قاسم

خورشید، فارسی ادبیات، کتابوں کی دنیا اور خبر نامہ جیسے حصے بھی ماہنامہ ''اردو دنیا'' کے تنوع کو واضح کرتے ہیں جس سے قاری زبان و ادب کے ساتھ دیگر موضوعات سے بھی واقفیت حاصل کرسکتا ہے۔ مجموعی طور پر ماہنامہ ''اردو دنیا'' کا پیش نظر شمارہ استفادے کے لائق ہے۔ اس کے لیے مدیر کے ساتھ ادارتی ٹیم کو بہت بہت مبارکباد۔

محمد فیصل: محلّہ فقیر تکیہ ضلع کٹیہار (بہار)

''اُردو دنیا'' نومبر 2025 پیش نظر ہے۔ اداریہ کے بعد ''ربط و التفات'' میں قارئین کے تین خطوط شامل ہیں جن میں مفید مشورے شامل ہیں۔ ان کے بعد زیر نظر شمارہ میں درجن بھر ادبی ابواب شامل ہیں۔ ''تعلیم اور ٹکنالوجی'' میں محترم دھرمیندر پردھان کا مضمون بعنوان ''مغربی گھاٹوں میں بھارت کی عظیم کہانی کا جنم'' شامل ہے۔ اس مضمون کا موضوع تامل ناڈو کے ایک مختصر سے شہر اور اس کے گرد و نواح میں سائنسی و تکنیکی تعلیم اور اختراع ہے۔ ''ادب زاویے جہات'' میں چھ مقالے شامل ہیں۔

اس سلسلہ کا دوسرا مضمون ڈاکٹر محمد ذاکر نے لکھا ہے اور عنوان دیا ہے ''تہذیب، ثقافت اور تمدن : ایک جائزہ'' مضمون خاصا علمی و ادبی مفاہیم لیے ہوئے ہے۔ تیسرا مضمون جناب غلام غوث کا تحریر کردہ ہے اور عنوان ہے ''زبانی قصہ گوئی کی روایت''۔ انہوں نے وضاحت کی ہے کہ قصہ گوئی انگریزی میں اسٹوری ٹیلنگ اور عربی میں محض قصہ کہلاتی ہے اور واحد مستعمل ہے۔ جمع کے اعتبار سے قصص ہے جیسے قصص الصحابۂ یا احسن القصص کہا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ کا چوتھا مضمون جناب محمد شاہنواز خان کا تحریر کردہ ہے اور عنوان دیا ہے ''تخیل، مطالعہ کائنات اور تفحص الفاظ کا تجزیہ'' جسے مصنف نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' کی روشنی میں تحریر کیا ہے۔ پانچواں مضمون جناب عبداللہ صاحب نے تحریر کیا ہے اور عنوان دیا ہے ''فورٹ سینٹ جارج کالج کی اُردو خدمات'' اسے اس کالج کی ادبی تاریخ ہی سمجھ کر پڑھ لیجیے کیوں کہ اس کے مطالعے سے درحقیقت علم میں نہایت اضافہ ہوگا۔ چھٹا اور آخری مقالہ جناب انور ہادی جنیدی نے تحریر کیا ہے اور عنوان ہے ''امیر خسرو کی پہیلیاں، لسانی حسن اور فکری رنگ'' اس مقالے کی تیاری میں انھوں نے 10 حواشی اور چار ماخذ سے مدد لی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ امیر خسرو کی پہیلیاں اُردو عوامی ادب کا بنیادی سرمایہ ہیں جس میں انھوں نے زبان کو مٹھاس، ذہنی تفریح اور فکری بالیدگی عطا کی ہے۔ ''شخصیات'' کے ذیل میں تین مقالے شامل ہیں۔ پہلا مقالہ جناب ابرار احمد اجراوی کا تحریر کردہ ہے اور عنوان دیا ہے ''شکیل الرحمٰن کا تنقیدی موقف''۔ دوسرا مضمون جناب محمد ارشد نے پیش کیا ہے اور عنوان دیا ہے ''شمس الرحمٰن فاروقی کے افسانے، ہند ایرانی تہذیب کا بیانیہ'' مضمون نگار نے اپنے اس عمدہ مقالے کو نو حوالہ جات کی مدد سے سنوارا ہے اور اپنے موضوع سے پورا پورا انصاف کیا ہے۔ اس سلسلے کی تیسرے کڑی جناب اسلم رحمانی کا مضمون ہے۔ عنوان دیا ہے ''وہاب اشرفی کی تنقیدی بصیرت'' اس کی ابتدا تعارفی جملوں سے ہوتی ہے اور یہ کہ انھوں نے افسانہ نویسی سے اپنی ادبی زندگی کی شروعات کی۔ انھوں نے اپنی تحقیق و تنقید میں بڑی بے باکی کا ثبوت دیا ہے جیسے ملاوجہی کی قطب مشتری اور اس کا تنقیدی جائزہ ''قدیم ادبی تنقید معنی کی تلاش، نقوش ادب وغیرہ۔'' ''کلاسیکی شعر و ادب'' میں ایک مضمون دیا گیا ہے جسے جناب عبد الباری نے لکھا ہے اور عنوان دیا ہے ''مومن خاں مومن شخصیت اور شاعری''۔ ''زبان و تعلیم'' کے ذیل میں۔ دو مضامین شامل ہیں۔ ان میں پہلا مضمون بعنوان ''بنیادی تعلیم'' شامل ہے جسے انھی کی کتاب ''اصول تعلیم اور عمل تعلیم'' سے اخذ کیا گیا ہے اور جسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے شائع کیا ہے۔ اس کے مترجم ڈاکٹر خلیل الرحمٰن سیفی پریمی ہیں۔ اس سلسلے کا دوسرا مضمون ڈاکٹر آفتاب عالم نے تحریر کیا ہے اور عنوان دیا ہے ''گروکل کا تعلیمی نظام اور جدید تعلیم''۔ ان کے مطابق ہندوستان کا قدیم تعلیمی نظام ہزاروں سال پہلے معرض وجود میں آیا جو کثیر شعبہ جاتی نظام پر مشتمل تھا۔ ''صحافت'' کے ذیل میں دو مضامین دیے گئے ہیں۔ پہلے مضمون کا عنوان ہے ''1857 سے قبل کے فارسی اخبارات اور ان کے غیر مسلم مدیران'' دوسرا مضمون بعنوان ''ماہنامہ نیا دور کا ادبی اور صحافتی سفر'' ضرور پڑھ لیجیے۔ ''تراجم اور ترجمہ نگاری'' کے ذیل میں دو مضامین درج ہیں۔ پہلا مضمون بعنوان ''دلت ادب اور پریم چند'' کے مصنف ہیں نامور سنگھ جبکہ مترجم ہیں شیو پرکاش۔ دوسرا مضمون جناب محمد سہیل نے تحریر کیا ہے جس کا عنوان ہے ''انور جلال پوری کے منظوم اُردو تراجم ایک مطالعہ''۔ ''سائنس'' کے تحت ایک مضمون درج ہے۔ عنوان ہے ''سائنس کی لائبریری'' اسے ڈی این شرما، آر سی شرما نے لکھا ہے اور اس کے مترجم ہیں غلام دستگیر۔ ''خصوصی گفتگو'' میں جناب غلام قادر نے جناب خالد علوی کا انٹرویو پیش کیا ہے۔ ''فلم'' میں ڈاکٹر منتظر قائمی نے ''شیام بینگل اور متوازی سینما'' پر اپنا مقالہ پیش کیا ہے ''کتابوں کی دنیا'' کے تحت مختلف اصناف ادب پر کوئی نو کتب کا تعارف و تبصرہ پیش کیا گیا ہے تاکہ آپ اُن کی روشنی میں ضروری کتب کا انتخاب کرسکیں۔ ''خبر نامہ'' میں اُردو دنیا کی خبریں درج ہیں۔ اچھی بہت اچھی، اور وفیات کی شکل میں افسوسناک بھی۔ اس تمام تر تفصیل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اردو دنیا ایک درخشاں ماہنامہ ہے جو تنہائی کا مشفق ساتھی اور علم و ادب میں بہترین صلاح کار کی حیثیت رکھتا ہے۔

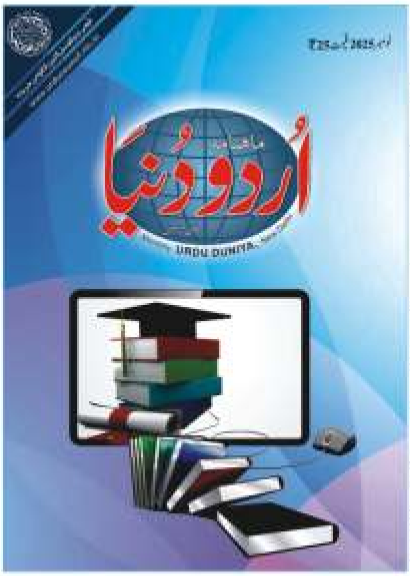

مصطفی ندیم خاں غوری: روضہ باغ، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

ادارہ

علی گڑھ اردو کتاب میلہ

اردو زبان کی ترویج و اشاعت اور کتاب کلچر کا فروغ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اہم مقاصد ہیں۔ کونسل اس ضمن میں مسلسل کوششیں کرتی آئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک 25 سے زائد کتاب میلوں کا اہتمام کیا جاچکا ہے۔ قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے کتاب کلچر کو فروغ دیتے ہوئے اس قسم کے میلوں میں مختلف ادبی و ثقافتی تقاریب کا اہتمام کرکے تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا ہے۔ حالیہ دنوں میں لکھنؤ، حیدرآباد، دہلی اور چنار کتاب میلے اس کی واضح مثالیں ہیں۔ علی گڑھ اردو کتاب میلہ 2025 بھی اس سلسلے کی ایک یادگار کڑی ہے جس کا انعقاد کلچرل ایجوکیشن سینٹر، اے ایم یو علی گڑھ میں 30-22 نومبر کیا گیا۔ اس میلے میں شائقین کتب کی ایک بڑی تعداد نے نہ صرف شرکت کی بلکہ ذوق و شوق سے کتابیں خریدیں اور ادبی و ثقافتی تقاریب میں بھی شریک ہوئے۔ اس میلے میں 30 سے زائد ادبی و ثقافتی پروگرام منعقد ہوئے جن میں150سے زائد فلمکاروں نے شرکت کی۔ پیش ہے اس کتاب میلے کی یومیہ رپورٹ۔

پریس کانفرنس (21 نومبر 2025)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے کلچرل ایجوکیشن سینٹر، علی گڑھ میں منعقد ہونے والے علی گڑھ اردو کتاب میلہ (22 تا 30 نومبر 2025) کے افتتاح سے قبل ادارے کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے صحافیوں سے ملاقات کی اور انھیں اس میلے کے تعلق سے اہم معلومات فراہم کیں۔ آپ نے کتاب میلے کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اسے کتاب کلچر کے فروغ کا ایک اہم ذریعہ قرار دیا۔ آپ نے بتایا کہ اس اہم اردو کتاب میلے کا افتتاح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلر عزت مآب پروفیسر نعیمہ خاتون صاحبہ کریں گی۔ اس کے علاوہ مہمانان اعزازی میں پدم شری پروفیسر سید ظل الرحمٰن اور رجسٹرار ایم یو، علی گڑھ پروفیسر عاصم ظفر صاحب شامل رہیں گے۔ افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ معروف مصنف، فکشن نگار جناب سید محمد اشرف صاحب پیش کریں گے اور سر سید اکیڈمی، علی گڑھ کے اعزازی ڈائریکٹر پروفیسر شافع قدوائی اظہار خیال فرمائیں گے۔

ڈاکٹر شمس اقبال نے صحافیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ اس کتاب میلے میں مختلف موضوعات پر کتابوں کے ساتھ قریب پچاس پبلشرز شامل ہورہے ہیں، جن کا تعلق گجرات، تلنگانہ، مہاراشٹر، کشمیر، دہلی، اتر پردیش جیسے مختلف صوبوں سے ہے۔ میلے میں متعدد ادبی وثقافتی پروگرام کا انعقاد بھی کیا جارہا ہے۔ منعقد ہونے والے اہم ادبی پروگراموں میں مصنّفین سے ملاقات، داستان گوئی، شام غزل، طرحی مشاعرہ، بچوں کے پروگرام اور ادب وثقافت کے رنگ شامل ہیں۔ ڈاکٹر اقبال نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ نئی نسل کی دلچسپیوں کے مدنظر ایک خاص پروگرام کا بھی اہتمام کیا جارہا ہے جس میں بچوں کے تئیں مختلف

پروگرام منعقد ہوں گے۔ ادبی نوعیت کے پروگراموں کے علاوہ ثقافتی پروگرام بھی اس میں شامل ہیں۔ اس موقع پر سرسید اکیڈمی کے اعزازی ڈائریکٹر اور معروف اکیڈمیشین پروفیسر شافع قدوائی نے میڈیا سے مخاطب ہوتے ہوئے اس کتاب میلے کے تئیں نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے قابل ستائش قدم قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ اس میلے کے ذریعہ اردو دنیا کے مختلف گوشوں تک کتابوں کی فراہمی میں آسانی ہوگی۔ کلچرل ایجوکیشن سینٹر، اے ایم یو، علی گڑھ کے کوآرڈینیٹر پروفیسر محمد نوید خان نے ثقافتی پروگرام کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ادب کا ثقافت سے گہرا رشتہ ہے۔ جو ثقافتی پروگرام اس میلے میں منعقد کیے جا رہے ہیں ان کا تعلق بھی زبان وادب سے ہے۔ ڈاکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی نے بھی کتاب میلے کے تئیں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ صحافیوں سے ملاقات کے اس موقع پر کونسل کے افسران وارکین کے علاوہ کئی اہم شخصیات موجود رہیں۔

پہلا دن : افتتاحی پروگرام

(22 **نومبر** 2025)

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام علی گڑھ اردو کتاب میلے کا افتتاح آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کلچرل ایجوکیشن سینٹر میں عمل میں آیا۔ اے ایم یو کی وائس چانسلر پروفیسر نعیمہ خاتون نے فیتہ کاٹ کر کتاب میلے کا باضابطہ افتتاح کیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے علی گڑھ اردو کتاب میلے کے افتتاحی اجلاس میں تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ علی گڑھ اردو کتاب میلہ نئی نسل میں کتاب کلچر کو فروغ دینے کی سمت ایک اہم قدم ہے اور اس قسم کی کاوشیں مسلسل جاری رہنی چاہئیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کا علی گڑھ سے بہت گہرا تعلق ہے کیوں کہ یہاں ہر زمانے میں اردو کے مشہور ومعروف ادیب، شاعر اور محقق پیدا ہوتے رہے ہیں، جنھوں نے اردو کے علمی و ادبی سرمایے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس میلے کا مقصد اردو کتابوں کی ترویج، زبان و ادب سے وابستہ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی اور نسلِ نو میں مطالعے کی عادت کو پختہ کرنا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس نو روزہ کتاب میلے کے دوران مختلف علمی، ادبی اور ثقافتی تقریبات کا بھی اہتمام کیا جائے گا، جن میں مختلف شعبوں کے ماہرین

شرکت کر کے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ اس کتاب میلے کی اصل کامیابی یہ ہوگی کہ اس میلے میں شریک ہو کر لوگ اردو زبان و ثقافت کے تئیں قلبی لگاؤ محسوس کریں اور اس ماحول سے تحریک پا کر اردو کے نئے قارئین پیدا ہوں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلر پروفیسر نعیمہ خاتون نے اپنے خطاب میں کہا کہ علی گڑھ اردو کتاب میلہ ہمارے لیے علمی، ادبی اور ثقافتی جشن کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے کتاب کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ کتابیں ہماری سوچ اور سماجی شعور کو بلند کرتی ہیں۔ انھوں نے اردو زبان کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ اردو نے ہر دور میں اپنا وقار برقرار رکھا ہے اور بڑے بڑے شعرا و ادبا نے اسے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا ہے۔ انھوں نے طلبہ سے خصوصی اپیل کی کہ وہ کتاب میلے میں آئیں اور زیادہ سے زیادہ کتابیں خریدیں۔ پدم شری پروفیسر سید ظل الرحمٰن نے صدارتی خطاب میں کہا کہ علی گڑھ واحد ادارہ ہے جہاں مختلف موضوعات کے اسکالرز نے اردو میں متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ انھوں نے سامعین کو مشورہ دیا کہ جب آپ کتاب سے محبت کریں گے تو کتاب بھی آپ سے محبت کرے گی۔ کتاب پڑھیں، کتاب سے محبت کریں اس کے بغیر آپ کو علم نہیں آئے گا۔ انھوں نے زور دیتے ہوئے کہا کہ موجودہ دور میں اردو ریڈرشپ بڑھانا نہایت ضروری ہے اور مادری زبان سے محبت کا تقاضا ہے کہ ہر شخص اردو سیکھے۔

کلیدی خطبہ معروف افسانہ نگار سید محمد اشرف نے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ کتابوں کو زندگی میں جگہ دیجیے کیونکہ کتابیں ہمیں سوچنے، سمجھنے اور غور و فکر کرنے کی صلاحیت عطا کرتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ٹیکنالوجی اپنی جگہ اہم ہے، لیکن کتاب کا لمس، خوشبو اور اس کا اثر بالکل منفرد ہوتا ہے۔ انھوں نے نوجوانوں کو مشورہ دیا کہ اپنے گھر میں ایک چھوٹی سی لائبریری ضرور بنائیں۔ جیسے ہی کتاب زندگی میں آئے گی، آپ کے سوچنے کے انداز میں ٹھہراؤ آجائے گا۔ پروفیسر شافع قدوائی (اعزازی ڈائریکٹر، سرسید اکیڈمی، اے ایم یو علی گڑھ) نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ علی گڑھ میں انھیں تقریباً چالیس برس ہو گئے ہیں، مگر انھوں نے نو دنوں پر مشتمل ایسا ہمہ گیر، علمی و ادبی اجتماع کبھی نہیں دیکھا۔ انھوں نے کہا کہ ہم ڈیجیٹل دور میں جی رہے ہیں جہاں کتابوں سے دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے، حالانکہ کتابیں ہمارے تخیل اور فکری قوت کو بڑھاتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کتاب کی اہمیت و افادیت کل بھی مسلم تھی، آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ شکریے کی رسم ڈاکٹر محمد نوید خان (کوآرڈینیٹر کلچرل ایجوکیشن سینٹر اے ایم یو) نے ادا کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر فیضان الحق نے انجام دیے۔ اس تقریب میں کونسل سے شائع شدہ بچوں کی پانچ کتابوں 'بھولی ہوئی لومڑی' (غضنفر) 'حیرت انگیز کارنامہ' (نعیمہ جعفری پاشا) 'پریم دیوانی میرا' (ثروت خان) 'روبوٹ' (اقبال برکی) اور 'پالکی' (شاہ تاج خان) کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

افتتاحی پروگرام کے بعد آج کا دوسرا پروگرام 'آئینہ ہے روبرو' (میرا تخلیقی سفر: مصنفین سے ملاقات) تھا، جس میں پروفیسر طارق چھتاری، پروفیسر غضنفر اور ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا نے اپنے تخلیقی سفر کے حوالے سے گفتگو کی اور سامعین سے اپنے تجربات شیئر کیے۔ اس پروگرام کے موڈریٹر ڈاکٹر توصیف بریلوی تھے۔

دوسرا دن (23 نومبر 2025)

کتاب میلے کے دوسرے دن 'سماجی روایات رسومات اور محاورات کا زوال: اسباب و امکانات' 'اردو زبان کا مستقبل نئی نسل کے حوالے سے'، اور 'چلو بات کر کے دیکھتے ہیں) شاعروں سے گفتگو(کے عنوان سے تین اہم مذاکرے منعقد ہوئے۔ 'اردو زبان کا مستقبل نئی نسل کے حوالے سے' میں ڈاکٹر شہناز رحمٰن، ڈاکٹر مہر فاطمہ، صدام حسین مضطر اور ڈاکٹر شفا مریم نے اپنے خیالات کا اظہار کیا، جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر فہمیدہ علی نے انجام دیے۔ ڈاکٹر شہناز رحمٰن نے

اپنی گفتگو میں اردو زبان کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ نوجوان نسل اردو کی طرف متوجہ ہو رہی ہے، بس ان کی صحیح رہنمائی اور ان کو مناسب پلیٹ فارم فراہم کرنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر مہر فاطمہ نے اردو زبان کی ترویج میں سوشل میڈیا کا مثبت کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آج کے لکھنے والے اپنی تخلیقات کو بآسانی بڑے پیمانے پر شیئر کر رہے ہیں اور اس کے ذریعے اردو کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے۔ ان کے مطابق اردو زبان کی فطری کشش نوجوانوں کو اپنی جانب کھینچ رہی ہے۔ ڈاکٹر شفا مریم نے کہا کہ اردو زبان کا سیکھنا نہایت ضروری ہے، تاہم دوسری زبانوں پر بھی عبور وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ملٹی لنگول ہونا نہ صرف فائدہ مند ہے بلکہ عصر حاضر کا تقاضا بھی ہے۔ صدام حسین مضطر نے کہا کہ اردو زبان ہندوستان کی تہذیبی شناخت کا اہم مظہر ہے آج کے دور میں اس کی مقبولیت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ عالمی سطح پر بھی اردو ادب، فلم، موسیقی اور غزل کے ذریعے ایک منفرد مقام بنا چکی ہے۔

چلو بات کر کے دیکھتے ہیں) شاعروں سے گفتگو (مذاکرے میں اردو ادب کے ممتاز شعرا اور نقاد پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر مہتاب حیدر نقوی اور شکیل جمالی شامل ہوئے، جبکہ اس مذاکرے کی موڈریشن ڈاکٹر نوشاد کامران نے کی۔ پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ شاعری انسانی جذبات کی نہایت لطیف ترجمانی ہے، جو فرد کے اندرونی احساسات کو معاشرے کے بڑے کینوس پر نقش کرتی ہے۔ پروفیسر شہپر رسول نے مشاعرے کی تہذیبی اور سماجی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ماضی میں مشاعرے محض شعری محفلیں نہیں ہوتے تھے بلکہ ایک مکمل تہذیبی ادارے کی حیثیت رکھتے تھے۔

پروفیسر مہتاب حیدر نقوی نے کہا کہ شاعری الہامی نہیں بلکہ اکتسابی عمل ہے کوئی بھی مصرع آسمان سے نازل نہیں ہوتا۔ یہ بھی ٹیبل ورک جیسا عمل ہے۔ شکیل جمالی نے اپنی گفتگو میں کہا کہ شاعری انسان کو اس کی داخلی دنیا سے جوڑنے کا ہنر رکھتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کے تیز رفتار دور میں شاعری انسان کو ٹھہر کر سوچنے، محسوس کرنے اور اپنے باطن سے مکالمہ کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اس مذاکرے میں تینوں شاعروں نے اپنے کلام سے سامعین کو بھی محظوظ کیا۔

ان مذاکروں سے پہلے 'سماجی روایات، رسومات اور محاورات کا زوال: اسباب و امکانات' پر مذاکرہ منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی (ڈیپارٹمنٹ آف جیوگرافی اے ایم یو)، پروفیسر وبھا شرما (ڈپارٹمنٹ آف انگلش اے ایم یو)، ڈاکٹر فوزیہ فریدی (ویمنز کالج علی گڑھ) اور ڈاکٹر ہما پروین (ڈیپارٹمنٹ آف ماس کمیونیکیشن اے ایم یو) شریک ہوئے۔ اس مذاکرے میں معاشرے میں روایت کی کمزور ہوتی بنیادوں، زبان میں محاوراتی تنزل اور سماجی اقدار کے بکھرتے ہوئے ڈھانچے پر تفصیلی گفتگو کی گئی۔ شرکائے مذاکرہ نے اپنی گفتگو میں اس امر پر افسوس ظاہر کیا کہ جدیدیت اور تیزی سے بدلتی ہوئی زندگی کے طور وطرز نے ہماری قدیم سماجی روایات اور بہتر رسومات کو حاشیے پر دھکیل دیا ہے، جن کا کبھی ہماری تہذیب میں بنیادی مقام ہوا کرتا تھا وہ روایات جو ماضی میں خاندانوں، میل جول اور باہمی احترام کو مضبوط کرتی تھیں، آج تیزی سے ماند پڑتی جا رہی ہیں۔ شرکا کا کہنا تھا کہ ماضی کی بہت سی روایات نہ صرف سماجی رشتوں کو مضبوط بناتی تھیں بلکہ نوجوان نسل کی تربیت میں بھی بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان روایات اور رسومات میں ان عناصر کا احیا کیا جائے جو انسان کو انسان سے جوڑتے ہیں، سماجی ذمے داری کا احساس پیدا کرتے ہیں اور تہذیبی وقار کو برقرار رکھتے ہیں۔ اس مذاکرے کی موڈریشن زینب فائزہ اسلام نے کی۔ اس موقعے پر پروفیسر نازیہ حسن نے ایک داستان پیش کی، جس کی موڈریشن خدیجہ نے کی۔ علی گڑھ کتاب میلے میں یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ کثیر تعداد میں عمائدین شہر نے شرکت کی اور یہاں کے بک اسٹالوں پر محبان اردو کا ہجوم رہا اور کثیر تعداد میں لوگوں نے اپنے ذوق اور شوق کے مطابق کتابیں بھی خریدیں۔

تیسرا دن (**24 نومبر** 2025)

اردو کتاب میلہ کے تیسرے دن 'جدید تکنیکی وسائل اور اردو صحافت: امکانات و چیلنجز' اور 'طبِ یونانی اور اردو زبان و ادب' کے موضوعات پر مذاکرے ہوئے۔ 'جدید تکنیکی وسائل اور اردو صحافت: امکانات و چیلنجز' کے حوالے سے ڈاکٹر راحت ابرار، جناب وجیہ الدین، پروفیسر خالد سیف اللہ اور جناب اشرف بستوی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر راحت ابرار نے کہا کہ یہ ٹیکنالوجی کا دور ہے اور آج کے صحافی کے لیے تکنیکی مہارت ناگزیر ہے۔ اردو صحافت کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا وقت کی ضرورت ہے، تبھی ہم دوسری زبانوں کی صحافت کا مقابلہ کرسکیں گے۔ انھوں نے مزید کہا کہ نوجوانوں کو ڈیجیٹل ٹولز اور آن لائن پلیٹ فارمز کے استعمال کی باقاعدہ تربیت دی جانی چاہیے۔ جناب وجیہ الدین ٹائمز آف انڈیا کے سینئر سب ایڈیٹر نے اردو صحافت کی ایک روشن اور زریں روایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ جدید ترین وسائل کی کمی اردو اخبارات کا اہم مسئلہ ہے، لیکن بہتر حکمتِ عملی اور ٹیکنالوجی کے مؤثر استعمال سے صورتِ حال کو بہت حد تک بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ پروفیسر خالد سیف اللہ (شعبہ اردو، اے ایم یو علی گڑھ) ادبی صحافت پر روشنی ڈالی اور صحافتی زبان کو اپنی گفتگو کا محور و مرکز بناتے ہوئے جدید ترین ٹیکنالوجی کی وجہ سے آنے والی آسانیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ رسائل کی ترسیل میں پہلے جو دشواریاں تھیں اسے جدید ترین ٹکنالوجی نے آسان بنا دیا ہے۔ اب ذرا سی دیر میں اخبارات اور مجلّات کی سافٹ کاپی دور دراز کے علاقوں تک پہنچائی جاسکتی ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ اردو صحافت تبھی زندہ اور فعال رہے گی جب قارئین کی تعداد بڑھے گی اور نئی نسل اس کے ساتھ جڑی رہے گی۔ ویب پورٹل ایشیا ٹائمز کے ایڈیٹر جناب اشرف علی بستوی نے کہا کہ اردو صحافت کا بیشتر مواد انٹرنیٹ پر JPG یا PDF فائلوں کی صورت میں موجود ہے، مگر سرچ کرنے میں بہت سی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ اردو ادارے اور اخبارات اپنی ویب سائٹس کو بہتر بنائیں، متن کو یونی کوڈ میں منتقل کریں اور ڈیجیٹل آرکائیونگ کو فروغ دیں تاکہ اردو صحافت کا ذخیرہ عالمی سطح پر زیادہ قابلِ رسائی ہوسکے۔ اس مذاکرے کے موڈریشن کے فرائض ڈاکٹر اسعد فیصل فاروقی نے انجام دیے۔

اس سے قبل 'طب یونانی اور اردو زبان و ادب' کے عنوان سے منعقد ہونے والے مذاکرے میں پروفیسر اشہر قدیر، پروفیسر آسیہ سلطانہ اور حکیم فخر عالم پینلسٹ کے طور پر شریک ہوئے جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شاداب شمیم نے انجام دیے۔ پروفیسر اشہر قدیر نے بتایا کہ طب یونانی قدیم ترین طریقہ علاج ہے اور اردو زبان میں اس کے منتقل ہونے سے عوام الناس کو بے حد فائدہ پہنچا۔ انھوں نے افسوس کا اظہار کیا کہ علم طب پر لکھنے والوں کی تعداد مسلسل کم ہو رہی ہے جس کے باعث طبی رسائل کا سلسلۂ اشاعت بھی متاثر ہوا ہے۔ پروفیسر آسیہ سلطانہ نے حکومتِ ہند کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یونانی طب کے باضابطہ شعبے کا قیام ایک بڑا اقدم ہے جس سے تحقیق اور تدریس کے نئے پہلو سامنے آئے ہیں۔ انھوں نے طلبہ اور اہلِ علم کو مشورہ دیا کہ عصری تقاضوں کے مطابق اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان میں بھی تحریری صلاحیت پیدا کریں تاکہ عالمی سطح پر علم طب کی رسائی میں اضافہ ہو۔ حکیم فخر عالم نے طب یونانی اور اردو زبان کے گہرے رشتے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو میں یونانی طب کی بے شمار مستند کتابیں تحریر کی گئیں اور خاص بات یہ

ہے کہ شعروادب کی دنیا میں بہت سے اطبا مستند نام کی حیثیت رکھتے ہیں اور طب اور ادب دونوں میں ہی ان کی شناخت مستحکم ہے۔ اس پینل کے بیشتر شرکا نے کہا کہ اردو زبان و ادب میں یونانی طب کا بیش قیمت ذخیرہ موجود ہے اور اس زبان کے فروغ اور تحفظ میں یونانی طب کا بھی بہت اہم کردار ہے۔ کتاب میلے کے تیسرے دن منعقد ہونے والے یہ دونوں مذاکرے اپنے موضوعات اور حاضرین کی بھرپور دلچسپی کی بنا پر بہت کامیاب رہے۔ حاضرین نے اس بات کا اعتراف کیا کہ کتاب میلے کی یہ علمی محفلیں نہ صرف نئے افکار و اقدار سے روشناس کراتی ہیں بلکہ سوچ کے بند دروازوں کو بھی وا کرتی ہیں۔

چوتھا دن (25 نومبر 2025)

علی گڑھ اردو کتاب میلہ میں آج 'معاصر تحقیق و تنقید: سمت و رفتار'، 'اردو میں سائنسی ادب' اور 'انگریزی شاعری پر مخلوط ثقافت اور زبان کا اثر' کے عنوان سے اہم مذاکرے منعقد ہوئے۔ 'معاصر تحقیق و تنقید: سمت و رفتار' کے عنوان سے منعقدہ مذاکرے میں پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی (صدر شعبۂ اردو، اے ایم یو)، ڈاکٹر جمیل اختر (معروف ناقد)، پروفیسر محمد علی جوہر اور پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی (شعبۂ اردو، علی گڑھ) شریک ہوئے۔ مقررین نے موجودہ دور کی تحقیق و تنقید کے بدلتے رجحانات اور مسائل پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی نے کہا کہ معاصر تحقیق نئے نظریاتی مباحث اور تکنیکی تبدیلیوں کے ساتھ تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے، اس لیے محققین کو بین العلومی نقطۂ نظر اپنانا ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ معیاری تحقیق کے لیے مطلوبہ وسائل و اخلاقیات کو اپنائے بغیر موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر جمیل اختر نے کہا کہ مولوی عبدالحق اردو کے اولین محقق و ناقد تھے، جن کے طریقۂ تحقیق کو بروئے کار لاکر موجودہ دور کے محققین بھی عمدہ تحقیق کا نمونہ پیش کر سکتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ قومی اردو کونسل نے اردو کے کلاسیکی ادب کے سرمائے کو محفوظ کرنے کی قابلِ تحسین کوشش کی ہے۔ پروفیسر محمد علی جوہر نے کہا کہ معیاری تحقیق وہ ہوتی ہے جو اپنے عہد کے فکری، تہذیبی اور علمی سوالات کا واضح جواب فراہم کرے۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے کہا کہ تحقیق نہایت سنجیدہ اور مشکل کام ہے، جس کا حق ادا کرنے کے لیے اعلیٰ درجے کی سنجیدگی، وسعتِ مطالعہ اور علم و تحقیق کے تئیں غیر معمولی دلچسپی درکار ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کل رسائل میں شائع ہونے والے اکثر مضامین تنقید کے دائرے میں آتے ہیں، تحقیقی مضامین بہت کم لکھے جا رہے ہیں۔ اس مذاکرے کے موڈریٹر ڈاکٹر فیضان الحق تھے۔

'اردو میں سائنسی ادب' کے موضوع پر آج کا دوسرا مذاکرہ منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر عبدالمعز شمس (معروف ماہرِ امراضِ چشم اور ادیب)، ڈاکٹر فائزہ عباسی (ڈائریکٹر HRDC)، اور جناب عادل فراز شریک ہوئے جبکہ مذاکرے کی موڈریشن کے فرائض ڈاکٹر حسینہ خانم نے انجام دی۔ ڈاکٹر عبدالمعز شمس نے کہا کہ طب، حیاتیات اور جدید سائنسی تحقیق پر موجود مواد کو سادہ اور بامحاورہ اردو میں پیش کیا جائے تاکہ عام قارئین میں سائنسی شعور پروان چڑھے۔ انھوں نے کہا کہ نئی نسل کو اردو میں معیاری سائنسی مواد فراہم کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ڈاکٹر فائزہ عباسی نے کہا کہ اردو میں سائنسی اصطلاحات کو معیاری بنانے اور جدید سائنسی مباحث کو مقامی تناظر میں سمجھانے کے لیے ادارہ جاتی سطح پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے تعلیمی اداروں سے اپیل کی کہ نصاب میں اردو سائنسی لٹریچر کو جگہ دی جائے تاکہ طلبہ دونوں زبانوں میں مہارت حاصل کر سکیں۔ جناب عادل فراز نے کہا کہ اردو میں سائنسی ادب کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اردو کی غزلیہ اور نظمیہ شاعری میں سائنسی اشارے ملتے ہیں۔ ٹیکنالوجی، ماحولیات، فلکیات اور مصنوعی ذہانت سے اردو ادب ناآشنا نہیں ہے۔

اس سے قبل کلچرل ایجوکیشن سینٹر اے ایم یو کے اشتراک سے 'انگریزی شاعری پر مخلوط ثقافت اور زبان کا اثر' کے عنوان سے بھی ایک اہم مذاکرہ منعقد ہوا

جس میں پروفیسر ثمینہ خاتون (صدر شعبۂ انگریزی، اے ایم یو)، پروفیسر عائشہ منیرہ اور پروفیسر فضا تبسم اعظمی نے بطور پینلسٹ شرکت کی۔ نظامت مدیحہ ناز اور زنیرہ حبیبہ نے کی، جب کہ شکریہ کی رسم ڈاکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی نے ادا کی۔ پروفیسر ثمینہ خاتون نے کہا کہ انگریزی شاعری پر ہندوستانی تہذیب وزبان کے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں، کیونکہ کسی بھی صنفِ سخن پر مختلف ثقافتوں کا اثر پڑنا فطری ہے۔ انھوں نے کہا کہ اچھا ادب انسان میں دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کرنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ پروفیسر عائشہ منیرہ نے کہا کہ غزل کی صنف ہندوستان میں بے حد مقبول ہے، چاہے وہ اردو میں ہو یا انگریزی میں۔ ان کا کہنا تھا کہ انگریزی ادب وشاعری بھی دوسری زبانوں کے اثرات قبول کرتی ہے گرچہ انگریز اس بات سے بالکل انکار کرتے ہیں کہ ان کی شاعری بھی کسی دوسری زبان سے متاثر ہوئی ہے۔ پروفیسر فضا تبسم اعظمی نے کہا کہ انگریزی عالمی زبان ہے اور یہ ہمیں پوری دنیا سے جوڑتی ہے۔ مخلوط ثقافتی اثرات نے انگریزی شاعری کو نئی وسعت اور ہم آہنگی سے ہم کنار کیا ہے۔

کتاب میلے کے چوتھے دن بھی شائقین کی خاصی بھیڑ رہی۔ یونیورسٹی اور شہر کے اطراف واکناف سے بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ شرکا نے کتابوں کی موضوعاتی بوقلمونی پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے اس قدم کی ستائش کی کہ اس نے اہم کتابوں تک رسائی کا نہایت مؤثر ذریعہ فراہم کیا ہے۔

پانچواں دن (26 نومبر 2025)

علی گڑھ اردو کتاب میلہ 2025 پوری آب و تاب کے ساتھ جاری ہے۔ ہر دن شائقین کی تعداد میں مسلسل اضافہ دیکھنے کو مل رہا ہے۔ میلے میں منعقد ہونے والی ادبی اور ثقافتی تقاریب بھی لوگوں کی توجہ کا مرکز بن رہی ہیں اور انھیں اپنی جانب کھینچ رہی ہیں۔ اس سلسلے میں میلے کے پانچویں دن چار اہم پروگرام منعقد ہوئے جن میں بچوں کے 'ادبی رسائل' اور 'ڈیجیٹل دنیا میں کتابی ثقافت کا فروغ' کے عنوان سے دو اہم مذاکرے، نوجوان شاعروں کا مشاعرہ اور شام غزل شامل ہیں۔

پہلا مذاکرہ 'بچوں کے ادبی رسائل' کے عنوان سے منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر فیضان الحق نے معروف ادیب، مترجم اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے چانسلر جناب فیروز بخت احمد سے بات چیت کی۔ فیروز بخت احمد نے صحافت کے ساتھ اردو ادب کی جانب متوجہ ہونے پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور ادب اطفال کے تئیں اپنے جذبات کا بھی اظہار کیا۔ انہوں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ معلوم نہیں لوگ ادب اطفال کو اہمیت کیوں نہیں دیتے جب کہ اس کے بغیر بچوں میں تہذیب وثقافت منتقل نہیں کی جاسکتی۔ کسی بھی زبان وتہذیب کو زندہ رکھنے کے لیے بچوں کا اس سے واقف ہونا ضروری ہے۔ آپ نے بچوں کے ادبی رسائل سے اپنی وابستگی کا حوالہ دیتے ہوئے ماہ نامہ کھلونا، پیام تعلیم، غنچہ جیسے کئی اہم رسائل کا بھی ذکر کیا۔ اس گفتگو سے اندازہ ہوا کہ ادب اطفال پر توجہ دینے کی سخت ضرورت ہے اور اسے کسی بھی طرح سنجیدہ ادب سے باہر نہیں رکھا جاسکتا۔

آج کا دوسرا مذاکرہ 'ڈیجیٹل دنیا میں کتابی ثقافت کا فروغ' کے عنوان سے منعقد ہوا، جس میں مشہور کہانی کار، شاعرہ ومترجم ڈاکٹر عذرا نقوی، معروف ادیب وناقد ڈاکٹر زبیر شاداب اور نوجوان قلم کار ڈاکٹر نوشاد منظر بطور ایکسپرٹ اور ڈاکٹر حنیف خان بطور موڈریٹر شریک ہوئے۔ محترمہ عذرا نقوی صاحبہ نے اظہار خیال کرتے ہوئے کتابوں سے اپنے روایتی تعلق کا اظہار کیا اور ڈیجیٹل کتابوں کے موجودہ منظرنامے پر روشنی

ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ڈیجیٹل دنیا کے اہم فائدے ہیں اور اس نے رسائی کو آسان بنایا ہے۔ ڈاکٹر زبیر شاداب نے ڈیجیٹل پلیٹ فارم اور مطبوعہ کتابوں کے

مطالعے کے درمیان فرق کو واضح کرتے ہوئے مطالعے کی تہذیب پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر نوشاد منظر نے پورٹل پر کتابیں پڑھنے سے متعلق قارئین کے تجربات پر اظہار خیال کیا اور ٹھہراؤ کی کمی کا ذکر کیا۔ آپ نے حوالہ جات سے متعلق اس کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی۔

مذاکروں کے علاوہ آج کے کتاب میلے میں قومی اردو کونسل اور کلچرل ایجوکیشن سینٹر اے ایم یو، علی گڑھ کے اشتراک سے نوجوان طلباء علی گڑھ کے لیے شعری نشست کا اہتمام کیا گیا۔ اس پروگرام میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نائب شیخ الجامعہ پروفیسر محمد محسن خان بطور مہمان خصوصی موجود رہے۔ اس کی صدارت کے فرائض پروفیسر سید محمد محبّ الحق نے انجام دیے۔ جن شعرا نے اپنے کلام سے محظوظ کیا ان میں اظہر نواز، یاسر علی، سیف عرفان، سفر نقوی، اریب عثمانی، وسیم سدھارتھ نگری، کاظم رضوی، نظام الدین نظامی اور جاوید اشرف شامل ہیں۔ مہمان خصوصی پروفیسر محمد محسن خان نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں نے برسوں بعد ایسا میلہ علی گڑھ میں دیکھا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے علی گڑھ میں اس میلے کا اہتمام کیا۔ مشاعرے کی نظامت سید فہیم احمد نے اور شکریہ کی رسم ڈاکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی نے انجام دی۔

مشاعرے کے علاوہ کلچرل پروگرام کے تحت 'غزل اس نے چھیڑی' کے عنوان سے 'شام غزل' کا بھی انعقاد کیا گیا۔ جس میں گروپ سانگ کے ساتھ قوالی بھی شامل تھی۔ اس پروگرام میں علی گڑھ کی کمشنر محترمہ سنگیتا سنگھ بطور مہمان خصوصی حاضر ہوئیں۔ اس پروگرام میں جناب معراج نشاط، محترمہ یاسمین رضوی، محمد احسان، روہید نور، محراب عباسی، محترمہ فرحین نے خوبصورت انداز میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے سامعین کو محظوظ کیا۔ ڈاکٹر دانش محمود نے اس کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔ ان تمام پروگرام میں سامعین کی بڑی تعداد موجود ہیں اور وہ کتابوں کی خریداری کے ساتھ مختلف ادبی وثقافتی پروگراموں سے بھی محظوظ ہوئے۔

چھٹا دن (27 نومبر 2025)

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام جاری علی گڑھ اردو کتاب میلہ 2025 کے چھٹے دن بھی بڑی تعداد میں شائقین کتب موجود رہے۔ اساتذہ وطلبہ دونوں میں خوشی کی لہر دیکھی گئی۔ کتاب میلے میں آنے والوں کا عام تاثر یہ تھا کہ علی گڑھ میں پہلی بار ایسا کتاب میلہ منعقد کیا گیا ہے، جس میں ہر قسم کی کتابیں دستیاب ہیں اور لوگوں کو آسانی سے مل رہی ہیں۔ بعض طلبہ نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ جن کتابوں کے لیے ہمیں دور دراز کا سفر کرنا پڑتا تھا اور صعوبت برداشت کرنی پڑتی تھی وہ اس کتاب میلے میں بہ سہولت دستیاب ہیں۔ آرٹ کے علاوہ سائنس اور سوشل سائنس کے طلبہ نے یہ بھی محسوس کیا کہ انھیں اس کتاب میلے کے ذریعے اپنے نصابی حصار سے باہر نکلنے میں مدد ملی ہے اور مختلف ثقافتوں سے آشنائی کا موقع ملا ہے۔ کتاب میلے نے انھیں ایک نئی دنیا سے روبرو کیا ہے۔ یقینی طور پر قومی کونسل کا یہ اقدام قابل ستائش ہے۔ اس طرح کے میلوں

سے پورے معاشرے میں کتاب کلچر کا فروغ ہوگا۔

کتاب میلے میں آج بھی مختلف ادبی تقریبات کا اہتمام کیا گیا جن میں پہلا پروگرام کلچرل ایجوکیشن سینٹر، اے ایم یو اور قومی اردو کونسل کے اشتراک سے 'تہذیب علی گڑھ' کے عنوان سے منعقد ہوا۔ جس میں ایم یو کالج علی گڑھ کے طلبہ نے کلچرل پروگرام پیش کیے۔ اس موقعے پر کالج کے پرنسپل جناب سید محمد حیدر نقوی بھی موجود رہے۔ اس پروگرام میں ان کے ساتھ مہتاب نسیم بھی شریک رہے جنھوں نے موڈریشن کا فریضہ انجام دیا۔ اسی طرح کا دوسرا پروگرام 'تخلیق سخن ورکشاپ' کے عنوان سے منعقد ہوا جس میں اردو اور انگریزی شاعری کی باریکیوں پر مختلف ماہرین نے اظہار خیال کیا اور نئے سخنوروں کو اس کے رموز ونکات سے آگاہ کیا۔ اس اہم تربیتی پروگرام میں پروفیسر راشد نہال، ڈاکٹر سرور ساجد، ڈاکٹر فضیلہ شاہنواز شریک ہوئے اور آمنہ عاصم نے اس پروگرام کو موڈریٹ کیا۔

کتاب میلے کا تیسرا اہم پروگرام 'اردو صحافت میں زبان کا گرتا معیار' کے اہم موضوع پر منعقد کیا گیا، جس میں مختلف ماہرین نے اردو صحافت میں زبان کی صورتحال پر اظہار خیال کیا اور اس کے موجودہ لسانی منظرنامے پر روشنی ڈالی۔ اس پروگرام میں معروف اردو صحافی وکالم نگار جناب معصوم مرادآبادی، معروف صحافی وادیب جناب سراج نقوی، معروف صحافی وریزیڈنٹ ایڈیٹر روزنامہ 'سچ کی آواز' جناب جمشید عادل علیگ بطور پینلسٹ شریک ہوئے جبکہ معروف ادیب واسکالر ڈاکٹر شفیع ایوب نے اس پروگرام کو موڈریٹ کیا۔ صحافت سے عملی طور پر وابستہ ان افراد نے صحافت اور صحافت کی زبان کے حوالے سے مفید گفتگو کی۔ معصوم مرادآبادی نے بتایا کہ اردو صحافت کا آغاز مشن کے طور پر ہوا تھا مگر اب رفتہ رفتہ صحافت پروفیشن میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ سراج نقوی نے معیاری اردو کے حوالے سے کہا کہ معیاری اردو کا تعلق دراصل عوام سے ہوتا ہے اور معیاری اردو کوئی جامد چیز نہیں ہے۔ جمشید عادل علیگ نے اردو صحافت کی زبان کی بگڑتی ہوئی صورتحال پر گفتگو کی اور کہا کہ زبان بگڑی نہیں ہے، زبان میں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ اس پینل کے شرکا نے پرنٹ، الیکٹرانک اور ڈیجیٹل میڈیا کی زبان اور اس کے تقاضوں کے بارے میں بہت ہی بامعنی گفتگو کی۔ اس سیشن میں صحافت کے طلبہ بھی شریک رہے اور انھیں مقررین کے خیالات سے استفادے کا موقع ملا۔

ساتواں دن (28 نومبر 2025)

علی گڑھ اردو کتاب میلے کے ساتویں دن بھی شائقین میں خاصا جوش وخروش نظر آیا۔ بچوں کی بڑی تعداد نے میلے میں شرکت کی اور اپنے ذوق کی کتابیں بھی خریدیں۔ مقامی اسکول کے طلبہ کی شرکت نے اس کتاب میلے کی رونق میں اضافہ کیا۔ آج کے دن بھی کئی اہم پروگرام کا

انعقاد کیا گیا، جس میں اقرا پبلک اسکول کے طلبہ و طالبات نے محفل رنگ کے عنوان سے ایک خوبصورت پروگرام پیش کیا۔ اس کی ماڈریٹر عشیبہ احمد تحسین اور کو ماڈریٹر محمد اقدس تھے۔ اسکول کی پرنسپل محترمہ فاطمہ ارم اور مینیجر پروفیسر نسیم احمد خان بھی اس پروگرام میں شریک رہے۔ بچوں نے اپنی کارکردگی سے لوگوں کو خاصا متاثر کیا۔ بچوں کا یہ تربیتی پروگرام تھا لیکن انھوں نے احساس دلایا کہ انھیں اپنی ثقافت اور زبان سے گہرا لگاؤ ہے۔

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام ایک مذاکرے کا بھی اہتمام کیا گیا جس کا عنوان تھا 'قومی تعلیمی پالیسی 2020 اردو زبان: امکانات و مسائل' اس مذاکرے میں بطور پینلسٹ پروفیسر سید امتیاز حسنین اور پروفیسر شافع قدوائی نے شرکت کی۔ ڈاکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی نے ماڈریٹر کے فرائض انجام دیے۔ مقررین نے قومی تعلیمی پالیسی کے اہم نکات اور اہداف و مقاصد پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اردو اور انگریزی زبان کے ناقد اور کالم نگار پروفیسر شافع قدوائی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس پالیسی کے اندر زبان کے باب میں کوئی جبر نہیں ہے۔ اس میں تعلیم کے بنیادی تصورات پر ارتکاز کیا گیا ہے اور تدریسی نصاب میں ضروری تبدیلیوں کی سفارش کی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ قومی تعلیمی پالیسی کا ایک مقصد گلوبل سٹیزن بنانا بھی ہے کیوں کہ آج کے عہد میں ملٹی لنگول ازم پر زیادہ زور ہے۔ ماہر لسانیات پروفیسر امتیاز حسنین نے ملٹی لنگول ازم پر روشنی ڈالتے ہوئے ریجنل لینگویج اور شیڈول لینگویج کے تعلق سے گفتگو کی اور ان تمام خدشات کو بے بنیاد قرار دیا جو اردو کے تعلق سے بہت سے ذہنوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے بھی قومی تعلیمی پالیسی کے صحت مند اور افادی پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ قومی تعلیمی پالیسی 2020 اردو زبان اور اردو معاشرے کے لیے بھی

فائدے مند ہے، اس لیے غیر ضروری خدشات یا وسوسوں کا شکار ہونے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

آج کتاب میلے میں معروف داستان گو سید ساحل آغا اور معروف غزل سنگر ڈاکٹر نیتا پانڈے نے 'خسرو دریا پریم کا' کے عنوان سے میوزیکل داستان پیش کی۔ داستان گوئی کے آغاز سے قبل قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے شال پہنا کر تمام فن کاروں کی عزت افزائی کی اور اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان صدیوں سے بین مذاہب ہم آہنگی کا گہوارہ اور ثقافتی تنوع کا مرکز رہا ہے، جس کی ادبی و شعری نمائندگی اردو کے اولین شاعر امیر خسرو نے بڑی خوب صورتی سے کی ہے، یہ ہمارے لیے نہایت پر مسرت موقع ہے کہ ایسے سدا بہار شاعر کے حوالے سے اس میلے میں میوزیکل داستان گوئی کا اہتمام کیا جا رہا ہے اور معروف داستان گو اور پرفارمر اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ محبت کی ایک روشن اور تابندہ علامت کے طور پر خسرو کی شخصیت پورے ہندوستان میں اپنی منفرد پہچان رکھتی ہے، چاہے کوئی مسلمان ہو یا ہندو، سکھ یا عیسائی، ہر طبقے میں خسرو کی مقبولیت رہی ہے، اسی وجہ سے آج کی محفل داستان گوئی ان پر مرکوز ہے۔ اس میوزکل داستان گوئی سے کثیر تعداد میں سامعین و ناظرین محظوظ ہوئے۔

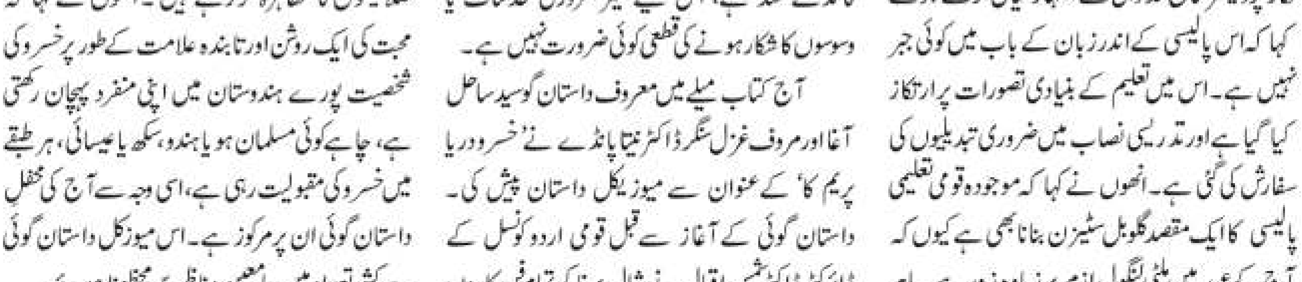

آٹھواں دن (29 نومبر 2025)

علی گڑھ اردو کتاب میلے کے آٹھویں دن بھی شائقین کا جوش و خروش قابلِ دید رہا۔ بچوں کی بڑی تعداد نے میلے میں شرکت کی اور اپنی پسند کی کتابیں خریدیں۔ مقامی اسکولوں کے طلبہ کی آمد نے میلے کی رونق میں مزید اضافہ کیا۔

آج ہونے والے اہم پروگرامز میں کلچرل ایجوکیشن سنٹر، اے ایم یو، علی گڑھ کے باہمی اشتراک سے البرکات پبلک اسکول اور البرکات آفٹرنون اسکول کے طلبہ و طالبات نے کاوشِ بزمِ ادب و ثقافت کے عنوان سے خوبصورت پیشکش سے نوازا۔ پروگرام کے ماڈریٹر محمد ارحم اور کو ماڈریٹر سیرۃ العین تھیں۔ اسکول کی پرنسپل محترمہ صبیحہ خان، ہیڈ مسٹریس محترمہ تاب انور اور مہمانِ خصوصی پروفیسر اصغر علی خان بھی اس میں شریک رہے۔ بچوں نے اپنی شاندار کارکردگی سے حاضرین کو متاثر کیا اور ثابت کیا کہ انہیں اپنی ثقافت اور زبان سے گہرا تعلق ہے۔

اسی طرح البرکات این سی پی یو ایل سینٹر، علی گڑھ کے طلبہ و طالبات نے بزمِ سخن کے عنوان سے ایک پُر اثر پروگرام پیش کیا جس کی ماڈریٹر مہوش مجتبیٰ تھیں۔ اس پروگرام میں سینئر فیکلٹی عبیدالرحمٰن، ڈائرکٹر ڈاکٹر سید محمد عثمان اور شعبہ بزنس ایڈمنسٹریشن کے صدر نے بطور مہمان شرکت کی۔ بچوں نے اپنی کارکردگی سے سامعین کو خوب محظوظ کیا۔

آج کی ادبی و ثقافتی تقریبات میں بلائنڈ طلبہ کے لیے مخصوص احمدی اسکول کے بچوں نے بھی شرکت اور اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ بڑی تعداد میں موجود ناظرین نے ان کی پیشکش کو بھرپور سراہا اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام دو مذاکرے اور ایک طرحی مشاعرہ بھی منعقد ہوا۔ پہلا مذاکرہ سائبر سیکیورٹی اینڈ سیفٹی کے عنوان سے تھا جس میں ماہرِ کمپیوٹر سائنس پروفیسر ایم این ہدیٰ اور رجسٹرار، اے ایم یو، علی گڑھ پروفیسر محمد عاصم ظفر نے بطور پینلسٹ شرکت کی۔ ڈاکٹر

فیضان الحق نے اس مذاکرے کو موڈریٹ کیا۔ پروفیسر ایم این ہدیٰ نے ڈیجیٹل دنیا میں بڑھتے ہوئے سائبر خطرات پر روشنی ڈالی اور ان سے نمٹنے کے لیے ضروری اقدامات پر زور دیا۔ پروفیسر محمد عاصم ظفر نے سائبر کرائم کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے ہوئے طلبہ کو آن لائن جرائم سے محفوظ رہنے کے مفید مشورے دیے۔

دوسرا مذاکرہ 'وہ بھولی داستاں لو پھر یاد آگئی: یادِ ایامِ علی گڑھ' کے عنوان سے منعقد ہوا، جس میں پدم شری پروفیسر اختر الواسع، نامور ناقد ڈاکٹر نرجس فاطمہ اور ممتاز کہانی کار و شاعرہ انجم قدوائی نے اظہارِ خیال کیا۔ ڈاکٹر افشاں ملک اس مذاکرے کی موڈریٹر رہیں۔ مقررین نے علی گڑھ سے وابستہ اپنی یادیں اور تاثرات سامعین کے سامنے پیش کیے۔

آج کے طرحی مشاعرے (مصرعِ طرح: اپنے نقشے کے مطابق یہ زمیں کچھ کم ہے) کی صدارت ممتاز ناقد و شاعر پروفیسر سراج اجملی صاحب نے کی۔ مشاعرے میں جناب عالم خورشید، محترمہ صبیحہ سنبل، ڈاکٹر سرور ساجد، ڈاکٹر مشتاق صدف، ڈاکٹر عمیر منظر، ڈاکٹر معید رشیدی، ڈاکٹر سرفراز خالد، جناب بصیر الحسن وفا نقوی اور ڈاکٹر افضل خان نے اپنا کلام پیش کیا جسے سامعین نے بے حد پسند کیا۔ مشاعرے کی نظامت معروف شاعر ڈاکٹر شارق عقیل نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دی۔

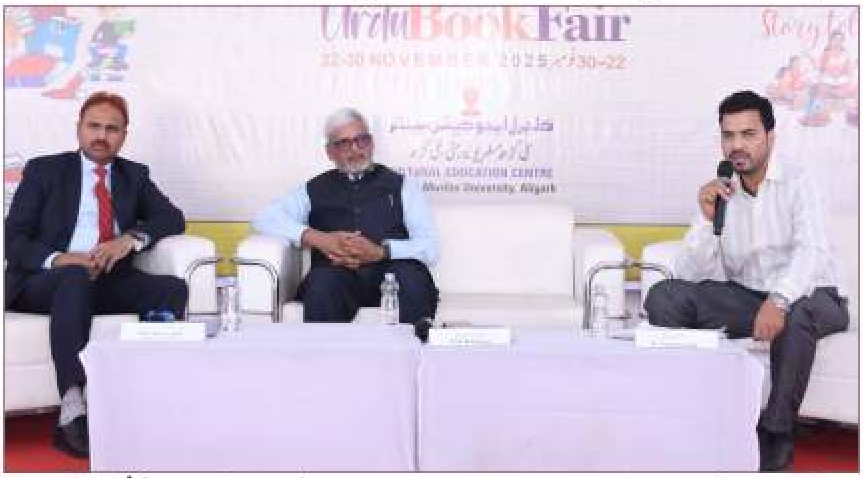

نواں دن (30 نومبر 2025)

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام علی گڑھ اردو کتاب میلہ تاریخ ساز کامیابیوں کے ساتھ آج اختتام پذیر ہوگیا۔ اس موقعے پر اختتامی سیشن کا انعقاد کیا گیا، جس کے مہمان خصوصی پروفیسر محمد گلریز، سابق کارگزار وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تھے جنھوں نے کتاب میلے کے اثرات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس کتاب میلے کے انعقاد سے علی گڑھ میں نئی ادبی و ثقافتی توانائی آگئی ہے، جس کے لیے قومی اردو کونسل اور اس کے سربراہ ڈاکٹر شمس اقبال مبارکباد کے مستحق ہیں۔ سرسید اکیڈمی علی گڑھ کے ڈائرکٹر پروفیسر شافع قدوائی نے اپنے خطاب میں اس کتاب میلے کو علی گڑھ کی علمی روایت کے فروغ کے حوالے سے اہم قرار دیا۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کلماتِ تشکر ادا کرتے ہوئے کہا کہ کتاب دوستی نوجوان نسل کی فکری بنیادوں کو مضبوط بنائے گی اور ملک کو وکست بھارت 2047@ کی جانب لے جانے میں خاصی معاون ثابت ہوگی۔ انھوں نے اس نوروزہ کتاب میلے کے دوران ہونے والے ادبی و ثقافتی پروگراموں کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ یہ میلہ کمرشیلی بھی نہایت

تاریخ ساز رہا کہ اس میں ہندوستان کے مختلف شہروں کے پچاس سے زائد پبلشرز شریک ہوئے اور نو دنوں میں ستر لاکھ کی کتابیں فروخت ہوئیں جبکہ ہم نے قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام 19 اور کلچرل ایجوکیشن سینٹر کے اشتراک سے 8 ادبی وثقافتی پروگرام کیے جن میں علی گڑھ سمیت دہلی، ممبئی، لکھنؤ، غازی آباد اور دیگر مقامات کے ڈیڑھ سو سے زائد اسکالرز، دانشوران اور طلبا وطالبات نے حصہ لیا اور ہزاروں شائقین نے اس میلے میں شریک ہوکر اپنی کتاب دوستی کا ثبوت دیا، جبکہ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر اس دوران ہونے والے پروگراموں کو ایک کروڑ لوگوں نے دیکھا۔ اس طرح اپنے اثرات اور رسائی کے اعتبار سے یہ کتاب میلہ نہایت کامیاب اور تاریخ ساز رہا۔ انھوں نے اس موقعے پر اس میلے کے انعقاد میں معاون تمام اداروں، افراد اور قومی اردو کونسل کے عملہ کا خصوصی شکریہ بھی ادا کیا اور کہا کہ ان حضرات کی اجتماعی کاوشوں سے ہی یہ کتاب میلہ منعقد ہوسکا ہے۔ اس اختتامی سیشن کی نظامت ڈاکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی نے انجام دی۔

اس سے قبل قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام تین اہم مذاکروں کا انعقاد کیا گیا۔ پہلا مذاکرہ ''قبروں میں نہیں ہم کو کتابوں میں اتارو (نئی نسل میں کتاب دوستی کا احیا)'' کے عنوان سے ہوا، جس میں معروف تخلیق کار و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم، معروف اردو اسکالر پروفیسر امتیاز احمد اور مشہور اسکالر ڈاکٹر آفتاب عالم نجمی نے نئی نسل میں مطالعے کی عادت اور کتاب دوستی کی ضرورت پر گفتگو کی، جبکہ نوجوان فکشن نگار ڈاکٹر حمیرا عالیہ نے نوجوانوں اور مطالعے کے تعلق پر اپنے خیالات پیش کیے۔ جناب زبیر خان سعیدی نے اس مذاکرے کو موڈریٹ کیا۔

دوسرا مذاکرہ 'تراجم سے کھلتی کھڑکیاں' کے عنوان سے منعقد ہوا، جس میں معروف انگریزی اسکالر و مترجم پروفیسر سمیع رفیق، معروف اسکالر پروفیسر محمد سجاد، معروف ہندی اسکالر پروفیسر شمبھو ناتھ تیواری اور معروف ادیب و ناقد ڈاکٹر معید الرحمٰن نے اردو میں انڈین نالج سسٹم کی اہمیت، ہندوستانی علمی روایت کی ترسیل اور مختلف علوم تک رسائی کے موضوعات پر اظہارِ خیال کیا۔ نوجوان ناقد و مترجم ڈاکٹر احسن ایوبی نے اس مذاکرے کو موڈریٹ کیا۔

تیسرا مذاکرہ 'اردو میں انفوٹینمنٹ' کے عنوان سے منعقد ہوا، جس میں معروف ادیب و کالم نگار ایڈوکیٹ اے رحمٰن، ڈرامہ نگار و ہدایت کار ڈاکٹر سعید عالم اور معروف انگریزی ادیب، ناقد و مترجم پروفیسر عاصم صدیقی نے فلم، ڈرامہ اور تھیٹر کے ذریعے اردو زبان کے فروغ پر گفتگو کی، جبکہ تحسین منور اس سیشن کے موڈریٹر تھے۔

قابل ذکر ہے کہ کتاب میلے کے آخری دن بھی اردو زبان اور کتابوں کے شائقین کی بڑی تعداد موجود رہی، اس موقعے پر اسکولی طلبہ و طالبات کی موجودگی نے میلے کی رونق میں خاصا اضافہ کیا۔

■

محمد مہتاب عالم

تعلیم کا نظام وقت اور معاشرتی ضروریات کے ساتھ ہمیشہ ارتقاپذیر رہا ہے۔ اکیسویں صدی جسے ڈیجیٹل انقلاب کا دور کہا جاتا ہے، نے انسانی زندگی کے ہر شعبے میں گہرے اثرات مرتب کیے ہیں، اور تعلیم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ انفارمیشن اینڈ کمیونیکیشن ٹیکنالوجی (ICT) کی تیز رفتار ترقی نے تدریس واکتساب کے عمل میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ہے۔ تدریس جو صدیوں سے علم کی منتقلی کا بنیادی ذریعہ رہی ہے، اپنی جگہ اہم ہے لیکن آج کے دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ناکافی محسوس ہوتی ہے۔ دوسری طرف مکمل طور پر آن لائن تعلیم بھی انسانی تعامل کی کمی، طلبا کی تنہائی اور خود نظم وضبط کی ضرورت جیسے مسائل کا شکار ہے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ایک متوازن اور موثر حل 'امتزاجی تعلیم' کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ امتزاجی تعلیم روایتی تدریس کے بہترین عناصر، جیسے انسانی تعامل اور فوری رہنمائی، کو آن لائن تعلیم کی لچک، رسائی اور وسیع وسائل کے ساتھ مربوط کرتی ہے۔ یہ طریقہ کار نہ صرف طلبا کو ان کی اپنی رفتار اور سہولت کے مطابق سیکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے بلکہ اساتذہ کو بھی تدریسی عمل کو مزید تخلیقی اور موثر بنانے کے قابل بناتا ہے۔ COVID-19 وبائی مرض نے عالمی سطح پر تعلیمی اداروں کو بند کرنے پر مجبور کیا، جس سے کروڑوں طلبا متاثر ہوئے۔ اس بحران نے آن لائن تعلیم کی طرف ایک فوری اور وسیع پیمانے پر منتقلی کو جنم دیا۔ وبائی مرض کے بعد، جب تعلیمی ادارے دوبارہ کھلے تو یہ احساس شدت اختیار کر گیا کہ صرف روایتی یا صرف آن لائن طریقہ کار مستقبل کے چیلنجز سے نمٹنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ چنانچہ، امتزاجی تعلیم کو ایک پائیدار اور موثر متبادل کے طور پر تسلیم کیا گیا، جسے اب بہت سے اسکالرز 'نیا روایتی ماڈل' قرار دے رہے ہیں۔

مخلوط تعلیم کا تاریخی ارتقا

اگرچہ امتزاجی تعلیم کا تصور جدید ٹیکنالوجی سے وابستہ ہے، لیکن اس کی جڑیں فاصلاتی تعلیم کی تاریخ میں بہت گہری ہیں۔ مخلوط تعلیم (Blended Learning) کا ارتقا ایک طویل تاریخی سفر پر مشتمل ہے جو تعلیم اور ٹیکنالوجی کی باہمی ترقی کا مظہر ہے۔ 1970 کی دہائی میں کمپیوٹر پر مبنی تربیت کا آغاز ہوا جس نے تنظیموں کو اپنے ملازمین کو بغیر روایتی کلاس روم کے تربیت دینے کا موقع فراہم کیا۔ پھر 1980 کی دہائی میں سیٹلائٹ پر مبنی ویڈیو نیٹ ورکس سامنے آئے جنھوں نے ایک ہی وقت میں مختلف مقامات پر لیکچر دینے کو ممکن بنایا، جس کی ایک مثال اسٹینفورڈ یونیورسٹی کا انٹرایکٹو ٹی وی نیٹ ورک ہے۔ 1990 کی دہائی کے آخر میں تعلیم میں ایک اور بڑی تبدیلی آئی جب ویب پر مبنی تدریس نے انٹرنیٹ کو تعلیم کا مرکزی ذریعہ بنا دیا اور اساتذہ اور طلبا کے درمیان تدریسی مواد کی فراہمی اور رسائی ایک کلک (Click) پر ممکن ہوگئی۔ اس کے بعد 2000 کی دہائی میں پہلی بار 'بلینڈڈ لرننگ' (Blended Learning) کی اصطلاح باضابطہ طور پر استعمال ہونے لگی؛ 2003 میں امریکن سوسائٹی فار ٹریننگ اینڈ ڈیولپمنٹ نے اسے علم کی فراہمی کے دس بڑے رجحانات میں شامل کیا جب کہ 2006 میں بونک اور گراہم (Bonk & Graham) کی کتاب 'ہینڈ بک آف بلینڈڈ لرننگ' (Handbook of Blended Learning) نے اس تصور کو مزید مضبوط بنیاد فراہم کی۔ جدید دور میں سب سے بڑی تبدیلی Covid-19 وبائی مرض کے دوران سامنے آئی، جب دنیا بھر کے تعلیمی اداروں نے ہنگامی بنیادوں پر آن لائن اور آمنے سامنے تدریس کے امتزاج کو اپنایا، اور یوں بلینڈڈ لرننگ ایک 'نیا معمول' بن گئی۔ یہ ارتقائی سفر واضح کرتا ہے کہ مخلوط تعلیم کوئی نیا تصور نہیں بلکہ تعلیم کے ارتقا اور ٹیکنالوجی کی مسلسل ترقی کا ایک منطقی نتیجہ ہے، جو آج ایک مربوط، منظم اور موثر تدریسی ماڈل کے طور پر رائج ہے۔

امتزاجی تعلیم کی تعریف اور تصور

امتزاجی تعلیم (Blended Education) ایک ایسا تدریسی ماڈل ہے جس کی کوئی ایک متفقہ تعریف موجود نہیں ہے، بلکہ مختلف محققین نے اسے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ زیادہ تر محققین تعریفی نقطہ نظر اس بات پر متفق ہیں کہ یہ ایک ایسا طریقہ ہے جس میں آمنے سامنے تدریس اور آن لائن تدریس کو اس طرح مربوط کیا جاتا ہے کہ دونوں کے فوائد یکجا ہو جائیں۔ گراہم (Graham, 2006) نے اسے 'آمنے سامنے تدریس کو کمپیوٹر کے ذریعے تدریس کے ساتھ ملانے' کے طور پر بیان کیا، جو اس تصور کی بنیادی وضاحت ہے۔ دوسری جانب کرسٹینسن انسٹی ٹیوٹ (Christensen Institute) کی جامع تعریف زیادہ وسیع پیمانے پر قبول کی جاتی ہے۔ اس کے مطابق امتزاجی تعلیم ایک باقاعدہ تعلیمی پروگرام ہے جس میں ایک طالب علم کم از کم جزوی طور پر آن لائن سیکھتا ہے، جہاں اسے وقت، جگہ، راستے یا رفتار پر کچھ کنٹرول حاصل ہوتا ہے۔ ساتھ ہی وہ کم از کم جزوی طور پر ایک زیر نگرانی والی جگہ جیسے

اسکول، میں بھی سیکھتا ہے۔ ان دونوں طریقوں کو اس طرح مربوط کیا جاتا ہے کہ وہ ایک مربوط تعلیمی تجربہ فراہم کریں۔ یہ بات اہم ہے کہ مخلوط تعلیم کو محض ٹیکنالوجی کا اضافہ نہ سمجھا جائے بلکہ یہ ایک 'سوچا سمجھا امتزاج' ہے، جہاں تدریس کو شعوری طور پر ڈیزائن کیا جاتا ہے تاکہ دونوں طریقے ایک دوسرے کی تکمیل کریں۔ صرف پاور پوائنٹ سلائیڈز کا استعمال یا آن لائن اسائنمنٹ جمع کروانا مخلوط تعلیم نہیں کہلا سکتا جب تک کہ وہ تدریسی ڈیزائن (Instructional Design) کا مربوط حصہ نہ ہو۔

امتزاجی تعلیم کے اجزا

امتزاجی تعلیم کے تصور کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے اس کے بنیادی اجزا پر غور کرنا ضروری ہے۔ سب سے پہلے آمنے سامنے تدریس ہے، جس میں روایتی کلاس روم کی سرگرمیاں شامل ہوتی ہیں جیسے لیکچرز، گروپ ڈسکشنز، لیب ورک اور اساتذہ کے ساتھ براہِ راست تعامل۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ فوری فیڈ بیک، سماجی تعلق اور انسانی ربط ہے۔ دوسرا جزو آن لائن تدریس ہے، جس میں انٹرنیٹ پر مبنی سرگرمیاں شامل ہیں جیسے ویڈیو لیکچرز، آن لائن کوئز، ڈسکشن فورمز اور ڈیجیٹل وسائل تک رسائی۔ اس جزو کی سب سے بڑی خوبی لچک اور وسیع رسائی ہے۔ تیسرا اور سب سے اہم جزو ہم آہنگی ہے۔ آن لائن اور آمنے سامنے سرگرمیوں کو الگ تھلگ نہیں ہونا چاہیے بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کرنی چاہیے۔ مثال کے طور پر فلپڈ کلاس روم (Classroom Fliped) ماڈل میں طلبا گھر پر آن لائن ویڈیو دیکھ کر تیاری کرتے ہیں اور کلاس روم میں عملی سرگرمیوں یا مباحثوں کے ذریعے سیکھنے کے عمل کو مزید موثر بناتے ہیں۔

امتزاجی تعلیم کے ماڈلز

امتزاجی تعلیم کو مختلف طریقوں سے نافذ کیا جا سکتا ہے، جنھیں مختلف ماڈلز میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کرسٹینسن انسٹی ٹیوٹ کے پیش کردہ چار بنیادی ماڈلز سب سے زیادہ مقبول ہیں:

روٹیشن ماڈل (Rotation Model): اس ماڈل میں طلبہ ایک مقررہ شیڈول کے مطابق مختلف تدریسی سرگرمیوں کے درمیان گھومتے ہیں، جن میں کم از کم ایک سرگرمی آن لائن لرننگ پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس میں اسٹیشن روٹیشن شامل ہے جہاں طلبہ کلاس روم میں مختلف اسٹیشنز پر گروپ ورک، آزادانہ کام اور آن لائن سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں۔ فلپڈ کلاس روم میں طلبہ گھر پر آن لائن لیکچرز دیکھ کر کلاس میں عملی مشقیں کرتے ہیں، جب کہ انفرادی روٹیشن میں ہر طالب علم کا ذاتی شیڈول ہوتا ہے۔ یہ ماڈل تدریس کو منظم، متنوع اور ذاتی نوعیت کا بناتا ہے۔

فلیکس ماڈل (Flex Model): اس ماڈل میں زیادہ تر تعلیمی مواد آن لائن ہوتا ہے اور طلبہ اپنی رفتار اور دلچسپی کے مطابق سیکھتے ہیں۔ استاد یہاں رہنما کا کردار ادا کرتا ہے اور ضرورت پر طلبہ کو مدد فراہم کرتا ہے۔ یہ ماڈل ان طلبہ کے لیے مفید ہے جو خود مختار ہو کر تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اپنی کمزوریوں اور طاقتوں کے مطابق وقت دے سکتے ہوں۔ اساتذہ ڈیٹا کا جائزہ لے کر انفرادی سطح پر فیڈ بیک دیتے ہیں۔

اے لا کارٹے ماڈل (A La Carte Model): اس ماڈل میں طلبہ اپنے روایتی کلاس روم کورسز کے ساتھ ایک یا زیادہ آن لائن کورس بھی لیتے ہیں۔ یہ خاص طور پر ان اسکولوں کے لیے مفید ہے جہاں مخصوص مضامین یا کورسز دستیاب نہ ہوں، جیسے کوئی زبان یا خصوصی مضمون۔ طلبہ اپنی دلچسپی اور مستقبل کے مقاصد کے مطابق آن لائن کورسز کے ذریعے اپنی تعلیم کو وسعت دیتے ہیں، جس کے لیے ذاتی نظم وضبط اور ڈیجیٹل مہارت درکار ہوتی ہے۔

افزودہ ورچوئل ماڈل (Enriched Virtual Model): اس ماڈل میں طلبہ زیادہ تر تعلیمی کام آن لائن کرتے ہیں لیکن استاد کے ساتھ آمنے سامنے ملاقاتیں لازمی ہوتی ہیں۔ یہ ملاقاتیں عملی سرگرمیوں، مباحثوں، پراجیکٹس یا لیب ورک کے لیے ہوتی ہیں جو آن لائن ممکن نہیں ہوتے۔ اس طرح طلبہ آن لائن لرننگ کی سہولت کے ساتھ استاد کی رہنمائی اور ہم جماعتوں سے سماجی رابطے کا بھی فائدہ اٹھاتے ہیں، جو تعلیم کو متوازن اور مؤثر بناتا ہے۔

SAMR ماڈل: (Substitution, Augmentation, Modification, Redefinition) یہ ماڈل ٹیکنالوجی کے تدریسی استعمال کو چار مراحل میں تقسیم کرتا ہے: Substitution (متبادل) جہاں ٹیکنالوجی محض روایتی طریقے کا متبادل ہوتی ہے، Augmentation (اضافت) جہاں اضافی سہولیات شامل ہوتی ہیں، Modification (تبدیلی) جہاں سیکھنے کے عمل کی ساخت بدلتی ہے، اور Redefinition (نئی تعریف) جہاں ٹیکنالوجی ایسے کام ممکن بناتی ہے جو پہلے ممکن نہ تھے، جیسے عالمی تعاون یا ورچوئل ریئلٹی۔ یہ ماڈل اساتذہ کو ٹیکنالوجی کے موثر استعمال کی راہ دکھاتا ہے۔

مخلوط تعلیم کے فوائد

طلبا کے لیے فوائد: امتزاجی تعلیم طلبا کو وہ موقع فراہم کرتی ہے، جس کے تحت وہ اپنی ذہانت، وقت اور جگہ کے مطابق سیکھنے کے قابل بنتے ہیں۔ یہ خصوصی طور پر ان طلبا کے لیے نہایت کارآمد ہے جو کسی پیشہ یا دیگر ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کر رہے ہوتے ہیں۔ دوسرا اہم فائدہ ذاتی نوعیت کی تعلیم ہے، کیونکہ ٹیکنالوجی کے استعمال سے اساتذہ ہر طالب علم کے انفرادی تقاضوں اور سیکھنے کی رفتار کو مدنظر رکھتے ہوئے تدریسی مواد اور سرگرمیوں کو ترتیب دے سکتے ہیں۔ اس ماڈل کے ذریعے طلبا زیادہ فعال انداز میں سیکھتے ہیں۔ آن لائن انٹرایکٹو سرگرمیاں اور کلاس روم میں گروہی تعاون انھیں محض معلومات حاصل کرنے کے بجائے علم کے تخلیق کار بننے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ مزید برآں، مختلف تحقیقی مطالعات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ مخلوط تعلیم طلبا کی کارکردگی کو بہتر بناتی ہے۔ ایک تجزیاتی جائزے نے ظاہر کیا ہے کہ اس کا اثر مثبت 0.35 ہے، جو نمایاں بہتری کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ماڈل طلبا میں اکیسویں صدی کی مہارتوں جیسے تنقیدی سوچ، مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت، ڈیجیٹل خواندگی اور باہمی تعاون کو فروغ دیتا ہے۔

اساتذہ کے لیے فوائد: اساتذہ کے لیے امتزاجی تعلیم ایک ایسا تعلیمی ماحول فراہم کرتی ہے جو ان کے تدریسی حالات کو بہتر بناتا ہے۔ وہ بار بار لیکچر دینے جیسے کاموں سے آزاد ہو جاتے ہیں اور اس وقت کو طلبا کی انفرادی ضروریات پر مرکوز کر سکتے ہیں۔ اس طرح وہ طلبا کو گہری آموزش فراہم کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ مزید برآں، آن لائن آلۂ کار اساتذہ کو طلبا کی کارکردگی پر فوری اور تفصیلی اعداد و شمار فراہم کرتے ہیں، جس کی مدد سے وہ اپنی تدریسی حکمت عملی کو بروقت ایڈجسٹ کر سکتے ہیں۔ یہ نظام نہ صرف تعلیم کو زیادہ مؤثر بناتا ہے بلکہ اساتذہ کی پیشہ ورانہ ترقی میں بھی معاون ہوتا ہے، کیونکہ وہ نئی ٹیکنالوجی اور جدید تدریسی طریقہ کار اپنانے کے مواقع حاصل کرتے ہیں۔

اداروں کے لیے فوائد: اداروں کے نقطۂ نظر سے امتزاجی تعلیم کا سب سے بڑا فائدہ طلبہ اور اساتذہ تک رسائی میں اضافہ ہے، کیونکہ یہ جغرافیائی رکاوٹوں کو دور کر کے زیادہ طلبا کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ نظام خرچ میں کمی بھی لاتا ہے۔ اگرچہ ابتدا میں ٹیکنالوجی پر سرمایہ کاری کی ضرورت پڑتی ہے، لیکن طویل مدتی وسائل کے طور پر بہتر استعمال کو یقینی بناتا ہے، جیسے کہ کلاس روم کی جگہ اور سفری اخراجات میں کمی۔ مزید برآں، ادارے جب جدید تدریسی طریقے اپناتے ہیں تو ان کی ساکھ میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ تعلیمی میدان میں زیادہ مسابقتی ہو جاتے ہیں۔

امتزاجی تعلیم کے نفاذ میں درپیش دشواریاں

تکنیکی دشواریاں: امتزاجی تعلیم کے نفاذ میں سب سے بڑی رکاوٹ رسائی اور بنیادی ڈھانچہ ہے۔ تمام طلبا کے پاس یکساں طور پر قابل اعتماد انٹرنیٹ کنکشن اور مناسب آلات جیسے کمپیوٹر یا اسمارٹ فون موجود نہیں ہوتے، جس کے نتیجے میں ڈیجیٹل تقسیم کی مشکلات مزید گہری ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ، تکنیکی خواندگی بھی ایک بڑا چیلنج ہے کیونکہ طلبا اور اساتذہ دونوں کو آن لائن پلیٹ فارم اور مختلف تعلیمی آلات کے مؤثر استعمال کے لیے مہارت اور تربیت درکار ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ، تکنیکی معاونت کی کمی مسائل کو مزید بڑھا دیتی ہے۔ طلبا اور اساتذہ دونوں کو فوری اور مؤثر معاونت کی ضرورت ہوتی ہے، اور اس کے لیے اداروں کو مضبوط تکنیکی معاونتی نظام قائم کرنا ضروری ہے۔

تدریسی اور انتظامی دشواریاں: امتزاجی تعلیم میں سب سے پیچیدہ پہلو نصاب کی تشکیل ہے، جس میں آن لائن سرگرمیوں اور آمنے سامنے ملاقاتوں کے درمیان ایک بامعنی اور مربوط توازن پیدا کرنا شامل ہے۔ اکثر اوقات اساتذہ صرف روایتی نصاب میں آن لائن اجزا شامل کر دیتے ہیں، جس سے 'نصاب اور آدھا' کی صورتحال پیدا ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی، اساتذہ کی تربیت اور ذہنیت بھی ایک بڑا چیلنج ہے، کیونکہ بہت سے اساتذہ اپنے روایتی تدریسی کردار کو چھوڑ کر نئے کردار جیسے سہولت کار یا رہنما اپنانے میں مزاحمت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مزید برآں، ایک معیاری مخلوط نصاب تیار کرنے کے لیے اساتذہ کو وقت درکار ہوتا ہے، جو اکثر روایتی نصاب کے مقابلے میں دو سے تین گنا زیادہ ہوتا ہے۔ ادارہ جاتی سطح پر، معاونت ایک بنیادی ضرورت ہے، جس میں اعلیٰ انتظامیہ کی حمایت، واضح پالیسیاں اور مالی وسائل کی فراہمی لازمی ہے تاکہ امتزاجی تعلیم مؤثر طریقے سے نافذ ہو سکے۔

طلبا سے متعلق دشواریاں: طلبا کے لیے امتزاجی تعلیم کی کئی نفسیاتی اور عملی دشواریاں ہیں۔ سب سے اہم مسئلہ ذاتی نظم و ضبط کا ہے، جس کے تحت طلبا کو خود وقت کی تنظیم، ترغیبی اور خود ذمہ دارانہ سطح پر کام کرنا ہوتا ہے۔ یہ صلاحیتیں ہر طالب علم میں یکساں طور پر موجود نہیں ہوتیں۔ اس کے علاوہ، آن لائن ماحول میں سماجی تعامل کی کمی طلبا میں تنہائی کا احساس پیدا کرتی ہے، جو ان کے تعلیمی اور جذباتی تجربے پر منفی اثر ڈال سکتی ہے۔ ایک اور بڑا چیلنج جانچ کی سالمیت ہے، کیونکہ آن لائن امتحانات میں نقل اور تعلیمی بددیانتی کو روکنا اداروں کے لیے ایک مشکل کام ہے۔

امتزاجی تعلیمی نظام کے قیام کے لیے بہار میں سرکاری کوششیں

بہار میں امتزاجی تعلیم کے مؤثر نفاذ کے لیے ریاستی حکومت نے متعدد پالیسی اور انتظامی اقدامات کیے ہیں جن کا مقصد تدریس کے عمل کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ہے۔ محکمہ تعلیم بہار نے حالیہ برسوں میں اسکولوں اور کالجوں میں ڈیجیٹل انفراسٹرکچر کی فراہمی پر خاص توجہ دی ہے، جس کے تحت کئی تعلیمی اداروں کو کمپیوٹر لیب، انٹرنیٹ کنکٹیویٹی، اور اسمارٹ کلاس روم سے مزین کیا گیا ہے تاکہ طلبا کو آن لائن اور آمنے سامنے دونوں ماحول میں سیکھنے کے مساوی مواقع فراہم کیے جا سکیں۔ اس کے علاوہ اساتذہ کی پیشہ ورانہ تربیت کے لیے بھی خصوصی پروگرام متعارف کروائے گئے ہیں جن میں امتزاجی تدریس کے جدید طریقے، آن لائن لرننگ پلیٹ فارمز کے استعمال، اور تدریسی مواد کی ڈیجیٹل تیاری کی تربیت دی جاتی ہے۔ حکومت نے لرننگ مینجمنٹ سسٹم کے نفاذ کی حوصلہ افزائی کی ہے جس کے ذریعے اساتذہ، طلبا اور انتظامیہ کے مابین تدریسی سرگرمیوں کا منظم ریکارڈ رکھا جا رہا ہے۔ Covid-19 کے دوران آن لائن تعلیم کو تیزی سے اپنانے کے بعد ریاستی حکومت نے 'ڈیجیٹل بہار ایجوکیشن مشن' جیسی مہمات کے ذریعے امتزاجی تعلیم کو باقاعدہ تعلیمی نظام کا حصہ بنانے کے لیے پالیسی سازی اور بجٹ مختص کرنے جیسے اقدامات بھی کیے ہیں۔ ان حکومتی کوششوں کا بنیادی مقصد تعلیمی معیار میں بہتری، تعلیمی رسائی میں اضافہ اور طلبا کو اکیسویں صدی کی مہارتوں سے آراستہ کرنا ہے تاکہ وہ عالمی سطح پر مسابقت کے قابل بن سکیں۔

نتیجہ (Conclusion): امتزاجی تعلیم اب محض ایک تعلیمی رجحان نہیں رہی، بلکہ ڈیجیٹل دور کی ایک ٹھوس حقیقت اور ضرورت بن چکی ہے۔ یہ روایتی تدریس کے انسانی تعامل اور آن لائن تعلیم کی لچک اور وسعت کو یکجا کر کے ایک ایسا طاقتور تعلیمی ماڈل فراہم کرتی ہے جو طلبا کو بہتر آموزش کے نتائج، ذاتی نوعیت کے تجربات اور اکیسویں صدی کی ضروری مہارتوں سے آراستہ کرتا ہے۔ Covid-19 وبائی مرض نے اس کی اہمیت کو مزید اجاگر کیا ہے اور اس کے نفاذ کو تیز کیا ہے۔ اگرچہ اس کے نفاذ میں تکنیکی، تدریسی اور ادارہ جاتی چیلنجز موجود ہیں، لیکن ایک منضبط اور منظم طریقہ کار ان پر قابو پانے میں مدد کر سکتا ہے۔ اداروں کو چاہیے کہ وہ واضح پالیسیاں وضع کریں، بنیادی ڈھانچے میں سرمایہ کاری کریں، اور اساتذہ و طلبا کو مناسب تربیت اور معاونت فراہم کریں۔ اساتذہ کا کردار معلومات فراہم کرنے والے معلم سے بدل کر آموزش کے عمل میں معاون کے طور پر ہوگا۔ مستقبل میں، جیسے جیسے ٹیکنالوجی مزید ترقی کرے گی، امتزاجی تعلیم کے جدید ماڈلز سامنے آئیں گے۔ مصنوعی ذہانت (AI)، لرننگ اینالیٹکس، اور ورچوئل ریئلٹی (Virtual Reality) جیسی ٹیکنالوجی سیکھنے کے تجربے کو مزید موثر بنانے کی صلاحیت سے مزین ہوں گی۔ ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملک کے لیے امتزاجی تعلیم ڈیجیٹل تقسیم کو پر کرنے، تعلیم تک رسائی کی حد کو وسیع کرنے اور تعلیمی معیار کو بلند کرنے کا ایک بہترین موقع فراہم کرتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ امتزاجی تعلیم صرف ایک طریقہ کار نہیں، بلکہ مستقبل میں تعلیم کی تشکیل کرنے والی ایک مبدل قوت ہے، جو ہمیں ایک زیادہ موثر، مساوی اور طلبا پر مرکوز تعلیمی نظام کی طرف لے جا رہی ہے۔

■

Dr. Md Mahtab Alam
Assistant Teacher
+2 G.P High School, Bhadahar K. Sthan
Darbhanga (Bihar)
Mob.: 7870189938
mdmahtabalam4692@gmail.com

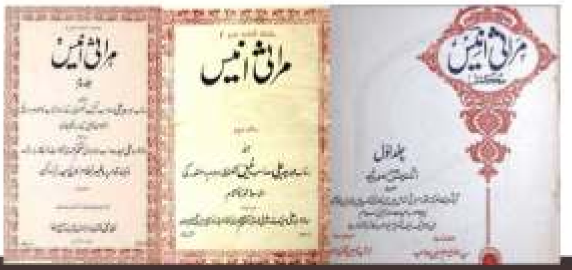

شعیب نجمی

ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور مراثی انیس کے خواتین کردار

میر انیس کا شمار اردو زبان و ادب کے عظیم شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے صنف مرثیہ کو وہ بلندی عطا کی کہ انیس اور مرثیہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بن گئے۔ جس طرح سودا قصیدہ گوئی میں، میر غزل گوئی میں اور میر حسن مثنوی نگاری میں بے مثل ہیں اسی طرح میر انیس مرثیہ نگاری کے بادشاہ ہیں۔ میر انیس کا کمال فن یہ ہے کہ انھوں نے مرثیہ میں بہت سے نئے مضامین برت کر مرثیہ کے دامن کو وسعت عطا کی۔ انیس کے مرثیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستانی تہذیب و ثقافت کو نمایاں کیا، جس کا اعتراف بیشتر نقادوں نے کیا ہے۔ حالانکہ اردو مرثیہ کے تمام واقعات و کردار، عرب کی اسلامی تاریخ سے ماخوذ ہیں، ان میں ہندوستان کا کوئی پس منظر نہیں ہے۔ انیس نے ذکر تو واقعہ کربلا کا کیا ہے لیکن پس منظر کے طور پر ہندوستانی تہذیب و ثقافت کو پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرثیہ کو جو مقبولیت ہندوستان میں حاصل ہوئی وہ کسی دیگر ملک میں حاصل نہ ہو سکی۔ میر انیس نے عرب کے کرداروں میں ہندوستانی رنگ کی آمیزش کر کے ہندوستان کے عام قاری کو اس واقعہ سے وابستہ کیا ہے۔ صالحہ عابد حسین میر انیس کے اس کمال کی طرف اس طرح اشارہ کرتی ہیں:

"انیس نے خالص عرب کردار، خالص عربی آداب اور تہذیب اور رسم و رواج اور حفظ مراتب، عربی خاندانی زندگی کی تصویر کشی نہ کر کے حسینؑ اور خاندان حسینؑ کے افراد میں جو ہندوستانیت پیدا کی وہ ایک ارادی کوشش تھی۔ اگرچہ مسلمانوں کے دل میں عرب حسینؑ و زینبؑ کے لیے اور زیادہ عقیدت و احترام پیدا ہوتا مگر ہندوستانیت یعنی اپنائیت پیدا کر کے ان کے دل میں جو گہری محبت اور لگاؤ ان عظیم ہستیوں سے پیدا کیا گیا وہ شاید نہ ہو سکتا۔"

(میر انیس سے تعارف از صالحہ عابد حسین، ص 33)

اردو مرثیہ میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی عکاسی انیس سے قبل بھی کی جاتی رہی ہے لیکن انیس کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے اردو مرثیہ کو خاص طور سے ہندوستان کے ثقافتی رنگ میں رنگ کر واقعات کربلا کی فطری اجنبیت کو اس طرح اپنائیت میں تبدیل کر دیا ہے کہ یہ واقعات سرزمین عرب سے متعلق ہوتے ہوئے بھی خالص ہندوستانی سرزمین کے معلوم ہونے لگے ہیں اور ان کربلائی مرثیوں میں ہندوستانی عوام کو اپنے ہی رنج و غم کا احساس ہوتا ہے۔ انیس نے اپنے عہد کے ہندوستانی سماج کی عکاسی ایسے مؤثر اور فطری انداز میں کی ہے جس کے ذریعہ ہندوستانی آداب و اخلاق، رسوم و روایات، عام ثقافتی اقدار اور عصری ماحول کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویریں سامنے آ جاتی ہیں، جس وجہ سے عام انسان کو واقعات کربلا سے ایک فطری لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ مراثی انیس کا بغور مطالعہ کرنے پر ایک اور بات سامنے آتی ہے کہ ہندوستانی رنگ مرد کرداروں کے مقابلے خواتین کرداروں پر زیادہ گہرا اور اثر دار محسوس ہوتا ہے۔ انیس نے عورتوں کے کردار اس طرح تخلیق کیے ہیں کہ ان میں ہندوستانی تہذیب رچ بس گئی ہے، خواتین کرداروں کے لب و لہجہ، رسم و رواج، گلے شکوے، جذبات نگاری شرم و لحاظ، اپنائیت کا اظہار ہر احساس میں ہندوستانی تہذیب صاف طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر زوجۂ حضرت عباس، جناب کبریٰ، بی بی شہر بانوؑ، بی بی ربابؑ اور جناب زینبؑ، فاطمہ صغریٰؑ کے جذبات کی عکاسی خالص ہندوستانی انداز میں کرتے ہیں۔ زوجہ عباسؑ میں جو ہندوستانی تہذیب کی جھلک ہے وہ بڑی فطری ہے۔ دیکھیں یہ بند:

یہ سن کے آئی زوجۂ عباس نامور
شوہر کی سمت پہلے انکھیوں سے کی نظر
لیں سبط مصطفیٰ کی بلائیں بچشم تر
زینب کے گرد پھر کے یہ بولی وہ نوحہ گر
فیض آپ کا ہے اور تصدق امام کا
عزت بڑھی کنیز کی اور رتبہ غلام کا
باتیں یہ سن کے روتی ہیں زینب جھکائے سر
تھرا رہی ہے زوجۂ عباس نام ور
چہرہ تو فق ہے، گود میں ہے چاند سا پسر
مانع ہے، شرم روتی ہے منہ پھیر پھیر کر

موقع نہ رونے کا ہے، نہ بول سکتی ہے
حضرت کے منہ کو نرگسی آنکھوں سے تکتی ہے

اپنے بزرگوں کی موجودگی میں شوہر کو انکھیوں سے دیکھنا، دور سے ہی نم آنکھوں سے بلائیں لینا، شوہر یعنی حضرت عباسؑ کو امام کا غلام اور خود کو کنیز کہنا، بزرگوں کی پاسداری میں اپنے جذبات کو دبائے رہنا، شرم وحیا یہ سب ایک مخصوص سماجی نظام کی عکاسی کرتا ہے۔ ظاہر ہے ایسی فنکاری برتنے میں میرانیس کو اپنے تخیل کی پرواز کو بہت بلند کرنا پڑا ہوگا جب ہی تو اس میں وہ رنگ آیا کہ اسے ہم اپنی سرزمین سے جوڑ کر دیکھنے لگے، اس پر گریہ کرنے لگے اور ہم نے اسے حق و باطل کے طور پر تسلیم کیا۔

حضرت علی اکبرؑ کی ماں تو ام لیلیٰؑ تھیں لیکن ان کی پرورش ان کی پھوپھی جناب زینبؑ نے کی تھی کیونکہ حضرت علی اکبرؑ امام حسینؑ کے نانا کی شبیہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت علی اکبرؑ امام حسینؑ سے میدان میں جانے کی اجازت مانگتے ہیں تو امام کہتے ہیں کہ تم اپنی پھوپھی سے اجازت طلب کرو۔ میرانیس پورے واقعہ کو مانوس فضا میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

زندوں میں ہوتی گر تو یہ کہتی کہ مرنے جائیں
اس پیاس میں شہید ہوں فاقوں میں زخم کھائیں
اٹھارہواں برس ہے، دلہن تو مجھے دکھائیں
پالا ہے منتوں سے مرادیں مری بر آئیں
مرتی ہوں اشتیاق میں، سہرا تو دیکھ لوں
سہرے کے نیچے چاند سا چہرا تو دیکھ لوں
سچ ہے کہ اس کی چاہ سے نسبت مجھے کہاں
ہوں لاکھ ان کی چاہنے والی، وہ پھر ہے ماں
آنکھوں کا نور قلب کی طاقت، بدن کی جاں
آنچ آتما کی ہے وہ قیامت کہ الا اماں
کیا سوچتے ہو صاحبو، کچھ تم کو خبر ہے
ماں ہے تو ماں ہے خلق میں، پھر غیر غیر ہے

ایک عرب کی خاتون سے اس طرح کے جملہ ادا کرانا انیس کا ہی خاصہ ہے، یہ بند ہندوستانی سماج کی فضا بندی کے آئینہ دار ہیں۔ 'آنچ آتما کی ہے' اس طرح کے جملے ایک ہندوستانی خاتون کے منہ سے ہی نکل سکتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور بند ملاحظہ ہو، جس میں میرانیس گل پہ بلبل کے فدا ہونے کی بات کو بڑی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔

ماں کی نہ کم توجہی او ر یہ کسی کا پیار
غصہ ہو یا کہ سخت کہے، دل میں ہے نثار
بلبل فدا ہے گل پہ، شکایت کرے ہزار
دنیا میں عاشقوں کے دلوں کو کہاں قرار
دیں ماں کا ساتھ، نام خدا اب جوان ہیں
میرا ہے جب یہ حال، پھر اس کی تو جان ہیں

انیس کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے اردو مرثیہ کو خاص طور سے ہندوستان کے ثقافتی رنگ میں رنگ کر واقعات کربلا کی فطری اجنبیت کو اس طرح اپنائیت میں تبدیل کر دیا ہے کہ یہ واقعات سرزمین عرب سے متعلق ہوتے ہوئے بھی خالص ہندوستانی سرزمین کے معلوم ہونے لگے ہیں اور ان کربلائی مرثیوں میں ہندوستانی عوام کو اپنے ہی رنج و غم کا احساس ہوتا ہے۔

میرانیس نے جناب زینبؑ کی زبان سے جو یہ مکالمات ادا کرائے ہیں یہ بھی ایک ہندوستانی عورت کے جذبات ہیں۔ جو ہندوستان کے سامعین کے لیے مؤثر ثابت ہوتے ہیں اور غم کی فضا اور بہتر طریقہ سے تیار ہوتی ہے کیونکہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنی مانوس فضا کا اثر زیادہ لیتا ہے۔ ہندوستانی تہذیب کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ جب کوئی بڑا غم پڑتا ہے تو خواتین کو دیکھا گیا ہے کہ وہ فرط غم میں اپنے سر کے بال کھول لیتی ہیں۔ میرانیس نے کربلا کی خواتین کے غم کا ذکر کرتے ہوئے اکثر کھلے ہوئے سر کے بالوں کا ذکر کیا ہے جو خالص ہندوستانی سرزمین کی جھلک ہے، اس سلسلے میں مثال کے طور پر چند بند رقم کیے جا رہے ہیں۔

زینبؑ بلک رہی تھی، پریشاں تھے سر کے بال
نعلین کا نہ ہوش، نہ چادر کا تھا خیال
سینہ کبود، چاک گریباں، شکستہ حال
کہتی تھی مجھ پر رحم کر، اے فاطمہؑ کے لال
پوچھے گا کون، ساتھ چھٹے گا جو آپ کا
نے ماں کا آسرا ہے مجھے، اب نہ باپ کا
نکلا یہ سب کے منہ سے کہ ہے ہے حسنؑ کے لال
زینب نے اٹھ کے کھول دئے اپنے سر کے بال
سینے میں ہل گیا دل بانوئے خوش خصال
چلائی ماں، گزر یا کیا میرا نونہال
عابد کا تپ میں گرم بدن سرد ہوگیا
قاسم کے چھوٹے بھائی کا بدن سرد ہوگیا

اسی طرح کئی مرثیوں میں میرانیس نے بال کھول کر کربلا کی خواتین کے گریہ کرنے کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ کربلا کی خواتین کے بارے میں بال کھول کر گریہ کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ انیس نے مرثیہ کو مؤثر بنانے اور ہندوستان کی سرزمین پر مرثیہ کو پیش کرنے کے لیے ہی ایسا کیا ہے۔

میدانِ کربلا میں حق و باطل کی جنگ آخری مرحلے میں ہے۔ امام حسینؑ کے اعزا و اقارب سب جام شہادت نوش فرما چکے ہیں اب امام حسینؑ رخصت آخر کو بیبیوں کے خیمے میں تشریف لائے ہیں، بہن زینبؑ دیکھتی ہیں اب بھائی کے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں۔ انیس جناب زینبؑ کے جذبات کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

خیمے میں جا کے شہ نے یہ دیکھا حرم کا حال
چہرے تو فق ہیں اور کھلے ہیں سروں کے بال
زینبؑ کی یہ دعا ہے کہ اے رب ذوالجلال
بچ جائے اس فساد سے خیرالنساء کا لال
بانوئے نیک نام کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے

اس بند میں واضح طور پر ہندوستانی خواتین کے احساسات وجذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔ صندل سے مانگ بھرنا ہندوستانی خواتین کا طریقہ ہے۔ زرعی ملک ہندوستان میں کھیتی ہری رہنے کی جو دعا ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ میرانیس ہندوستان کی سرزمین کے پروردہ تھے اور ہندوستان کے خاص طور پر اودھ کے طور طریقوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہندوستانی تہذیب وثقافت کو مرثیہ میں پیش کیا۔ ہندوستانی طرز فکر کے بجائے عرب خواتین کے طور طریقوں کو یہاں

بیان کیا جاتا تو مرثیہ کی فضا ہندوستانی قاری کے جذبات کو اس طرح متاثر نہیں کرتی۔ امام حسینؑ کے جوان بیٹے حضرت علی اکبرؑ کی شہادت کے یہ بند ملاحظہ ہوں۔

ڈیوڑھی پہ لائے لاش پسر کی جو شاہ دیں
باہر نکل کے بیبیاں سر پیٹنے لگیں
زینبؑ کو یوں پکارا وہ زہراؑ کا نازنیں
دوڑو بہن کہ قتل ہوا اکبرؑ حزیں
دولہا بنے ہیں خون کی مہندی لگائے ہیں
سہرا تمھیں دکھانے کو مقتل سے آئے ہیں
ہے ہے نہ تیرا بیاہ رچانا ہوا نصیب
ہے ہے دلہن نہ بیاہ کے لانا ہوا نصیب
پوتے کو گود میں نہ کھلانا ہوا نصیب
شادی کے بدلے خاک اڑانا ہوا نصیب
ندی لہو کی چاندی چھاتی سے بہہ گئی
بہنوں کو نیگ لینے کی حسرت ہی رہ گئی

نیگ لینے کی رسم بھی خالص ہندوستانی تہذیب کا حصہ ہے، اور جس طرح ایک جوان کی لاش پر خواتین کے بین رقم کیے ہیں یہ بھی ہندوستانی لب ولہجہ ہے۔ انیس نے مرثیہ کو پر اثر بنانے، تصویر کو واضح کرنے اور جذبات کی دنیا میں بے چینی پیدا کرنے کے لیے ان رسومات اور لب ولہجہ کو سمویا ہے۔ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ انسان اپنی مانوس فضا کو پسند کرتا ہے اسی لیے انھوں نے ہندوستانی پس منظر میں واقعہ کربلا کو نظم کیا۔ ہندوستان ایسا ملک ہے جہاں پیدائش سے لے کر موت تک بہت سی رسمیں رائج ہیں اور یہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا اٹوٹ حصہ بھی ہیں۔ حضرت قاسمؑ کی شادی کے موقع پر رسومات کا ذکر مرثیوں میں تفصیل سے ملتا ہے۔ نیگ، کنگن، کنگنا، سہرا، منڈپ، مہندی، گھونگھٹ، رنڈسالہ اور سفید چادر وغیرہ۔ یہ اشعار دیکھیے۔

بہنیں کدھر ہیں ڈالنے آنچل بنے پہ آئیں
اب دیر کیا ہے حجرے سے باہر دلہن کو لائیں
رخصت ہوں جلد تاکہ براتی بھی چین پائیں
جاگے ہیں ساری رات کے اپنے گھروں کو جائیں
دل پر ہے فراق کی شمشیر تیز کو
کہو دلہن کی نکالے جہیز کو

بھائی کے سر پر بہنوں کا آنچل ڈالنا، نیگ لینا، دہلی گھیرنا اور رنڈاپے کا جوڑا یہ سب ہندوستانی رسمیں ہیں جس کو انیس نے مرثیہ کے قالب میں ڈھال کر مرثیہ کو پرسوز بنا

دیا ہے۔ میر انیس کے مرثیوں کا مطالعہ کرنے پر واضح ہوتا ہے کہ میر انیس ہندوستانی عورت کی نفسیات سے اچھی طرح واقف ہیں اور اس بات کا بھی اچھی طرح اندازہ ہے کہ خوشی اور غم کے موقع پر جو رسومات ہمارے سماج میں رائج ہیں، وہ سب خواتین کی ہی دین ہیں، مردوں کو تو اس کا دور دور تک علم نہیں ہوتا۔ کچھ خواتین تو رسومات کو اس طرح رائج کر دیتی ہیں کہ یہ رسمیں تقریبات کے وقت نسل در نسل چلتی رہتی ہیں یہی وجہ ہے کہ جہاں پر بھی رسومات کا ذکر آیا ہے، میر انیس نے عورتوں کے برتاؤ کے ذریعہ ہی ہندوستانی رسومات کو پیش کیا ہے۔ میر انیس کے مرثیوں میں امام حسنؑ کے فرزند حضرت قاسمؑ کی شہادت کا تذکرہ دردناک انداز میں ملتا ہے اور اکثر و بیشتر مراثی کو مؤثر بنانے کے لیے حضرت قاسمؑ کی شادی کا ذکر کیا جاتا ہے، شادی کا ذکر کرتے ہوئے ان ہی رسومات کا ذکر کیا جاتا ہے جو ہندوستان میں رائج ہیں۔ جو چیزیں ہندوستانی دلہن کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں، انیس نے ان چیزوں کا ذکر ہی کیا ہے اور جب کسی خاتون کا سہاگ اجڑتا ہے تو اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے اس کو میر انیس نے مؤثر طریقہ سے بیان کیا ہے۔ حضرت قاسمؑ کی لاش جب خیمے میں آتی ہے تو ان کی دلہن جناب کبریٰ کی کیا حالت ہوتی ہے اس منظر کو انیس نے اس طرح بیان کیا ہے۔

ناگاہ لاش صحن تک آئی لہو میں تر
بیٹھے جو سر، عروس کو بھی ہو گئی خبر
تھا سامنا کہ لاش پہ بھی جا پڑی نظر
گھبرا کے تب سکینہ سے بولی وہ نوحہ گر
دولہا کی لاش آتی ہے سہرے کو توڑ دو
مسند الٹ دو حجرے کے پردے کو چھوڑ دو
یہ کہہ کے نوچنے لگی سہرا وہ سوگوار
افشاں چھڑا کے خاک ملی منہ پہ چند بار
کہنے لگی لپٹ کے سکینہ جگر فگار
ہے ہے بہن بڑھاؤ نہ سہرے کو میں نثار
وہ کہتی تھی کہ جاگ کے تقدیر سو گئی
بی بی! نہ پکڑو ہاتھ کہ میں رانڈ ہو گئی

اس بند میں، جو ایک شب کے دولہا کی دردناک موت کا واقعہ اور دلہن کی غم کی کیفیت کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ سامعین کے دلوں پر سیدھا اثر کرتی ہے کیونکہ یہاں پر ہندوستانی طرز کو اپنایا ہے اور افشاں چھڑا کر منہ پر خاک کا منظر پیش کیا ہے۔ یہ ہندوستان کے ہی ایک طبقہ کی رسم ہے، جس کو انیس نے چابکدستی سے واقعۂ کربلا کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ اسی طرح اسی مرثیہ میں سفید چادر اوڑھانے کی بات کی ہے جو آج بھی ہندوستان میں ایک بیوہ عورت کو اوڑھائی جاتی ہے۔

حضرت یہ کہہ کے ہٹ گئے با چشم اشک بار
پٹی یہ سر کہ غش ہوئی بانوئے دل فگار
چادر سپید اڑھا کے دلہن کو بحال زار
گودی میں لائی زینبؑ غمگین و سوگوار
چلائی ماں یہ گر کے تن پاش پاش پر
قاسم بنے اٹھو دلہن آئی ہے لاش پر

جناب صغریٰؑ امام حسینؑ کی بیٹی تھیں اور جب قافلہ مدینے سے روانہ ہوا تھا تو جناب صغریٰ اپنی بیماری کی وجہ سے ساتھ میں نہیں آئی تھیں۔ اس واقعہ کو میر انیس نے بہت سے مرثیوں میں بیان کیا ہے۔ رخصت کے وقت جو باتیں جناب صغریٰؑ کی زبان سے ادا کی گئی ہیں، ان کا گہرا تعلق بھی ہندوستانی ثقافت سے ہے۔ ایک بہن کی تمنا ہوتی ہے کہ وہ اپنے بھائی کے سر پر سہرا دیکھے۔ بھائی کے جانے کی خبر سن کر صغریٰؑ حضرت علی اکبرؑ سے منت کرتی ہیں۔ میر انیس جناب صغریٰؑ کے جذبات کی عکاسی اس طرح کرتے ہیں۔

رخساروں پہ سبزے کے نکلنے کے میں صدقے
تلوار لیے شان سے چلنے کے میں صدقے
افسوس سے ان ہاتھوں کو ملنے کے میں صدقے
کیوں روتے ہو اشک آنکھوں سے ڈھلنے کے میں صدقے

جلد آن کے بہنا کی خبر لیجو بھائی
بے میرے کہیں بیاہ نہ کر لیجو بھائی
لکھنا مجھے، نسبت کا اگر ہو کہیں ساماں
حق دار ہوں میں نیگ کی میرا بھی رہے دھیاں
اور مرگئی پیچھے تو رہے دل میں سب ارماں
لے آنا دلہن کو مری تربت پہ میں قرباں
خوشنود مری روح کو کردیجیو بھائی
حق نیگ کا تم قبر پہ دھر دیجیو بھائی

یہاں پر میرانیس نے ایک بہن کے نیگ لینے کی بات کر کے خالص ہندوستانی رسم کو بیان کیا ہے اور مرثیہ کو پوری معنویت کے ساتھ پیش کیا ہے، جس طرح نیگ لینے کی ہندوستانی رسم ہے اسی طرح کنگنا کھیلنے کی رسم ہندوستان میں آج بھی رائج ہے۔ میرانیس نے اس رسم کو واقعۂ کربلا کے پس منظر میں اس طرح بیان کیا ہے۔

دم بدم ساس بھی سر پیٹتی ہے ساتھ اس کے
ابھی کنگنا نہ کھلا تھا کہ بندھے ہاتھ اس کے

اسی طرح 'کلیات انیس' کے پہلے مرثیہ 'یارب! چمن نظم کو گلزار ارم کر' میں بہت سی ہندوستانی رسومات کا تذکرہ ملتا ہے، اس مرثیہ میں انیس نے امام حسینؑ کی ولادت سے لے کر شہادت تک کا ذکر کیا ہے۔ امام حسینؑ کی ولادت کے وقت کس طرح سب خوشیاں منا رہے ہیں کہ جبرئیل امین نازل ہوتے ہیں اور امام حسینؑ پر پڑنے والے مصائب کی خبر رسول خدا کو دیتے ہیں۔ جب امام حسینؑ پر پڑنے والے مصائب کے بارے میں بی بی فاطمہ زہراؑ سنتی ہیں تو ان کا غم سے برا حال ہو جاتا ہے۔ میرانیس نے ایک ماں کی کیفیت کو اس طرح پیش کیا ہے کہ سننے اور پڑھنے والے کے دل پر بہت اثر ہوتا ہے۔

بیٹی کو یہ معلوم نہ تھا یا شہ عالم
بچھے گی زچہ خانے کے اندر صف ماتم
اب دن ہے چھٹی کا مجھے عاشور محرم
تارے بھی نہ دیکھے تھے کہ ٹوٹا فلک غم
پوشاک نہ بدلوں گی نہ سر دھوؤں گی بابا
چلے میں بھی چہلم کی طرح روؤں گی بابا

اس بند میں جہاں انیس نے بی بی فاطمہؑ کے غم کا بیان کر کے مرثیہ کو پرسوز بنایا ہے وہیں چھٹی، چلے اور تاروں کا دیکھنا جیسے الفاظ برت کر اس کو ہندوستانی رنگ دیا ہے، جس سے سرزمین ہندوستان کے سامعین کے لیے یہ مرثیہ اور مؤثر ہو جاتا ہے۔ اپنے موضوع کو مزید واضح کرنے کے لیے مراثی انیس سے چند مصرعے مثال کے طور پر درج کیے جا رہے ہیں جس میں ہندوستانی رسم و رواج کو بیان کیا گیا ہے۔

اب سالی کس کے ہاتھ میں مہندی لگائے گی
شاہد رہیں سب دودھ بھی بخشا نہیں میں نے
مہندی تمھارا لال ملے ہاتھ پاؤں میں
لاؤ دلہن کو بیاہ کے تاروں کی چھاؤں میں
کنگنا بندھا تھا ہاتھ میں اس خوش صفات کے
سہرے سے یہ عیاں تھا کہ دولہا ہیں رات کے

بہنوں کے نیگ لینے کی حسرت، صندل سے مانگ اور بچوں سے گود بھری رہنے کی دعا، دلہن کے ہاتھوں کی مہندی، دودھ بخشنا خالص ہندوستانی رسمیں ہیں جس کو میرانیس نے بڑی مہارت سے مرثیہ میں پیش کیا ہے۔ یہ انیس کا کمال فن ہی تو ہے کہ انھوں نے مرثیہ میں ہندوستانی فضا کو اس طرح سمویا ہے کہ چودہ سو سال قبل کا واقعہ موجودہ دور کی داستان لگتا ہے اور اس کی فضا ہمارے سماج کی فضا معلوم ہوتی ہے، جس سے قاری یا سامع اس واقعہ سے خود کو وابستہ محسوس کرنے لگتا ہے اور عرب کا پس منظر ہندوستانی سماج و معاشرت اور تہذیب میں ڈھل جاتا ہے اور پھر اپنے ایک منفرد رنگ میں نمایاں ہوتا ہے۔

"بہنوں کے نیگ لینے کی حسرت، صندل سے مانگ اور بچوں سے گود بھری رہنے کی دعا، دلہن کے ہاتھوں کی مہندی، دودھ بخشنا خالص ہندوستانی رسمیں ہیں جس کو میرانیس نے بڑی مہارت سے مرثیہ میں پیش کیا ہے۔"

میرانیس کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے جہاں مرثیہ میں ہندوستانی تہذیب وثقافت کو خوبصورتی سے پرویا ہے اور ہندوستانی رسومات کا ذکر کرتے ہوئے خواتین کے جذبات کی فنی حسن کے ساتھ ترجمانی کی ہے، وہیں انھوں نے خواتین کربلا کے عزم و حوصلہ اور قربانی کے جذبہ کو خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ عورت جس کو کمزور دل کا کہا جاتا ہے، وہیں انیس نے عورت کے ہمت و حوصلہ کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے اور ایک ایک عورت کی نفسیات کو مرثیہ کے قالب میں ڈھالا ہے۔ مراثی انیس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ خاتون کے لیے میرانیس کے دل میں جو جذبہ ہے وہ بہت اعلیٰ ہے۔ اس بارے میں صالحہ عابد حسین کا کہنا ہے:

''میرانیس کے کلام سے جس میں سیکڑوں مرثیے اور لاکھوں اشعار ہیں ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں عورت کا درجہ بہت بلند ہے۔ عام طور پر وہ عورت کو محبت کی دیوی، حیا کی کان، ایمان کی جان، شرافت ونیکی کی تصویر، قربانی و ایثار کی مورتی سمجھتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ انھیں عورت میں بے خوفی، جرأت، ہمت، عزم و حوصلہ اور استقلال اور بہادری کے جوہر بھی نظر آتے ہیں۔ جو اصول وحق کے لیے بڑے سے بڑے پہاڑ سے ٹکر لے سکتی ہے۔ جان اور جان سے زیادہ عزیز شے قربان کر سکتی ہے۔ اور ان کا یہ عقیدہ صرف خاندان نبوت کی عورتوں اور اہل بیت امام حسینؑ تک محدود نہیں بلکہ وہ عام عورتوں یہاں تک کہ امام حسینؑ کے دشمنوں کی عورتوں میں بھی عالی ظرفی اور ایمان وشرافت کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ کہ انیس کے لکھے ہزاروں صفحات کھنگال ڈالیے مگر کہیں آپ کو ظالم نفس پرست، بدعقیدہ، حرص وہوس کی غلام عورت نظر نہیں آئے گی۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ انیس کی ماں بیوی اور خاندان کی دوسری عورتیں بلند کردار اور مضبوط شخصیت کی مالک ہوں گی۔''

(خواتین کربلا کلام انیس کے آئینہ میں از صالحہ عابد حسین، ص 5،6)

اگر واقعۂ کربلا کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں سب سے اہم اور مرکزی کردار جناب زینبؑ کا نظر آتا ہے اور انیس کا کمال فن یہ ہے کہ انھوں نے جناب زینبؑ کے کردار کے مختلف پہلوؤں کو مرثیوں میں پیش کیا ہے۔ جناب زینبؑ ہمت و حوصلہ، شجاعت اور حق گوئی کا مظہر ہیں۔ ایک خاتون کو جہاں سارے رشتے عزیز ہوتے ہیں، وہیں جب وہ ماں بنتی ہے تو اس کو سب سے زیادہ اپنی اولاد سے محبت ہونے لگتی ہے کیونکہ اولاد عورت کے وجود کا حصہ ہوتی ہے اور وہ اپنی اولاد کی ہر طرح سے حفاظت کرتی ہے اس کے پروان چڑھنے کی دعائیں کرتی ہے، ماں اپنی اولاد پر اپنی ہر خوشی قربان کر دیتی

ہے یہاں تک کہ وقت پڑنے پر اپنی جان بھی قربان کردیتی ہے۔لیکن یہ کربلا کی مائیں ہیں جوحق کے لیے راہ خدامیں نہ صرف اپنے بیٹوں کوبھی قربان کردیتی ہیں بلکہ ان کومیدان جنگ میں جانے کے لیے پورے عزم کے ساتھ تیارکرتی ہیں۔

صدقے گئی سن لو یہ میں کہتی ہوں جتا کر
تم پہلے فدا کیجیو سر شہ کے قدم پر
میدان میں زخمی ہوئے گر قاسمؑ واکبرؑ
پھرتم مرے فرزند نہ میں دونوں کی مادر
جب دل ہوا ناراض توفرزند کہاں کے
کس کام کاوہ لعل جوکام آئے نہ ماں کے
اعدا کو مرے دودھ کی تاثیر دکھا دو
اجلال حسن "شوکت شبیر" دکھادو
جعفر کی طرح جوہر شمشیر دکھا دو
تن تن کے یداللہ کی تصویر دکھا دو
خورشیدامامت میں قرابت میں قریں ہو
تم شیرہوشیروں کے حسینوں کے حسیں ہو
جعفر سے نمودار ہوکے دلبر ہودلیرو
حیدرؑ سے دلاور کے، دلاور ہو دلیرو
جرار ہو، کرار ہو، صفدر ہو دلیرو
ضرغام ہو، ضیغم ہو، غضنفر ہو دلیرو
تیروں سے جوانوں کے جگرتوڑکے آؤ
خیبر کی طرح کوفے کا درتوڑکے آؤ

یہاں پرقابل غوربات یہ ہے کہ جناب زینبؑ ایک ماں ہوتے ہوئے اپنے بچوں کا حوصلہ بڑھارہی ہیں اوران کو جنگ کے لیے آمادہ کررہی ہیں ساتھ ہی یہ بھی درس دے رہی ہیں کہ قاسمؑ واکبرؑ سے پہلے تم اپنی قربانی پیش کرنانہیں تو یہ ماں تم سے ناراض ہوجائے گی۔

جناب زینبؑ تاریخ کربلا کی ایسی عظیم خاتون ہیں جوتمام مصائب سہنے کے باوجود مقصد حسینؑ سے پیچھے نہیں ہٹتیں اوراگر یہ کہاجائے کہ آج کربلا زندہ ہے تواس میں جناب زینبؑ کا اہم کردار ہے،توغلط نہ ہوگا۔دربار یزید میں انھوں نے علیؑ کے لہجے میں خطبہ دے کرعزم وحوصلہ کا ثبوت دیا۔جب قافلہ دربار یزید میں پہنچا تو یزیدنے خاندان زہراؑ کے بارے میں گستاخی کی۔اپنے آباؤاجداد کے جھوٹے قصیدے پڑھنے لگااورسر حسینؑ سے بھی شرارت کی۔یہ دیکھ کر زینبؑ کوجلال آگیا اورانھوں نے دشمنوں کو بے باکی سے للکارا۔انیس جناب زینبؑ کے ہمت وحوصلہ کواس طرح بیان کرتے ہیں۔

سن کے یہ آگیا بنت شہ مرداں کو جلال
تھرتھرا کر کہا، کیا بکتا ہے او بداقبال
صاحب عزت وتوقیر محمدؐ کی ہے آل
کبھی ہم لوگوں کی عزت پہ نہ آئے گا زوال
ہم کو بے قدر جو سمجھا تو خطا کرتا ہے
دیکھ مصحف میں خدا کس کی ثنا کرتا ہے
آل احمد کو حقارت سے نہ دیکھ او مقہور
سب پہ روشن ہے کہ ہم لوگ ہیں اللہ کا نور
مارکر سبط پیمبرؐ کو یہ نخوت، یہ غرور
خیر!ہم دور، نہ تو دور، نہ محشر ہے دور
حق کا دریائے غضب جوش میں جب آئے گا
باندھنا ہاتھ کا سادات کے کھل جائے گا
کہہ کے یہ، غیظ میں آئی جو علیؑ کی جائی
آسماں آگئے جنبش میں، زمیں تھرائی
سر شبیرؑ سے ناگاہ صدا یہ آئی
تھام لے غیظ کوزینبؑ، ترے صدقے بھائی
نہ تلاطم میں کہیں قہر الٰہی آجائے
کہیں امت کی نہ کشتی پر تباہی آجائے

میرانیس کے مراثی میں اس طرح کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جس میں جناب زینبؑ نے باطل کے سامنے کہیں پر بھی سرنہیں جھکایا ہے اورتمام مصائب کے باوجود حق کے راستے سے ان کے قدم کہیں بھی نہیں ڈگمگائے ہیں بلکہ اپنے ہمت وحوصلہ کا مظاہرہ کرکے دشمنوں کو للکارنے کا کام کیا ہے۔

میرانیس نے اپنے مرثیوں میں جہاں خاندان رسالت کی بہوؤں اوربیٹیوں کے ہمت وحوصلہ کا ذکر کیا ہے وہیں اس خاندان کی کنیزوں کے حوصلہ کی بھی داد دی ہے۔انھوں امام حسینؑ کی کنیز شیریں کا ذکر بھی کیا ہے اور ہندہ کے حوصلہ کوبھی بیان کیا ہے۔روایت میں ملتا ہے کہ ہندہ خاندان امام حسینؑ کی کنیزرہ چکی تھی یہی وجہ ہے کہ اسے خاندان اہل بیت سے عقیدت تھی۔ہندہ بہت خوبصورت تھی اسی لیے یزیدنے اس سے عقد کیا تھا۔ہندہ یزیدکی زوجہ ضرورتھی لیکن خاندان اہل بیت سے اس کی محبت ومودت کم نہیں ہوئی تھی۔میر انیس نے ہندہ کے کردارکواپنے مرثیے میں خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔امام حسینؑ کی شہادت کے بعدقافلہ قید کیا جاتا ہے اورجب ہندہ کوعلم ہوتا ہے تواس کی راتوں کی نیندبھوک اور پیاس سب اڑجاتی ہے اوروہ مزیدغم زدہ ہوجاتی ہے۔جب یزیداس سے دریافت کرتا ہے تو وہ اس سے ڈرتی نہیں بلکہ طیش میں آجاتی ہے۔میرانیس ہندہ کی اس کیفیت کواس طرح بیان کرتے ہیں۔

ہے ظلم وستم کا ترے عہد میں رواج
اپنے جگر کے زخم کا میں کیا کروں علاج
تجھ کوتو عید ہے مجھے صدمے گزرتے ہیں
یہ کون ہیں جو راتوں کو فریاد کرتے ہیں
کھانے کو میں نہ ہاتھ لگاؤں گی کیسی بھوک
اٹھتی ہے باربار کلیجے میں میرے ہوک
یہ بیکسوں پہ ظلم غریبوں سے یہ سلوک
ان کے بغیر مجھ پہ یہ کھانا ہے مثل خوک

یہاں پر میرانیس نے ہندہ کی شکل میں ایک باہمت خاتون کا کردارپیش کیا ہے جوحق پرستوں کے لیے اپنے جابروظالم شوہرکوللکارتی ہے۔ایک عورت کا اپنے شوہر کے لیے دلیری اور بے خوفی سے مظاہرہ کرنا آسان کام نہیں ہے لیکن میرانیس نے اپنے کرداروں کی تعمیرایسے کی ہے کہ وہ اپنے نفس پرقابو پاکرحق کے راستے کومنتخب کرتی ہیں اورپھر وہ ہرطرح س سے ثابت قدم رہتی ہیں۔

مجموعی طور پرکہا جاسکتا ہے کہ میرانیس نے خواتین کرداروں کی ایسی عکاسی کی ہے کہ ایک طرف توخواتین کربلا کا ہمارے ذہن میں مرتبہ بہت اعلیٰ ہوجاتا ہے دوسری طرف یہ کردارآج کے معاشرے کی خواتین کے لیے نمونۂ عمل بھی ہیں۔

ماخذ

1. کلیات انیس: مرتب رانا خضر سلطان،ناشر بک ٹاک لاہور،2006
2. انیس اور انیس شناس۔مرتبہ حسن مثنیٰ،ایلیا پبلی کیشنز، گوپال پور،سیوان بہار،2013
3. خواتین کربلا کلام انیس کے آئینہ میں از صالحہ عابد حسین مکتبہ جامعہ دہلی
4. سانحۂ کربلا بطورشعری استعارہ اردو شاعری کا ایک تخلیقی رجحان: پروفیسر گوپی چند نارنگ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،1
5. اودھ میں اردو مرثیہ کا ارتقا از ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری، نظامی پریس لکھنؤ،دسمبر1981
6. میرانیس سے تعارف ازصالحہ عابد حسین،مکتبہ جامعہ دہلی2011

■

Shabeeb Najmi
Shabeeb Computers
Husainabad, Haidery Chowk , Kamptee
Dist. Nagpur - 441001 (Maharashtra)
Mob.: 9156488272

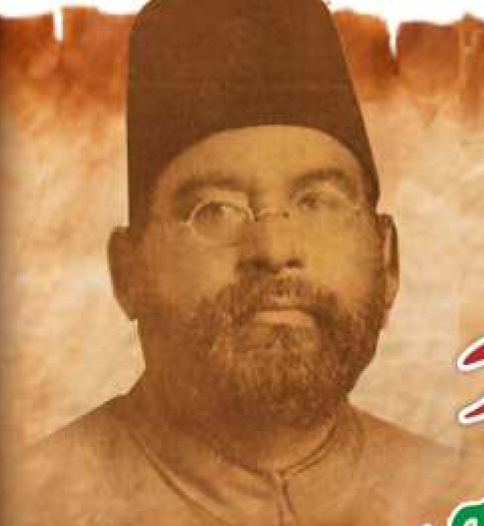

عبدالحلیم شرر کی تاریخی ناول نگاری

احسان عالم

مولانا عبدالحلیم شرر 4 ستمبر 1860 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم تفضّل حسین اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کے ملازم تھے۔ نو سال کی عمر میں عبدالحلیم شرر مٹیا برج چلے گئے۔ وہاں اپنے والد اور کافی سارے علما کے زیر سایہ عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ فن شاعری میں علی حیدر نظم طباطبائی کے شاگرد ہوئے۔ اس کے بعد موصوف نے لکھنؤ اور دہلی میں مزید تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کے ساتھ تصنیف اور تالیف کا سلسلہ جاری رہا۔ ان کی صلاحیتوں کو دیکھ کر منشی نول کشور نے انھیں 'اودھ اخبار' کا نائب ایڈیٹر بنا دیا۔ اس میں انھوں نے مختلف موضوعات پر متعدد مضامین لکھے جو مقبول عام ہوئے۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جن ادیبوں نے اردو ادب کو مغربی اصناف اور اسالیب فن سے روشناس کرایا ان میں عبدالحلیم شرر کا نام نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ ان کی شہرت کا بڑا سبب تو دراصل ان کے تاریخی ناول ہیں۔ ان کی شخصیت بڑی ہمہ رنگ اور ان کی صلاحیتیں بڑی متنوع تھیں۔ ناول کے علاوہ انھوں نے انشائیہ، ڈراما، شاعری، سوانح اور تاریخ میں بھی قابل قدر نگارشات یادگار چھوڑی ہیں۔

ان کی تصانیف کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان کی چند اہم تصانیف ابوبکر شبلی، ادب و تحقیق مسائل، افسانہ قیس، آغا صادق کی شادی، الفانسو، ایام عرب، عزیزہ مصر، بدرالنساء کی مصیبت، دربار حرام پور، فردوس بریں، فاتح مفتوح، درگیش نندنی، فلورا فلورنڈا، غیب داں دلہن، گذشتہ لکھنؤ، حسن بن صباح، اسلامی سوانح عمریاں، جویائے حق، منصور موہنا، ملک العزیز ورجنا، میوۂ تلخ، طاہرہ، تاریخ عصر قدیم، تاریخ اسلام وغیرہ ہیں۔ نذیر احمد اور سرشار نے انگریزی ناولوں کے مطالعے اور استفادے کے بعد بھی اپنے ناولوں میں انگریزی ناول کے فنی معیار اور بنیادی مطالبات کو سامنے رکھ کر نہیں لکھا۔ لیکن شرر پہلے شخص ہیں جنھوں نے باقاعدہ طور پر انگریزی ناول سے استفادہ کیا اور انگریزی ناول کے ضابطوں کو سامنے رکھا۔

عبدالحلیم شرر کے زمانے میں سرسید تحریک کافی مقبول ہو چکی تھی۔ شرر کے یہاں بھی اردو تحریک کے اثرات نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے ناولوں کے ذریعہ مسلمانوں کو ان کی عظمت رفتہ کی یاد دلانا چاہتے ہیں اور اسلامی تاریخ کے واقعات اور کرداروں کی بڑی رومانی تصویریں کھینچتے ہیں۔ شرر ایک زودنویس مصنف تھے۔ جیسا کہ اوپر ذکر آیا کہ ان کے ناولوں کی فہرست بہت لمبی ہے لیکن ان سب ناولوں میں فردوس بریں سب سے زیادہ مشہور اور مقبول ہوا۔

شرر نے اپنے ناولوں میں اسلامی تاریخ کے تابناک گوشے پیش کیے ہیں۔ شرر نے اصلاحی مقصد کے حصول کا ذریعہ ناول کو بنایا۔ کیونکہ ان کے نزدیک اخلاق اور نصیحت کو ناول کے پردے میں پیش کرنا لوگوں کے لیے زیادہ دلچسپی کا باعث تھا۔ اخلاقی تعلیم اور مذہب کی تبلیغ کا اس سے زیادہ مؤثر ذریعہ ان کی سمجھ میں اور کچھ نہ آیا۔

ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں:

''جس وقت شرر نے لکھنا شروع کیا اس وقت اردو صحافت اپنا ابتدائی جوش دکھا رہی تھی۔ قوم ایک نئی صورت سے جاگ کر اپنا اخلاق درست کرنے میں لگی تھی اور تمام صحافت کا مقصد یہی تھا کہ عام لوگوں کو ترقی کی راہ پر لگایا جائے۔ اس سلسلے میں قوم کو اپنی پرانی عظمت یاد دلانا بھی ضروری تھا۔ حالی اپنی مسدس میں یہی کر چکے تھے اور تمام مسلمانوں کی توجہ تاریخ اسلام کی طرف کی جا رہی تھی۔ ہر اس شخص کا جو تحریر و تصنیف میں دلچسپی رکھتا تھا، یہ تمام تر فرض سمجھا جاتا تھا کہ وہ اپنے مذہبی مسائل یا قومی تاریخ کو پڑھے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر اپنی تصانیف میں روشنی ڈالے۔ پھر اس زمانے میں عیسائی مشنری اپنے مذہب کی تبلیغ بھی کافی زور کے ساتھ کر رہے تھے اس لیے ہر مسلمان کا یہ فرض تھا کہ ان کے خلاف بھی قلمی جہاد کرے اور عیسائیت کے عیوب نکالے۔ عبدالحلیم شرر ان تمام صحافتی رجحانات کے موافق تصنیف کے میدان میں آئے تھے۔ مگر اسکاٹ کے ٹیلس سے سرراہ ملاقات نے ان کو ایک نئی راہ دکھا دی تھی اور انھوں نے تاریخی ناول کو اپنے کام کے لیے بہترین آلۂ کار پا کر تاریخی ناول نگاری کو اپنا پیشہ قرار دیا۔ اسلامی تاریخ کے واقعات پر مبنی ناولیں لکھ لکھ کر وہ اپنے پرچہ 'دلگداز' میں نکالتے رہے۔ یہاں تک کہ کچھ ہی عرصے میں ایک ڈھیر لگا دیا۔''

(ڈاکٹر احسن فاروقی، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، ص157,158: اگست 1975)

شرر کے سامنے تاریخی ناول نگاری کا مقصد بالکل واضح تھا۔ وہ ناول کے فنی محاسن سے زیادہ اس کی تبلیغی

اسپرٹ پر توجہ دیتے تھے۔ بقول ممتاز حسین:

''وہ کبھی بھی مؤرخ بننے کی کوشش نہیں کرتے لیکن تاریخ کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ عوام تک پہنچ جاتے۔ یہ بات شبلی کے یہاں بھی نہیں ملتی جو اپنی فطری سنجیدگی، متانت، سادگی اور رنگینی کے امتزاجی نشان اور دیگر بہت سی حیثیتوں سے شرر سے بالاتر ہیں۔ تاریخ کے علم اور مسلمانوں کے افکار کو عوام سے متعارف کرانے میں جتنا بڑا حصہ شرر کا ہے کسی کا نہیں۔ شرر کے ناولوں میں مشرقی تہذیب جیتی جاگتی ملتی ہے۔ ان کے تمام تاریخی ناول قرون اولیٰ کے اسلامی واقعات پر مبنی ہیں۔ یہ ناول لاکھوں انسانوں کے مطالعہ میں آچکے ہیں اور کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے نشاۃ الثانیہ میں شرر کے لٹریچر کا بہت بڑا حصہ ہے۔''

(ممتاز حسین: ملک العزیز ورجنا، مقدمہ مرتب: ص: 9، دسمبر 1964، مجلس ترقی ادب لاہور)

1884 میں عبدالحلیم شرر نے بنکم چندر چٹرجی کے ایک تاریخی ناول 'درگیش نندنی' کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ 1887 میں انھوں نے اپنا رسالہ 'دلگداز' جاری کیا تو اس میں اپنا پہلا تاریخی ناول 'ملک العزیز ورجنا' قسط وار شائع کیا۔

مولانا عبدالحلیم شرر کو تاریخ بالخصوص اسلامی تاریخ سے خاص دلچسپی تھی۔ اپنے بیشتر ناولوں کا مواد انھوں نے تاریخ سے ہی لیا ہے۔ ان کی تاریخ کا تصور بڑی حد تک ان کے احیا پسندانہ خیالات کا تابع تھا۔ اپنے تاریخی ناولوں میں مسلمانوں کو تہذیبی اور سیاسی عروج کی داستانیں سنا کر انھیں عمل کرنے کا پیغام دیا اور ان کی زندگی کو صحیح اسلامی شعور سے آہنگ کرنے کی کوشش کی۔

تاریخی ناولوں میں 'فردوس بریں' شرر کا شاہکار ناول سمجھا جاتا ہے اور یہ ناول مکمل ناول کہلانے کا مستحق بھی ہے۔ یہ ناول بہت ہی مختصر ہے لیکن اس کا پلاٹ بہت منظم ہے۔ مکالمے برجستہ اور موقع کے لحاظ سے حسین اور دلکش ہیں۔ چونکہ شرر نے اپنے ناولوں میں اصلاحی اور تبلیغی مقصد سامنے رکھا ہے۔ اس لیے وہ اپنے ہیرو کو کسی وقت بھی کوئی ایسا کام کرتے ہوئے نہیں دکھاتے جو کسر شان سمجھا جاتا ہو۔ شرر نے اپنے ناولوں میں بڑی دلکش اور رومانی زبان استعمال کی ہے۔ منظر نگاری اور ماحول کی بھی عکاسی یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ بقول علی عباس حسینی:

''مولانا شرر نے اس ناول میں سماں اور منظر بھی بہت عمدہ طور پر دکھائے ہیں۔ جس مقام کو پُر ہول بنانا ہوا ہے، وہاں اس کی مناسبت سے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جہاں جنت کی مرقع نگاری کی ہے۔ وہاں قلم کا دور دوسری ہی طرح کا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ یہ فردوس جسمانی لذت کا منبع ہے اور روحانیت کا مرکز نہیں اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا اس لیے کہ انسان کی تیار کردہ جنت میں خدا کی فردوس کی شان کہاں''۔

(ناول کی تنقید اور تاریخ، علی عباس حسینی، ص:286،287، 1959)

مولانا عبدالحلیم شرر کو تاریخ بالخصوص اسلامی تاریخ سے خاص دلچسپی تھی۔ اپنے بیشتر ناولوں کا مواد انھوں نے تاریخ سے ہی لیا ہے۔ ان کی تاریخ کا تصور بڑی حد تک ان کے احیاپسندانہ خیالات کا تابع تھا۔ اپنے تاریخی ناولوں میں مسلمانوں کو تہذیبی اور سیاسی عروج کی داستانیں سنا کر انھیں عمل کرنے کا پیغام دیا اور ان کی زندگی کو صحیح اسلامی شعور سے آہنگ کرنے کی کوشش کی۔

شرر کے تاریخی ناولوں کے کردار کسی حد تک غیر فطری بھی لگتے ہیں۔ ان کرداروں پر داستان کے بوجھل سائے پڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے بعض اوقات شخصیتوں اور کرداروں کا انتخاب غلط کیا۔ مثلاً عزیز مصر میں فساد کا منظر پیش کرتے ہوئے دکھاتے ہیں کہ جب بہت سے آدمی جو قسطاط سے تعلق رکھتے ہیں، احمد بن طولون والی کے عمل میں گھس آئے اور اس کے سامنے چیزوں کے لوٹنے اور لوگوں کو قتل کرنے لگے تو اس کے بیٹے خارویہ نے جو وہاں موجود تھا قسطاط کے امیر التجار سے اپنے باپ کا تعارف اس طرح کرایا جیسے وہ عزیز مصر ہونے کے بجائے ایک معمولی اور گمنام آدمی ہو۔ شرر نے اپنے تاریخی ناولوں کا مواد تو تاریخ سے لیا مگر اس کی تاریخی صداقت کا زیادہ خیال نہ رکھ سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ناول نگار صداقت کو اپنے زاویۂ نظر سے دیکھنے کا حق رکھتا ہے وہ اس کو الگ روپ بھی دیتا ہے۔ اس کے لیے ماحول اور فضا کی تخلیق کرتا ہے جو حقیقت کے قریب تر لے جائے۔ مگر اسے یہ حق حاصل نہیں کہ اپنے مقاصد کے جوش میں وہ تاریخی صداقتوں کو مسخ کر دے اور ان سے بھی نتیجہ اخذ کرے۔

ناول نگار کوئی بات وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ وہ صرف حاصل شدہ معلومات کی بنا پر اندازہ لگاتا ہے کہ شاید ایسا ہوا ہوگا۔ ناول نگار کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ اپنے اندازے کو حقیقت سے اس قدر قریب لے آئے کہ تاریخ کا ایک دور یا واقعہ یا چند کردار دوبارہ جیتے جاگتے نظر آنے لگیں۔ شرر اس کی کوشش تو کرتے ہیں مگر بسا اوقات اس میں کامیاب نہیں ہوتے۔ وہ اپنے انداز پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کرتے ہیں۔ ساتھ ساتھ تاریخی صداقتوں سے زیادہ ان کے دل کی خواہش نمایاں رہتی ہے اور جوش اسلامی غالب آجاتا ہے۔

شرر نے اپنے کرداروں کا انتخاب مختلف تہذیبوں اور ملکوں کے حوالے سے کیا ہے۔ مشرق و مغرب کے کئی ملکوں سے وہ اپنے کردار سامنے لاتے ہیں لیکن گفتگو کا جو نقشہ پیش کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ وہ شرر کی عام زبان اور لہجے کا آئینہ دار ہے۔ علی عباس حسینی نے اس سلسلے میں شرر کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور یہ اعتراض کیا ہے کہ شرر ایک ترک شہزادے اور روسی شہزادی کی بات چیت کا ایسا نقشہ سامنے لاتے ہیں جو مصنوعی اور فرضی دکھائی دیتا ہے۔

تاریخی ناولوں میں زبان کے استعمال کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ شرر سے یہ امید کرنا زیادتی ہے کہ وہ اپنے روسی اور ترکی کرداروں سے ملکی زبان میں ہی گفتگو کرائیں گے۔ یا ناول کے اندر ان سب کو اردو زبان سکھانے کا انتظام کر دیں گے۔ البتہ یکسانیت شرر کے ناولوں کا عیب بن گئی ہے۔ ان کے تمام ہیرو اور ہیروئن کی شکل و صورت اور سیرت ایک ہی جیسی ہے۔ بعض اوقات ان کے درمیان امتیاز دشوار ہو جاتا ہے۔

دراصل شرر اپنے زور بیان کے آگے کی دیگر چیزوں کی پرواہ نہیں کرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس کردار کے منہ میں زبان نہیں بلکہ خود شرر پس پردہ بیٹھے بول رہے ہیں۔ ان کے کردار ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کے مانند ہیں۔ وہ انھیں جہاں چاہتے ہیں لے جاتے ہیں۔ فطری اور حقیقی فضا کی تخلیق کے بجائے وہ مصنوعی ماحول بنانے میں لگ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس رقم طراز ہیں:

''یہ حقیقت ہے کہ ان کا مشاہدہ زندگی کی سطحی اور ظاہری پہلوؤں تک محدود تھا۔ وہ حیات اور نفسیات انسان کی وسعت، پیچیدگی اور گہرائی پر نظر نہیں رکھتے۔ اپنے کرداروں کو وہ ان کی فطرت کے نہاں خانوں اور سماجی محرکات کے آئینے میں نہیں دکھاتے۔ اس لیے ان کے کرداروں میں زندگی کے وہ آثار اور حقیقت کا وہ رنگ پیدا نہیں ہوتا جو قاری کے دل پر نقش ہو جاتا ہے اور جو ناول نگار کی صناعی اور ناول کی فنی قدر و قیمت کا ثبوت ہوتا ہے۔''

(پریم چند کا تنقیدی مطالعہ، ص:168، 1968، یونین، پرنٹنگ پریس، دہلی)

شرر کے یہاں ایک اور خامی ان کا حد سے زیادہ مطالعہ ہے جو ان کے کسی دوسرے ہمعصر کے یہاں نہیں ملتا۔ بسا اوقات لاکھوں اور ہزاروں کی فوج کے مقابلے میں انھوں نے تن تنہا ہیرو کو کھڑا کر دیا ہے اور اس ہیرو نے میدان فتح کر لیا ہے۔ ان کے ناولوں میں قید مکاں کے تقاضوں سے بے توجہی بھی پائی جاتی ہے۔ ہسپانیہ، فلسطین، بغداد اور سرزمین عرب کی کہانیاں ناولوں میں ڈھالی ہیں مگر ان قصوں کو ان ممالک کے معاشرتی پس منظر میں پیش کرنے کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکی۔ ان کے بہت سے ناولوں کے واقعات میں ہندوستانی رنگ جھلکتا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو ناول نگاری کے ارتقا میں اگر نذیر احمد معاشرے کی اصلاح کرتے ہیں اور سرشار کردار نگاری اور ایک خاص ماحول پر ساری توجہ صرف کرتے ہیں تو شرر تاریخی پس منظر میں مسلمانوں کی زوال پسند تہذیب او رمعاشرے کے عکاس ہیں۔ فیض احمد فیض نے لکھا ہے:

''شرر کی کتابیں اردو نثر کا آخری زینہ نہ سہی پہلا زینہ ضرور ہیں۔ ان کے مطالعہ سے جمالیاتی حسن کی تسکین نہ ہو لیکن یہ حس پیدا ضرور ہوتی ہے۔ ان کے

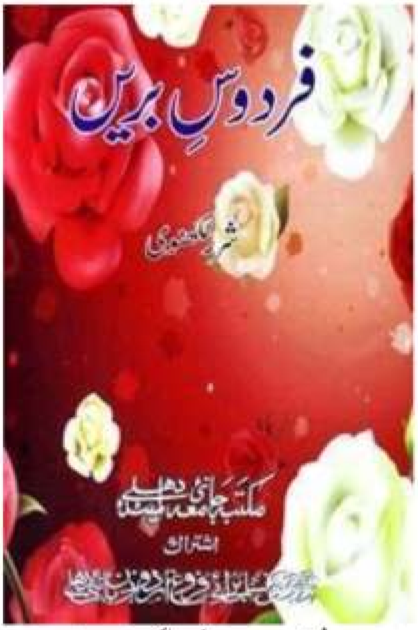

ناولوں میں فنی خوبیاں زیادہ نہیں لیکن ایک چٹخارہ ہے، ایک دلکشی ہے، ایک کیفیت ہے، اسے مطالعہ کے ابتدائی زمانہ میں فنی خوبیوں سے کم قیمت نہیں سمجھنا چاہیے۔ ان کے مضامین میں فطری مناظر کی خوبصورت تصویریں ہیں، عشق و محبت کی رنگین کہانیاں ہیں، تاریخ و معاشرے کے متعلق بے شمار معلومات ہیں۔ ان سب باتوں میں ان کی تصانیف کی قطعی قیمت بہت زیادہ نہ سہی لیکن ادبی مذاق کی ترتیب اور بیداری میں ان کا گراں قدر حصہ ہے۔''

(فیض احمد فیض 'میزان'، ص 78,89، 1982 کوہ نور آرٹ پریس، کلکتہ)

نذیر احمد، سرشار اور شرر صرف تاریخی لحاظ سے رسوا کے پیش رو نہیں تھے۔ ان تینوں نے رسوا کے لیے ایک نمونہ پیش کیا جس سے رسوا کے لیے زمین ہموار ہوئی ہے۔ رسوا کے ان پیش رؤوں کا مختصر جائزہ اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ فکشن تاریخ اور سماج کے حوالے سے اپنی بنیادیں استوار کرتا ہے۔ فکشن نگار نہ تو مؤرخ ہوتا ہے نہ سماجیاتی مفکر۔ وہ اپنا مواد اپنے عہد کی تاریخ اور سماج سے حاصل کرتا ہے، تاریخی اور سماجی حقیقت کو وہ ایک پائیدار اور لازوال حقیقت کا روپ دیتا ہے، عارضی کو مستقل بنا دیتا ہے، چھوٹی چھوٹی سچائیوں سے بڑے نتائج یا مقاصد تک پہنچتا ہے۔ رسوا کے ان پیش رؤوں کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ انھوں نے فکشن میں متوسط طبقے کی زندگی اور مسائل کو پہلی بار اہمیت دی۔ ہماری داستانوں پر اشرافیت کا جو رنگ غالب تھا اور جاگیردارانہ کلچر کی قدریں ان پر جس طرح چھائی ہوئی تھیں، انھوں نے ان داستانوں کو عام انسانوں کی زندگی سے دور کر دیا تھا۔ نذیر احمد اور سرشار نے خاص طور پر متوسط طبقے اور نچلے طبقے کی انفرادی زندگی اور اس کے سماجی مناسبات کو اپنے مطالعے کا مرکز بنایا۔ اس طرح فکشن کو ایک نئی بنیاد میسر آئی۔ رسوا کے ناولوں میں الوہی حقیقتوں کے مقابلے میں ارضی حقیقتوں سے جو شغف اور آسمان کے بجائے زمین سے جو وابستگی ملتی ہے۔ اس نے اردو میں افسانوی ادب کی روایت کا ایک نیا راستہ کھولا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس راستے کی طرف اولین اشارے نذیر احمد اور سرشار نے کیے تھے۔ رسوا تک اپنے انہی بزرگوں کے واسطے سے فکشن کی ایک جمہوری روایت پہنچی تھی۔

صنعتی عہد کا سب سے اہم عطیہ یہ ہے کہ اس عہد نے ادب سے علویت اور اشرافیت اور اسی کے ساتھ عینیت اور ماورائیت کا اخراج کرکے اسے عام انسانوں کی زندگی کا مظہر بنایا۔ ناول صنعتی عہد کی پیداوار ہے۔ چنانچہ نذیر احمد اور سرشار کے ناول بھی اسی عہد کے آشوب کا اظہار کرتے ہیں۔ فنی اور ساختیاتی لحاظ سے ان کی کوشش خام سہی، لیکن ان میں جو بصیرت ملتی ہے وہ ایک نئے دور، ایک نئی زندگی، ایک نئے سماج کی بصیرت ہے۔ یہ بصیرت اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی تہذیبی نشاۃ الثانیہ کے زیر سایہ پروان چڑھی تھی اور اس کے پس پشت ایک نئی عقلیت اور نئی روشن خیالی نے ادب کی پوری سرشت بدل دی اور اسے ایک نئی جمالیات، ایک نئے طرز احساس، ایک نئے فکری آہنگ کا ترجمان بنایا۔ رسوا تک پہنچتے پہنچتے فنی، اور سماجیاتی صداقتوں کا جو شعور ملتا ہے اس کی بالواسطہ پرورش رسوا کے پیش رؤوں کی قائم کردہ روایت نے کی تھی۔ اس روایت نے جس ادبی سماجیات کے تانے بانے ترتیب دیے تھے اسی کا عکس ہمیں فکری اور فنی اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ، زیادہ منظم اور زیادہ مضبوط سطح پر رسوا کے ناولوں میں ملتا ہے۔

■

Dr. Ahsan Alam
Ahmad Complex, Al-Hira Public School
Moh: Raham Khan, P.O. Lalbagh,
Darbhanga - 846004 (Bihar)
Mob: 9431414808
ahsanalam16@yahoo.com

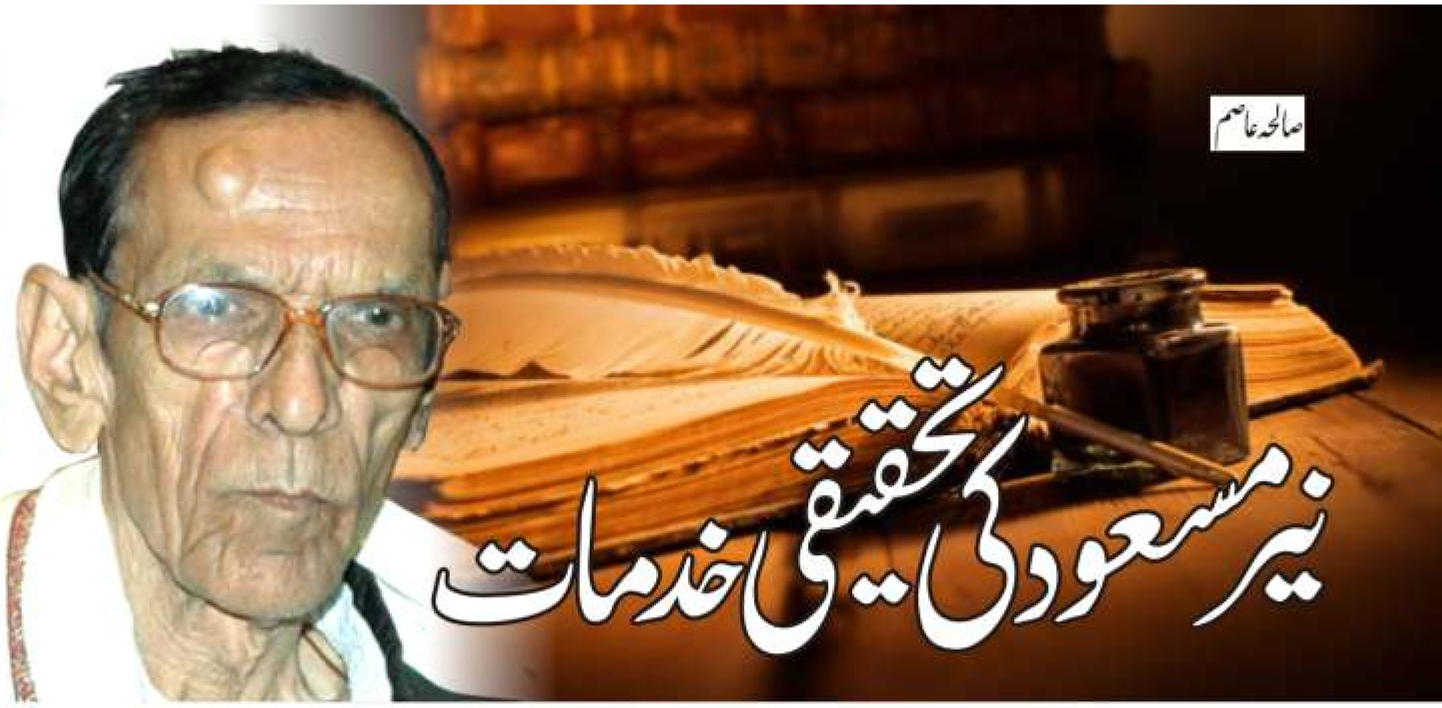

نیر مسعود کی تحقیقی خدمات

صالحہ عاصم

نیر مسعود (1936-2017) کی بنیادی شناخت ایک اہم افسانہ نگار کی ہے۔ وہ فارسی زبان وادب کے استاد تھے، لیکن اردو زبان وادب میں ان کی گراں قدر خدمات نے اردو تحقیق، تنقید، تخلیق اور ترجمے کو وقار بخشا۔ غالب کے متعلق ان کی تحریروں کو معاصر اہم ناقدین نے سراہا ہے۔ ایک تخلیق کار کے طور پر ان کی حد درجہ مقبولیت نے ان کی دوسری خدمات کے دائرے کو قدرے تنگ کردیا۔ ان کے دیگر کارناموں کو تو سراہا گیا لیکن اس طرح نہیں، جس طرح سراہا جانا چاہیے تھا۔ تخلیق کے علاوہ ان کی تحقیقی اور تنقیدی کتابوں میں 'رجب علی بیگ سرور: حیات اور کارنامے'، 'یگانہ احوال وآثار'، 'تعبیر غالب'، 'لکھنؤ کا عروج وزوال'، 'انیس (سوانح)'، 'مرثیہ خوانی کا فن'، 'شفاء الدولہ کی سرگزشت'، 'سید مسعود حسن رضوی ادیب کی ادبی زندگی'، 'خطوط مشاہیر'، 'منتخب مضامین' اور ترجمے میں 'حکیم نباتات' اور 'کافکا کے افسانے' اہمیت کے حامل ہیں۔ نیر مسعود کی خدمات کے اعتراف میں مختلف اداروں نے انھیں ایوارڈ سے بھی نوازا، جس میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (2001)، سرسوتی سمان (2007) اور صدر جمہوریہ ایوارڈ بطور خاص شامل ہیں۔

نیر مسعود نے اپنے ادبی اور تحقیقی سفر کے آغاز کے متعلق ہادی عسکری کو دیے گئے انٹرویو میں دوران گفتگو کہا تھا:

''اصل میں میرے دو ہی میدان رہے ہیں تحقیق اور افسانہ بعض لوگ غالباً اس کو متضاد سمجھتے ہیں مگر یہ ہیں نہیں۔ یہ دونوں اصناف ادب میں اگر بالکل دو الگ قسم کی چیز ہوں تب بھی انسان کو دلچسپی ہوسکتی ہے جیسے مرغی پالنے اور افسانہ لکھنے سے تو پھر دو اصناف ادب سے کیوں نہیں ہوسکتی۔ افسانے کے قاری بہت ہیں تحقیق کم لوگ پڑھتے ہیں میں نے افسانے کے مقابلے میں دس گنا تحقیق کا کام کیا ہے۔ اس کی میں نے پرواہ نہیں کی کہ افسانہ سے زیادہ فائدہ شہرت اور مقبولیت ملی۔''[1]

مذکورہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیر مسعود نے افسانہ لکھنے سے کہیں زیادہ تحقیق کے حوالے سے کام کیا ہے، لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ تحقیقی کام کا دائرہ بالعموم مخصوص حلقۂ قارئین تک ہی محدود ہوا کرتا تھا۔ جب کہ تخلیقی متن کے قارئین کا دائرہ عوام وخواص کے سیاق میں وسیع ہوتا ہے۔ اس مقالے میں نیر مسعود کی چند تحقیقی کتابوں کا مختصراً جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔ نیر مسعود نے تحقیق کے لیے ان گوشوں کو منتخب کیا، جن پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی تھی۔ ان کی پہلی تحقیقی کتاب 'رجب علی بیگ سرور: حیات اور کارنامے' ہے، جو ان کا اردو میں تحقیقی مقالہ ہے جس پر ان کو الہ آباد یونیورسٹی کے ذریعے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی۔

رجب علی بیگ سرور اردو کے نامور مصنفین میں ہیں، ادبی دنیا میں وہ فسانۂ عجائب کے مصنف، میر امن دہلوی کے ادبی حریف اور رنگین نثر کے علمبردار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ نیر مسعود نے اردو نثر کے تاریخی ارتقا کو بنیاد بنا کر رجب علی بیگ سرور کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے اور ان کے علمی و ادبی کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ سرور کے عہد میں ملک کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات کیا تھے، ان سے پیشتر شمالی ہند میں اردو نثر کا کون سا طرز عموماً رائج تھا اور اس وقت کے ادبی پس منظر میں سرور کی تاریخی حیثیت کیا تھی، ان پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مصنف نے سرور کی تصانیف اور خطوط نویسی وغیرہ پر جامع بحث کی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب سرور شناسی کے حوالے سے اہمیت کی حامل محسوس ہوتی ہے جو 9 ابواب اور ایک تتمہ میں منقسم ہے۔ پیش لفظ 'سید احتشام حسین' نے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر نیر مسعود نے اپنے مقالے کی ابتدا میں اودھ کی تاریخ وتہذیب اور ادبی روایت کا جس انداز سے جائزہ لیا ہے اس سے سرور اور ان کی ادبی تخلیقات کی نوعیت اور زیادہ روشن ہوکر سامنے آجاتی ہے۔''[2]

آگے لکھتے ہیں:

''نیر مسعود نے سرور کی افسانوی تخلیقات، تراجم، انشا اور شاعری کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے اپنی ناقدانہ صلاحیت کا بھی بہت اچھا ثبوت پیش کیا ہے اور محض دوسروں کی رائیں لکھنے پر اکتفا نہیں کی ہے۔ بلکہ اپنے نتائج خود نکالے ہیں۔''[3]

نیر مسعود کی دوسری تحقیقی کاوش 'انیس سوانح' ہے، یہاں یہ جان لینا ضروری ہے کہ نیر مسعود کے والد مسعود حسن رضوی ادیب، جو اردو اور فارسی کے پروفیسر اور مایہ ناز محقق تھے، رثائی ادب اور انیس سے ذاتی دلچسپی کے باعث انیسیات کا اچھا خاصا ذخیرہ اپنے کتب خانے میں اکٹھا کرلیا تھا۔ نیر مسعود کو انیس شناسی کچھ تو اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی، لیکن انھوں نے کتب خانۂ انیسیات سے زیادہ استفادہ کیا۔ انھیں خود بھی انیس، متعلقات انیس

اور صنف مرثیہ سے دلچسپی تھی۔ انیس کے اتنے بڑے علمی ذخیرے میں مفید اور غیر مفید، خشک وتر ہر قسم کے مواد موجود تھے۔ نیر مسعود نے ان مواد کو اصول تحقیق کی اساس پر پرکھا اور کھرے کھوٹے کو الگ کرنے کی ذمہ داری نبھائی۔

انیس کی سوانح، ایک ابتدائیہ اور 12 ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب کے ذیل میں میر انیس کے گوشہ ہائے زندگی کے تمام مشمولات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور خاندانی حالات کے ساتھ اس دور میں اودھ کے تہذیبی اور سیاسی ماحول کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ انیس کے لباس و پوشاک، وضع قطع، انداز گفتگو، دلکش آواز اور شاعری کی کلاسیکی روایت سے ان کی وابستگی، شعر سے لطف اندوزی کا مخصوص انداز اور اس پر ان کی رائے کا طرز، شوخی ومزاح، خلوت وجلوت کے معمولات، ذاتی دلچسپیاں، غرض کہ اس کتاب میں سب کچھ ہے۔ اس تحقیقی سوانح کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں غیر ضروری تفصیلات سے گریز کیا گیا ہے اور دوسری یہ کہ انیس کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو پیش نظر رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

نیر مسعود نے اس کتاب کی ضخامت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے دو ابواب کو مستقل ایک الگ کتاب کی شکل میں شائع کیا ہے اور انھیں اس کتاب کا جز قرار دیا ہے۔ اس بارے میں کتاب کے ابتدائیہ میں رقمطراز ہیں:

'مرثیہ خوانی کا فن' اور 'معرکہ انیس و دبیر' اس کتاب کے دو باب تھے جو طول کھینچ کر پونے تین سو صفحوں تک پہنچ گئے ان کی وجہ سے کتاب کا توازن بگڑ رہا تھا اس لیے یہ دونوں باب انھیں ناموں کے ساتھ دو مستقل کتابوں کی صورت میں شائع کر دیے گئے ہیں اور ان کے ضروری مشتملات کو اصل کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔''4

مرثیہ خوانی کے فن پر ان کی کتاب 'مرثیہ خوانی کا فن' جو حیات انیس کا ہی ایک حصہ ہے، اس فن پر لکھی جانے والی پہلی جامع کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے مرثیہ خوانی کے ابتدائی خدوخال، میر ضمیر، میر خلیق، مرزا دبیر اور انیس وغیرہ کی مرثیہ خوانی پر بحث کی ہے۔ انھوں نے فن مرثیہ خوانی کے عناصر اور اس کے آداب ورموز کے سلسلے میں جو مباحث پیش کیے ہیں وہ بھی کئی اعتبار سے قابل لحاظ ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ مرثیہ خوانی کے ابتدائی خدوخال مرثیہ خوانی سے قبل دو روایتوں سے ملتے ہیں، جن میں ایک داستان گوئی ہے اور دوسری شعر خوانی۔ اس طرح یہ کتاب مرثیہ خوانی کے فن، ارتقا، عروج وزوال اور ماہیت پر تفصیلی روشنی ڈالتی ہے۔

اس سلسلے (انیس سوانح) کا دوسرا حصہ معرکہ انیس و دبیر ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے معرکے، پس منظر، انیس و دبیر کے جوابی کلام، انیسیے و دبیریے، معرکے کی سنگینی اور دیرپائی اور کتابی معرکے کے ضمن میں 12 کتابوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے، ساتھ ہی دونوں شعرا کے کلام کی مختلف خصوصیات بھی بیان کی ہیں۔ مرزا دبیر کے مراثی میں زور بیان، شوکتِ الفاظ، تخیل اور صنائع وبدائع کا استعمال ہے اور میر انیس کے یہاں واقعہ نگاری میں ربط وتسلسل، مضمون کی پیوستگی، جذبات نگاری اور سلاست ہے۔ اس جامع بحث سے معرکے کے خدوخال نمایاں ہو جاتے ہیں بقول ہلال نقوی:

''یہ معرکہ انیس و دبیر ایک بہت سنجیدہ فکر، معتدل مزاج، بردبار، بامروت مگر فیصلہ کن نتیجے تک پہنچنے والے محقق کی ایک گہری دستاویز ہے۔''5

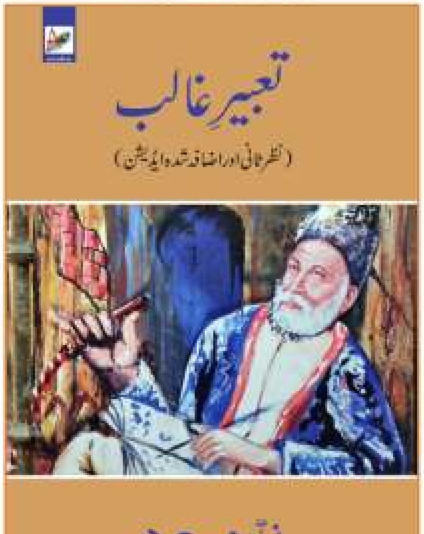

'تعبیر غالب' نیر مسعود کی تحقیقی کتابوں میں سے ایک اہم کتاب ہے۔ اس میں غالب اور ان کے متعلق مباحث پر نہایت عالمانہ بحث کی گئی ہے اور غالب کے متداول کلام سے چند ایسے اشعار کے مفاہیم پیش کیے گئے ہیں، جن کے معنی عام قارئین کی دسترس سے باہر تھے، اس کتاب میں کل 6 مضامین ہیں، جن میں سے دو 'تفہیم غالب پر ایک گفتگو' اور 'غالب اور مرزا رجب علی بیگ سرور' اپنی نوعیت کے منفرد مضامین ہیں۔

غالب کے کلام کی کئی ادیبوں نے اپنے اپنے اعتبار سے تشریح کی ہے، ان سب میں نیر مسعود نے اپنے استدلال سے الگ راہ نکالی اور اشعار کا مطالعہ کرتے وقت متقدمین کی تفسیر وتشریح کو سامنے رکھا اور پھر اتفاق یا اختلاف کیا، جس کی پہلے کے شارحین نے تائید بھی کی ہے۔

ہر اک مکاں کو ہے مکیں سے شرف اسد
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

اس شعر میں لفظ جنگل میں ہی اصل معنی چھپا ہوا ہے، کیونکہ عام طور پر مجنوں کے ساتھ صحرا کا لفظ آتا ہے۔ صحرا کے ساتھ سناٹے اور جمود کا تاثر پایا جاتا ہے۔ یہ اداسی کی ایک قسم ہے، لیکن جنگل میں صوت وصدا کا معاملہ رہتا ہے، ایسی صورت میں اس کا خاموش ہو جانا یا اداس ہو جانا زیادہ معنی خیز ہے۔

اس تعلق سے نیر مسعود نے دوسرے شارحین سے الگ مفہوم نکالا ہے، لکھتے ہیں:

''غالب نے سامنے کا لفظ 'صحرا' چھوڑ کر 'جنگل' لفظ استعمال کیا ہے اور یہ شعر اسی لفظ کا متقاضی بھی ہے اس لیے کہ صحرا کے ساتھ پہلے ہی سے ایک سناٹے اور جمود کا تاثر ہونا وابستہ ہے اور یہ اداسی سے ملتا جلتا تاثر ہے برخلاف اس کے جنگل وحشی جانوروں اور ان کے ہمہمے کی دنیا ہے مجنوں کی موت پر صحرا میں اداسی پھیلنے کا ذکر صورت حال کی تبدیلی کو اتنا نمایاں نہیں کرتا جتنا جنگل کی اداسی کا ذکر۔

صحرا اور جنگل میں سناٹے اور ہماہمی کا یہی فرق ذہن کو شعر کے ایک اور نکتے کی طرف منتقل کرتا ہے وہ یہ کہ آج ہم کو جو ویران صحرا نظر آ رہا ہے یہ در اصل زندگی اور صوت وصدا سے معمور جنگل تھا جو مجنوں کے مرنے کے بعد سے اداس ہو کر صحرا بن گیا ہے۔''6

'یگانہ احوال و آثار' نیر مسعود کے مقالات کا مجموعہ ہے۔ اپنے والد کی طرح وہ بھی یگانہ کے فن کے قدردان تھے۔ ان مقالوں میں یگانہ کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یگانہ کی ذہنی کج روی کو بالتفصیل بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں یگانہ کے معرکوں اور دوسرے شعرا پر تنقید کے ساتھ ان کی تصانیف اور چند غیر معروف تحریروں پر بھی جامع اور مبسوط بحث کی گئی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''یگانہ 1905 میں جب لکھنؤ آئے ہیں تو ان کی عمر اکیس سال تھی اس وقت لکھنؤ میں صفی، ثاقب اور عزیز کا طوطی بول رہا تھا۔ یگانہ کو وہ اہمیت نہیں ملی، جو ان تینوں حضرات کو حاصل تھی اپنے معاصرین سے مخاصمت کی بظاہر یہی وجہ ہے۔ 1914 میں جب یگانہ

نے 'نشتر یاس' کے نام سے اپنا شعری مجموعہ شائع کیا تو اس کے مقدمے میں تعلّی سے کام لیتے ہوئے لکھا کہ لکھنؤ کے معاصرین حال اور آئندہ نسلوں پر فرض ہے کہ یگانہ کی زبان اور اجتہادی تصرفات سے سند لیں دوسرے لفظوں میں انھوں نے ثاقب، عزیز اور دوسرے معاصرین سے مطالبہ کیا کہ وہ انھیں استادِ فن تسلیم کریں۔''[7]

نیر مسعود کی اس کتاب کے حرف آغاز میں خلیق انجم لکھتے ہیں:

''نیر مسعود صاحب نے بڑے سلیقے اور مستند حوالوں کے ساتھ تاریخ ادب اردو کے یہ المناک ترین واقعات بیان کیے ہیں۔ یگانہ کے بارے میں ان کی معلومات ان کے ہمدردانہ اور معتدل رویے کو دیکھتے ہوئے میری فرمائش ہے کہ وہ یگانہ کی مکمل سوانح لکھیں اور ان کی ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ لیں۔''[8]

'لکھنؤ کا عروج وزوال' بھی ان کی ایک اہم تاریخی کتاب ہے۔ جو محض 35 صفحات پر مشتمل ہے جس میں انھوں نے لکھنوی تہذیب وتمدن کے مٹتے ہوئے نقوش کو محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے اور سلطنت اودھ کے حکمرانوں کے احوال، واقعات، اور مشاغل نیز حکومت کے عروج وزوال کا ذکر کیا ہے۔ نیر مسعود کی یہ کتاب لکھنؤ کی مختصر اور جامع تاریخ کہی جاسکتی ہے۔

نیر مسعود کے 25 مضامین کا مجموعہ 'منتخب مضامین' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ جس میں تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کے مضامین ہیں اور ایک سفرنامہ 'خنک شہر ایران' بھی شامل ہے۔ اس سفرنامہ کو نیر مسعود نے 25 جنوری 1977 کے ایران کے سفر سے واپسی کے بعد مرتب کیا تھا۔ اس کتاب میں شامل تحریروں سے ان کی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیت کے ساتھ ان کی تخلیقی استعداد کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ نیر مسعود نے میر تقی میر کے فارسی دیوان کی ترتیب وتدوین اور تصحیح کی شکل میں اہم تحقیقی مواد پیش کیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر میر کا فارسی کلام مدون ہوجائے تو ہماری نئی نسل جو کہ فارسی سے بالکل نابلد ہے، فارسی کی طرف متوجہ ہوگی۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عہد میر تک فارسی زبان وادب کئی منازل طے کر چکا تھا اور بلند پایہ شعرا وادبا فارسی میں کارہائے نمایاں انجام دے چکے تھے۔ میر کی فارسی شاعری اردو شاعری کے مقابلے میں کسی قدر کم پائے کی ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انھوں نے فارسی کو باقاعدہ اپنی شاعری کا میدان نہیں بنایا تھا بلکہ اس کی حیثیت ثانوی ہی تھی۔ ان کے اشعار میں 'عکس میر' کی جلوہ گری کسی حد تک نظر آہی جاتی ہے جو ان کے ایک بڑے شاعر ہونے کی دلیل ہے۔ نیر مسعود نے ان کے فارسی دیوان کی ترتیب وتدوین میں مختلف نسخوں کو سامنے رکھا ہے۔ اور تحقیق وتدوین کے اصول وضوابط کی پوری طرح پاسداری کی ہے۔

نیر مسعود نے کئی سوانحی کتابیں بھی لکھی ہیں جن میں 'شفاء الدولہ کی سرگزشت' ایک اہم تحقیقی کاوش ہے۔ شفاء الدولہ حکیم سید افضل اودھ کے مقتدر رئیس اور جید عالم تھے۔ نیر مسعود نے اس کتاب میں شفاء الدولہ کی حیات اور ان کے علمی کارناموں کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان کی تصانیف کے ضمن میں چودہ کتابوں کا ذکر ہے اور ان کی سوانحی مثنوی 'عبرت منزل وحشت' کو نثری قالب میں ڈھالنے کا اہم فریضہ انجام دیا ہے۔ شفاء الدولہ نواب واجد علی شاہ شاہان اودھ کے مشہور ومعروف حکیم بھی تھے۔ لہٰذا اس مناسبت سے نیر مسعود نے شفاء الدولہ کے واقعات کے بیان میں تاریخی حقائق بھی پیش کیے ہیں جو ادب کے سرمایہ میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

دوسری کتاب 'دولھا صاحب عروج' مونوگراف کی شکل میں ہے۔ ان کا پورا نام سید خورشید حسن تھا۔ میر ببر علی انیس کے پوتے اور میر انیس کے بیٹے تھے۔ انھیں آخری مرثیہ خواں کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ خورشید حسن اپنے علم وفضل کی کمی کے باعث ادب میں اپنا مقام نہ بنا سکے۔ لیکن اپنے مطالعہ سے اس کمی کو حتی الامکان پر کرنے کی کوشش کی۔ اس کتاب میں نیر مسعود نے ان کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔

لکھتے ہیں:

''میر انیس کی طرح دولھا صاحب کی شخصیت بھی غیر معمولی اور دلچسپ تھی۔ میر نفیس کے سے ذی علم اور ثقہ والد کے ہوتے ہوئے بھی ان کا تقریباً بے تعلیم و تربیت رہ جانا اور مرثیہ گوئی کے بجائے ناچ، رنگ اور لہو ولعب میں منہمک ہونا، باپ کی وفات کے بعد ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا بروئے کار آجانا، اس خیال کا عام ہونا کہ وہ عارف یا کسی اور سے مرثیہ کہلوا کر پڑھتے ہیں اور دولھا صاحب کا عارف کی وفات کے بعد ان کا حال نظم کرکے اس خیال کو باطل کردینا، مرثیہ خوانی میں ان کا ساحرانہ کمالات دکھانا، ان سب باتوں نے ان کی زندگی ہی میں افسانوی حیثیت دے دی۔ ان کی وفات کے بعد عام تاثر یہی تھا کہ مرثیے کی وہ عظیم روایت جو انیس کے عہد میں معراج کمال پر پہنچی تھی دولھا صاحب کے ساتھ ختم ہوگئی تھی۔''[9]

مذکورہ بالا اقتباس سے عروج کی شخصیت اور ان کے متعلق غلط فہمیوں کا بھی ازالہ ہوجاتا ہے۔

مذکورہ کتابوں کے مختصراً جائزہ سے یہ بات اظہر من الشمس ہوجاتی ہے کہ نیر مسعود ایک وسیع المطالعہ محقق اور نقاد تھے، جن کی اصول تحقیق وتنقید پر گہری نگاہ تھی۔ اودھ بالخصوص لکھنؤ آپ کا خاص موضوع رہا ہے، جس کی جھلکیاں جابجا ان کی تحریروں میں نظر آتی ہیں۔ تحقیق کے لیے انھوں نے بالکل سادہ زبان کا استعمال کیا ہے اور اس کا طریقۂ کار مشرقی اور مغربی دونوں اصولوں پر رکھا ہے۔ تحقیق میں موضوع کے ہر پہلو کو باریک بینی سے ترتیب دیا ہے اور مراجع ومصادر میں احتساب وتوازن کی صحت مند روایت قائم کی ہے اور اپنے نتائج بھی منطقی استدلال کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب، محقق، باذوق سوانح نگار نقاد اور مترجم کی حیثیت سے اردو ادب میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

حواشی

1 معرکہ انیس ودبیر: نیر مسعود، ص 5، بحوالہ سہ ماہی رثائی ادب، کراچی، شمارہ جنوری تا مارچ 2000

2 رجب علی بیگ سرور حیات اور کارنامے: نیر مسعود، پیش لفظ، ص 6

3 رجب علی بیگ سرور حیات اور کارنامے_ نیر مسعود، پیش لفظ، ص 6

4 انیس سوانح: نیر مسعود، ص 14

5 معرکہ انیس ودبیر: نیر مسعود، ص 7

6 تعبیر غالب: نیر مسعود، ص 204

7 یگانہ احوال وآثار: نیر مسعود، حرف آغاز، ص 76

8 یگانہ احوال وآثار: نیر مسعود، حرف آغاز، ص 76

9 دولھا صاحب عروج: نیر مسعود، ص 11

Saleha Asim
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delh- 110025
Mob.:9953116850
salehaasimm@gmail.com

ماحولیاتی تنقید

مسائل و امکانات

محمد اویس ملک

تنقید روایتی سے جدید اور جدید سے مابعد جدید ہوگئی لیکن پھر بھی تنقید کا منصب وہی ہے، یعنی تنقید کا مقصد آج بھی فن پاروں کا تعین قدر کرنا اور ان کو منصبِ اصلی پر فائز کرنا ہے۔ اردو ادب میں بہت سے تنقیدی نظریات موجود ہیں جن کی بدولت ہم متن کی الگ الگ شرح کرتے ہیں۔ اور فن پارے کا بار بار مطالعہ کر کے ان گوشوں کو چھونے کی کوشش کرتے ہیں جو کہ متن میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ ماحولیاتی تنقید بھی ان ہی نظریات میں سے ایک ہے۔

ماحولیاتی تنقید کو سمجھنے کے لیے ہمیں چند مفروضات کو سمجھنا ہوگا۔ ماحول سے کیا مراد ہے؟ ماحولیاتی تنقید کیا ہے؟ ماحولیاتی تنقید کو تنقید کہا بھی جا سکتا ہے یا نہیں؟ کیا فطرت نگاری اور ماحولیاتی تنقید ایک ہے؟ اگر ماحولیاتی تنقید کو تنقید مان بھی لیا جائے تو کیا یہ ادبی تنقید میں ثمر آور ثابت ہوگی؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو باذوق قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ آیئے ان مفروضات کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ادب میں بارش، دھوپ، جنگل، ندیاں اور اسی طرح کی چیزوں کا ذکر جن کا تعلق ماحول سے ہے ماحولیاتی تنقید سمجھا جاتا ہے لیکن بات یہ ہے کہ ماحول اور ماحولیاتی تنقید دو الگ الگ اصطلاحیں ہیں۔ ماحول فرانسیسی زبان کے لفظ 'Environa' سے نکلا ہے جس کا مطلب 'گھیرنا' ہے۔ اردو لغت میں اگر اس کے معنی دیکھیں تو 'اردگرد' کے ہیں۔ یعنی ہمارا آس پاس، اس میں جاندار اور بے جان دونوں اشیا شامل ہیں۔ گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے آس پاس جتنی بھی چیزیں ہیں مثلاً پیڑ پودے، چرند پرند، فصلیں، عمارات وغیرہ ان سے ہمارا ماحول تشکیل پاتا ہے۔ لیکن جب محض ان اشیا کا ذکر ادب میں آتا ہے جن کا واسطہ فطرت سے ہے تو وہ فطرت نگاری کہلاتی ہے۔

اسماعیل میرٹھی کی ایک نظم 'ہوا چلی' ہے، کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

ہونے کو آئی صبح تو ٹھنڈی ہوا چلی\
کیا دھیمی دھیمی چال سے یہ خوش ادا چلی\
لہرا دیا ہے کھیت کو ہلتی ہیں بالیاں\
پودے بھی جھومتے ہیں لچکتی ہیں ڈالیاں\
پھلواریوں میں تازہ شگوفے کھلا چلی\
سویا ہوا تھا سبزہ اسے تو جگا چلی

ان اشعار میں صبح کی تازہ ہواؤں کو موضوع بنایا گیا ہے اور ان خصوصیات کا ذکر ہے جو کہ صبح کی تازہ ہوا میں پائی جاتی ہیں۔ صبح کی ہوا سے جیسے ہر ایک چیز میں جان آ جاتی ہے اور بند شگوفے کھل اُٹھتے ہیں۔ ان اشعار سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فطرت نگاری فطری اشیا کو ان کے اصل روپ میں پیش کرنا ہے اور ان کی حقیقت کو واضح کرنا ہے کیونکہ فطرت نگاری حقیقت نگاری کی ہی ایک ذیلی شاخ ہے۔ اس کے برعکس اگر ہم ماحولیاتی تنقید کی بات کریں تو یہ ان عناصر کو زیرِ بحث لاتی ہے جن کا تعلق ماحول سے ہے۔ ماحول اور ادب کا ہمیشہ سے ہی چولی دامن کا ساتھ رہا ہے، لیکن ماحولیاتی تنقید مابعد جدید تنقید کی صورت میں نمودار ہوئی اس کے پیچھے جو سب سے بڑی وجہ بنی وہ ہے ماحولیاتی بحران اور یہ ماحولیاتی بحران بڑھتی سائنسی ایجادات اور صنعتی ترقی کا نتیجہ ہے۔ ان سے ایک طرف اگرچہ انسانی زندگی میں سہولت پیدا ہوئی مگر دوسری طرف ماحول میں بگاڑ بھی پیدا ہوا۔ کارخانوں سے نکلنے والے دھویں سے سانس لینا محال ہوگیا ہے، وہیں ایٹمی ایجادات سے انسانی زندگی خطرے کے دہانے پر پہنچ گئی۔ نباتات وحیوانات پر بھی اس کا اثر واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ماحولیاتی تنقید ادب میں ان ہی اجزا کو تلاش کرتی ہے۔ اس طریق نقد کا آغاز سب سے

ماحولیاتی تنقید کیا ہے؟ عام لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ ادب اور ماحول کے رشتے کا مطالعہ ہے جیسے تانیثی تنقید زبان اور ادب کی جانچ پرکھ صنفی افتراقات کی بنیاد پر کرتی ہے اور مارکسی تنقید پیداوار کے ذرائع اور اقتصادی طبقات کی تلاش متن میں کرتی ہے، اسی طرح ماحولیاتی تنقید ادب میں ارض مرکوز طریق مطالعہ پر زور دیتی ہے۔

پہلے امریکہ میں ہوا۔ ارنسٹ ہیکل جو ماہرِ حیاتیات تھے انھوں نے سب سے پہلے ایکالوجی (Ecology) کی اصطلاح کو رائج کیا۔ ایکالوجی انسان، جانور اور پیڑ پودوں کا اپنے ماحول سے رشتہ یا وابستگی کا نام ہے۔ جب اس اصطلاح کا استعمال ادبی تنقید میں ہوا تو یہ Ecocriticism کہلائی۔ پہلے پہل اس نظریے کو سبز انتقادیات، سبز شعریات جیسے ناموں سے بھی پکارا جاتا تھا لیکن اب اس کے لیے ماحولیاتی تنقید کی اصطلاح رائج ہے۔ لیوپولڈ کی کتاب اس حوالے سے اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب میں زمینی اخلاقیات (Land Ethics) کو موضوع بنایا گیا اور بشر کی آمریت کو رد کیا گیا ہے۔ لیوپولڈ کا ماننا ہے کہ دنیا میں ہر ذی روح برابر کے شہری ہیں۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں جنگلوں کی حفاظت پر بھی زور دیا گیا ہے۔ ریکل کارسن کی کتاب Silent Spring ماحولیاتی تحریک کا نقطۂ آغاز بنی۔ اس کتاب میں امریکہ میں استعمال ہونے والی کیڑے مار ادویات کے خلاف احتجاج کیا گیا اور کیمیاوی اثرات کے خلاف آواز بلند کی گئی۔ 1978 میں ولیم ریکٹ (William Rueckert) نے ماحولیاتی تنقید کی اصطلاح کو اپنے مضمون Literature & Ecology: An Experiment in Ecocriticism میں استعمال کیا۔ اس نظریے کو فروغ دینے میں جو نام سب سے اہم ہے وہ شیرل گلاٹ فیلٹی کا ہے جنھیں پہلا ماحولیاتی نقاد بھی تصور کیا جاتا ہے۔ ماحولیاتی تنقید کی تعریف کرتے ہوئے گلاٹ فیلٹی (Glotfelty) لکھتے ہیں:

''ماحولیاتی تنقید کیا ہے؟ عام لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ ادب اور ماحول کے رشتے کا مطالعہ ہے جیسے تانیثی تنقید زبان اور ادب کی جانچ پرکھ صنفی افتراقات کی بنیاد پر کرتی ہے اور مارکسی تنقید پیداوار کے ذرائع اور اقتصادی طبقات کی تلاش متن میں کرتی ہے، اسی طرح ماحولیاتی تنقید ادب میں ارض مرکوز طریق مطالعہ پر زور دیتی ہے۔''1

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ماحولیاتی تنقید ادب میں ارض مرکوز طریق کار پر زور دیتی ہے اور ادب اور ماحول کے درمیان رشتے کو وا کرتی ہے۔

1992 میں ایک ماحولیاتی ادبی تنظیم قائم کی گئی جس کا نام Association for the studies of literature and environment(ASLE) ہے۔ اس تنظیم کا مقصد ماحولیاتی ادب کی تحقیق کے علاوہ اس کی ترویج وترقی بھی تھا۔ 1993 میں پٹرک مرفے نے Interdisciplinary studies in literature and environment(ISLE) نامی رسالہ جاری کیا جس کا مقصد ماحولیاتی فکر کو اجاگر کرنا تھا۔

ادب میں ماحول کو کس طرح سے پیش کیا گیا ہے، کیا ماحول کو ظالم بنا کر پیش کیا گیا ہے یا مظلوم، ماحولیاتی نقاد کا کام ان ہی چیزوں کو پرکھنا ہے، لیکن یہاں یہ بات ذہن نشیں رہے کہ ماحولیاتی تنقید ماحول کے ظالم ہونے کے مفروضے کو مسترد کرتی ہے اور یہ دلیل پیش کرتی ہے کہ اس سب کا ذمہ دار بذاتِ خود انسان ہے۔ انسان کے بڑھتے لالچ نے نہ صرف جنگلوں کا صفایا کیا بلکہ گھروں سے نکلنے والے کوڑا کرکٹ اور صنعتی کارخانوں سے نکلنے والے فضلے سے آبی وسائل کو بھی آلودہ کردیا۔ اس سے ہوا یہ کہ نہ صرف جنگلی جانوروں کے ٹھکانے (Habitat Destruction) ختم ہوئے بلکہ آبی زندگی بھی متاثر ہوکر رہ گئی۔ انسانی جغرافیے میں ایک نظریہ ہے جس کا نام ہے ڈٹرمنزم۔ اس نظریہ کے ڈانڈے بھی ماحولیاتی تنقید سے جا ملتے ہیں۔ ڈٹرمنزم کی تعریف یہ ہے:

''وہ فلسفے، نقطۂ نظر اور طریق کار جو ماحول کے ساتھ تعلق اور اس کی فکر سے جنم لیتے ہیں ماحولیاتی عزم کہلاتے ہیں۔ ماحولیاتی عزم کے مکتبۂ فکر کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ کسی بھی معاشرتی گروہ کی تاریخ، ثقافت، طرزِ زندگی اور ترقی کے مرحلے زیادہ تر یا مکمل طور پر ماحول کے مادی عوامل (جیسے زمین کی ساخت، آب وہوا، حیوانات و نباتات) پر ہی منحصر ہوتے ہیں۔ ماحولیاتی عزم عام طور پر انسان کو ایک غیر فعال وجود کے طور پر دیکھتا ہے، جس پر ماحولیاتی عوامل اثر انداز ہوکر اس کے رویے، فیصلہ سازی کے عمل اور طرزِ زندگی کو متعین کرتے ہیں۔''2

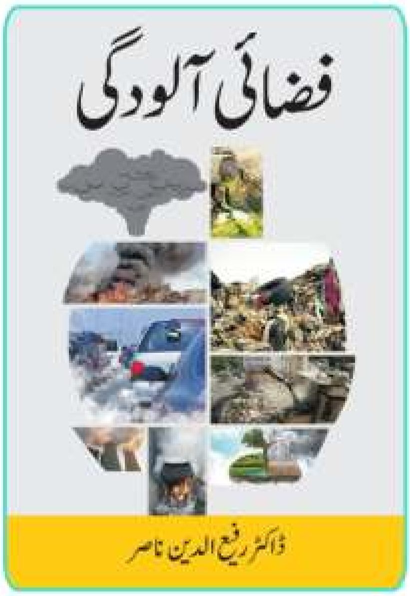

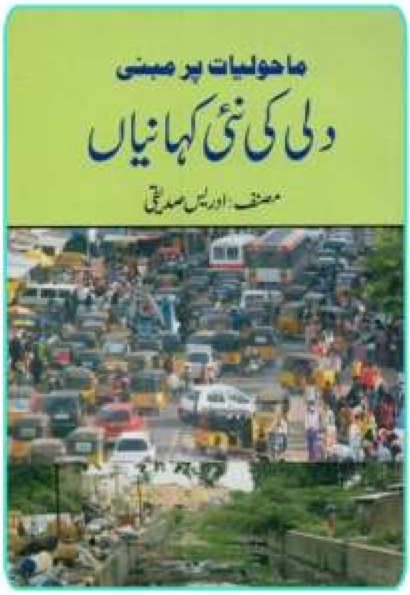

اس اقتباس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ماحولیاتی تنقید جس 'بشر مرکوز' (Anthropocentrism) نظریہ کو رد کرتی ہے اور حیاتیاتی مرکوزیت (Biocentrism) کو فروغ دیتی ہے۔ اس کا سرا اسی ڈیپ ایکولوجی اسکول سے جاملتا ہے۔ گویا ہم اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ فطرت نگاری فطری اشیا کو "As it is" پیش کرتی ہے جب کہ ماحولیاتی تنقید نہ صرف فطرت اور ماحول کو اس کی حقیقی صورت میں دیکھتی ہے بلکہ اس کے تحفظ کے لیے بھی آواز بلند کرتی ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار دیکھیں۔

پیڑ کے کاٹنے والوں کو یہ معلوم تو تھا
جسم جل جائیں گے جب سر پہ نہ سایہ ہوگا
کل رات جو ایندھن کے لیے کٹ کے گرا ہے
چڑیوں کو بہت پیار تھا اس بوڑھے شجر سے
چہار سمت سے اب کاٹتا ہے جنگل کو
یہی قبیلہ کسی وقت پوجتا تھا درخت
اجاڑ دشت میں کچھ زندگی تو پیدا ہو
یہ ایک جیج یہاں بھی شجر کروں گا میں
مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

مذکورہ اشعار میں نہ صرف ماحول کو اس کی اصل صورت میں پیش کیا گیا ہے بلکہ ماحول کو درپیش مسائل کا بھی اظہار دیکھنے کو ملتا ہے اور اس پر غور وفکر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر ہم ماحول کا، اپنے آس پاس موجود پیڑ پودوں کا خیال نہ رکھیں تو عنقریب ہم ماحول کے خطرناک رخ سے دوچار ہوں گے۔ اس کے علاوہ فطرت سے درس لینے کی تلقین بھی ان اشعار میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس پوری بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ماحولیاتی تنقید کے اہم نکات میں ان چیزوں کو اہمیت حاصل ہے۔

1. فن پاروں میں ماحول کو کس انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ کیا ماحول کو حظ بہم پہنچانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے؟ کیا ماحول کو تشبیہ و استعارہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے؟ کیا فن پارے میں ماحول اپنا آزاد وجود رکھتا ہے یا نہیں؟ ماحول کو منظر کرنے کا ذریعہ تو نہیں بنایا گیا ہے؟
2. ماحولیاتی نقاد ادب، فطرت اور ثقافت کے مابین رشتے کی وضاحت کرتا ہے۔
3. ماحولیاتی نقاد کے لیے وہ فن پارہ زیادہ اہمیت کا حامل ہے جس میں فطرت اس کی اصل صورت میں موجود ہو۔
4. ماحولیاتی نقاد Ecological Balance پر زور دیتا ہے۔
5. ماحولیاتی نقاد فطرت میں بگاڑ پیدا ہونے کے سبب آنے والے خطرات سے بھی آگاہ کراتا ہے۔
6. فطرت نگاری کے ذیل میں جو ادب آتا ہے ماحولیاتی نقاد اس کا نئے سرے سے جائزہ لینے کا متقاضی ہے۔

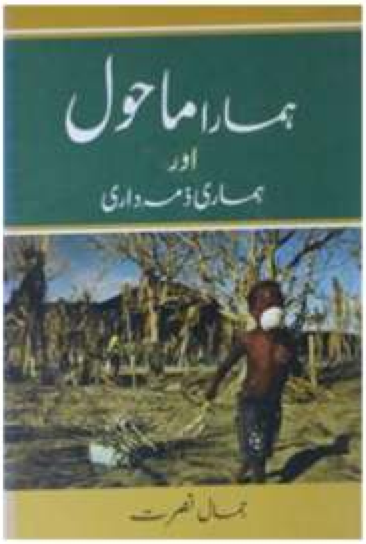

اردو ادب کی اگر بات کریں تو قلی قطب شاہ سے لے کر اب تک جتنے بھی مصنفین گزرے ہیں، انھوں نے فطرت کو کسی نہ کسی انداز میں پیش کیا ہے لیکن بحیثیت طریقِ نقد اس کے ساتھ بقول شخصے Buy one get one جیسا رویہ اپنایا گیا۔ اردو ادب میں اس حوالے سے بہت کم کتابیں دستیاب ہیں۔ ڈاکٹر مولا بخش نے 2013 میں مقالہ 'ماحولیاتی تنقید: نیا تنقیدی مخاطبہ' تحریر کیا تھا۔ اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''پروفیسر عتیق اللہ نے اردو میں پہلی بار ماحولیاتی تنقید کی اطلاقی صورت کی مثال پیش کی، لیکن ماحولیاتی تنقید کے تناظر میں اردو ادب کی صورتحال پر مختصراً ہی سہی پہلی بار نگاہ راقم ڈال رہا ہے۔''

یہ بات درست ہے کہ پروفیسر عتیق اللہ نے جو دو مضامین تحریر کیے ہیں 'مجید امجد کی نظم توسیع شہر' اور 'پروین شیر کی شاعری: ایک ماحولیاتی مطالعہ' یہ اطلاقی نوعیت کے ہیں۔ علاوہ ازیں جو بیان مولا بخش نے اپنے حوالے سے دیا ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جس نے کما حقہ اردو ادب کو ماحولیاتی نقطۂ نظر سے تصرف میں لانے کی کوشش کی ہے، اس کو کسی حد تک درست تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اردو شعری ادب خاص کر قصیدے کو ماحولیاتی نقطۂ نظر سے کافی اہمیت دی ہے اور مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا ماننا ہے کہ نارنگ صاحب اس نظریے پر لکھنے والے پہلے نقاد ہیں۔

ماحولیاتی تنقید اگر ماحولیاتی تحفظ پر زور دیتی ہے تو کیا ادب کو اس طریق نقد سے فائدہ ہوگا؟ اس سوال کا جواب اس بات میں مضمر ہے کہ مابعد جدید تنقید ادب کو

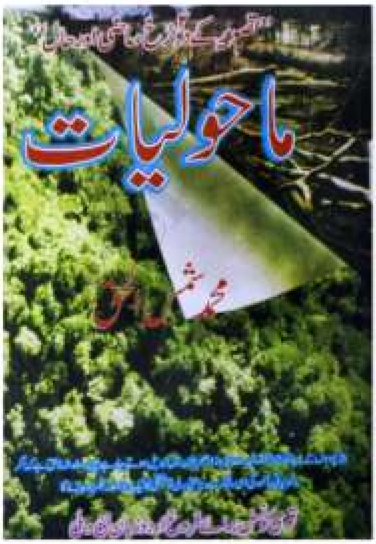

ایک ہی پیمانے سے پرکھنے کی نہیں بلکہ نت نئے طریقوں اور زاویوں سے پرکھنے کی وکالت کرتی ہے اور متن کو ایک نئی تعبیر سے روشناس کرایا جاتا ہے، اسی طرح ماحولیاتی تنقید ادب کی تشریح وتعبیر زمینی اخلاقیات کو سامنے رکھ کر کرتی ہے اور انسان، ثقافت اور ادب کے باہمی رشتے کی نوعیت کو پرکھتی ہے۔ ہم یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ماحولیاتی تنقید نہ صرف تنقید کی کسوٹی پر کھری اترتی ہے بلکہ ادبی دنیا میں یہ ثمر آور بھی ثابت ہوگی۔

حواشی

1. Cheryll Glotfelty, The Ecocriticism Reader, The U niversity of Georgia Press, Athens, 1996, P 18
2. Majid Husain, Human Geography, Rawat Publications, Jawahar Nagar Jaipur, Third Edition, P 38

■

Mohd Ovais Malik
Research Scholar,
University of Kashmir
Srinagar- 190006 (J&K)
Mob.:9697219470
ovais.urscholar@kashmiruniversity.net

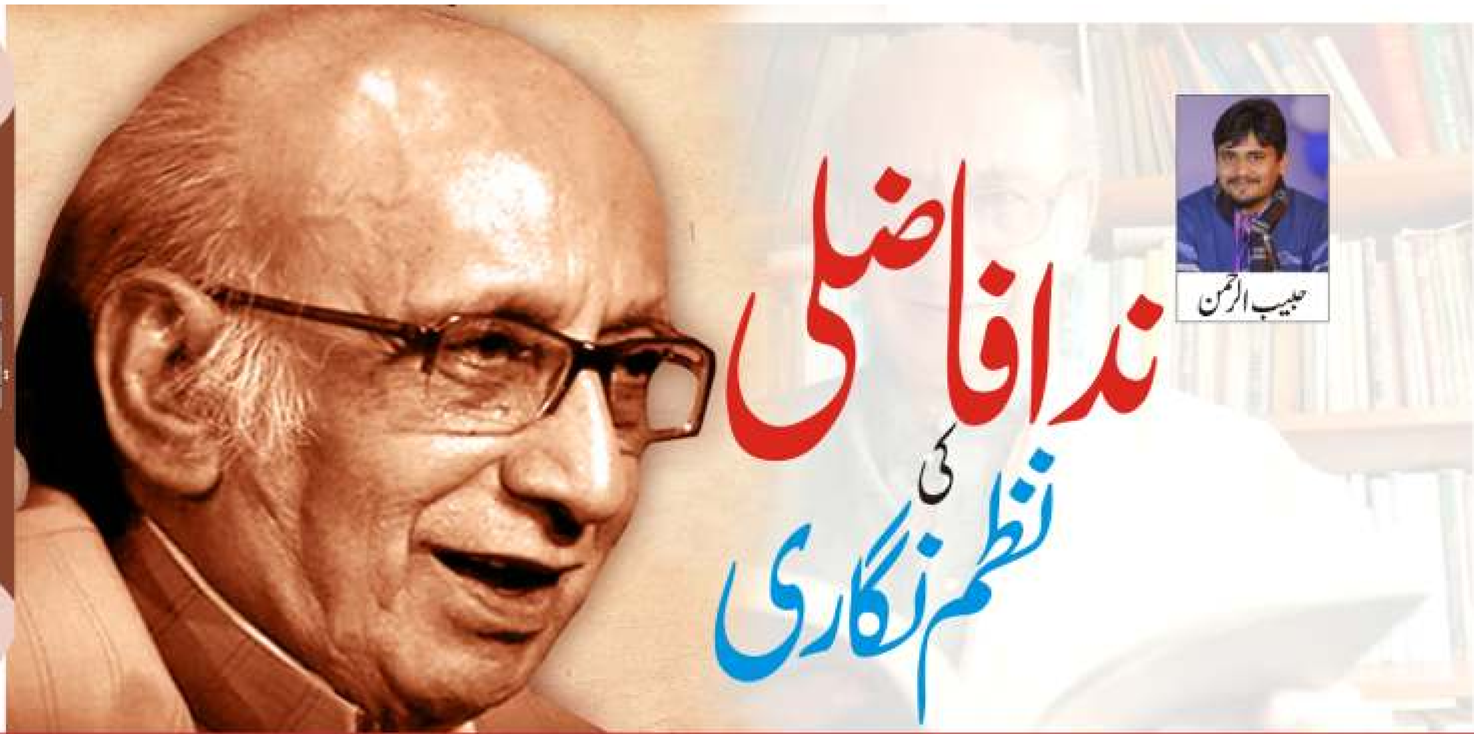

حبیب الرحمن

ندا فاضلی کی نظم نگاری

اردو نظم نے بیسویں صدی میں کئی فکری و جمالیاتی تجربات کا سامنا کیا اور ترقی پسند تحریک سے لے کر جدیدیت تک ایک طویل سفر طے کیا۔ اس سفر میں جن شعرا نے انسانی تجربات کو نئے رنگ، تازہ اسلوب اور داخلی سچائی کے ساتھ پیش کیا، ان میں ندا فاضلی کا نام نمایاں ہے۔ ان کی نظموں میں شہری زندگی کی الجھنیں، رشتوں کے زوال، انسانی تنہائی، وجودی اضطراب، محبت کی شکست وریخت اور بدلتے ہوئے سماجی رویے سادگی مگر غیر معمولی تاثیر کے ساتھ ابھرتے ہیں۔ ان کی نظموں کا بنیادی جوہر انسان کی شکستہ داخلی دنیا کا سچا بیان ہے جہاں بے چینی، خوف، تنہائی اور امید ایک ساتھ سفر کرتے ہیں۔

ندا فاضلی کا اصل نام مقتدا حسن ہے، لیکن ندا فاضلی کے نام سے انھیں شہرت حاصل ہوئی۔ مدھیہ پردیش کے شہر گوالیار میں 12 اکتوبر 1938 کو ان کی پیدائش ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گوالیار میں حاصل کرنے کے بعد وہ دہلی چلے آئے۔ دہلی میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی تقسیم ہند کا واقعہ پیش آیا۔ تقسیم ہند کے وقت ان کے والدین پاکستان منتقل ہو گئے لیکن انہوں نے ہندوستان میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا اور وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ندا فاضلی کو 1998 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، 2003 میں نغمہ نگاری کا اسکرین ایوارڈ اور 2003 میں ہی انھیں پدم شری جیسے باوقار اعزاز سے بھی نوازا گیا۔ ندا فاضلی کا پہلا مجموعۂ کلام 1969 میں شائع ہوا۔ اس کے بعد متعدد شعری مجموعے ''لفظوں کے پُل، مور ناچ، آنکھ اور خواب کے درمیاں، کھویا ہوا سا کچھ، شہر میرے ساتھ چل، زندگی کی طرف'' منظر عام پر آئے۔ معیار پبلی کیشن دہلی نے چھ شعری مجموعوں کو یکجا کر کے ''شہر میں گاؤں'' شائع کیا۔ یہ مجموعہ 662 صفحات پر مشتمل ہے۔ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ ''ملاقاتیں'' 1960 میں منظر عام پر آیا۔ انھیں مہاراشٹرا حکومت کی جانب سے میر تقی میر ایوارڈ بھی حاصل ہوا۔ ندا فاضلی 8 فروری 2016 کو حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث بمبئی میں انتقال کر گئے۔

انسانیت اور زندگی کو استحکام بخشنے والی شاعری ندا فاضلی کا خاصہ ہے۔ وہ وقت اور حالات دونوں سے متاثر ہوئے۔ تقسیم ہند کا سانحہ ان کی زندگی کا سب سے اہم موڑ تھا، انہوں نے ہجرت نہ کر کے اپنی شاعری کی جڑوں کو کبیر اور سورداس کی مٹی سے اور بھی قریب کر لیا۔ ان کی شاعری میں ہندوستان کی مٹی کی سوندھی مہک ہے۔ ندا فاضلی کی نظموں میں داخلی کرب کی جہتیں نہایت تہہ دار انداز میں سامنے آتی ہیں۔ ان کے یہاں انسان ایک ایسے وجود کی صورت ابھرتا ہے جس کے گرد سماج کا شور تو ہے، لیکن اس کے اندر خاموشی کی ایک وسیع دنیا آباد ہے۔ ندا فاضلی انسان کو مسلسل تلاش کا مسافر قرار دیتے ہیں۔ ایک ایسا مسافر جو اپنے ہی وجود کے اندھیرے میں گم ہو چکا ہے۔ تنہائی کا موضوع ان کی شاعری کا اہم حصہ رہا۔ شہروں کی زندگی میں تنہائی کے آسیب اور اس کرب کو ندا فاضلی نے مختلف سطحوں پر برتا ہے۔

مسجد کا گنبد سونا ہے/ مندر کی گھنٹی خاموش/ جزدانوں میں لپٹے سارے آدرشوں کو/ دیمک کب کی چاٹ چکی ہے/ رنگ! رگلابی رنیلے رپیلے/ کہیں نہیں ہیں/ تم اس جانب میں اس جانب بیچ میں میلوں گہرا غار/ لفظوں کا پل ٹوٹ چکا ہے/ تم بھی تنہا/ میں بھی تنہا

(لفظوں کا پل)

یہ نظم ندا فاضلی کی مخصوص کرب آلود اور تہذیبی شعور سے بوجھل شاعری کی نمائندہ مثال ہے۔ شاعر نے چند مختصر اور ٹوٹے ہوئے پیکروں کے ذریعے عصر حاضر کی روحانی و سماجی ویرانی کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ''مسجد کا گنبد سونا ہے، مندر کی گھنٹی خاموش'' یہ دونوں مصرعے صرف مذہبی مراکز کی خاموشی نہیں بتاتے بلکہ اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ انسان کی باطنی حرارت، عقیدے کی شدت اور روحانی وابستگی کا مرکز مٹ چکا ہے۔ عبادت گاہیں اپنی اصل معنویت سے خالی ہو گئی ہیں۔ وہ باقی تو ہیں مگر ان میں وہ دل، وہ سوز، وہ یقین، وہ گریۂ نیاز نہیں رہا۔ یوں مذہب اور روحانیت کا تعلق عمارتوں اور رسومات تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ جزدانوں میں لپٹے ہوئے آدرشوں کو دیمک کا چاٹ جانا اس بات کا استعارہ ہے کہ اصول، نظریے، اخلاقی قدریں، ذہنی روشنی اور فکری وراثت سب کچھ کتابوں کی حد تک رہ گیا ہے۔ ہم نے سب کچھ محفوظ تو رکھا مگر انہیں زندگی سے علاحدہ کر دیا۔ رنگوں کا غائب ہو جانا زندگی کی خوشبو اور جذبے کا مر جانا ہے۔ گلابی، نیلا، پیلا یہ سبھی محبت، آزادی، امید اور

مسرت کے رنگ ہیں، جواب انسانی دنیا کے نقشے سے غائب ہوتے نظر آرہے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ زندگی بے رنگ ہوگئی ہے کیونکہ دل کا موسم تبدیل ہوگیا ہے۔ ''لفظوں کا پل ٹوٹ چکا ہے'' یہ مصرعہ پوری نظم کا دھڑکتا ہوا دل ہے۔ گفتگو، سمجھ، احساس مشترک اور ایک دوسرے تک رسائی یہ سب کسی معاشرے اور کسی تعلق کی بنیاد ہوتے ہیں۔ جب یہ پل ٹوٹ جائے تو لوگ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہو جاتے ہیں۔ یہی کیفیت آخری مصرعے میں سمٹ آئی ہے ''تم بھی تنہا، میں بھی تنہا'' یہ صرف دو افراد کی تنہائی نہیں، زمانے کی تنہائی ہے۔ مذہب، فن، محبت، فکر اور رشتوں کی شکست کے بعد انسان ایسی جگہ آن کھڑا ہوتا ہے جہاں اس کے پاس نہ کوئی سہارا ہے نہ کوئی ہم سفر۔ ندا فاضلی کی یہ نظم سادہ الفاظ میں گہری معنویت کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ اس میں بڑے فلسفیانہ سوالات ہیں، مگر بیان نرم اور داخلی ہے۔ یہ نظم ہمیں یاد دلاتی ہے کہ اصل آشوب کہیں باہر نہیں، خود انسان کے اندر، اس کی روح اور اس کے تعلقات کے مرکز میں ہے۔ یہ ایک عہد کی ویرانی کا نوحہ ہے، مگر اس کے بیچ میں ایک کم بولنے والی اذیت بھی ہے جو خاموش دل کو چھو جاتی ہے۔ ایک دوسری نظم میں شاعر پرامید ہے کہ یہ مایوسی کی فضا جلد ختم ہوگی:

ابھی مرا نہیں زندہ ہے آدمی شاید/ یہیں کہیں اسے ڈھونڈو یہیں کہیں ہوگا/ بدن کی اندھی گپھا میں چھپا ہوا ہوگا/ بڑھا کے ہاتھ/ ہر اک روشنی کو گل کر دو/ ہوائیں تیز ہیں جھنڈے لپیٹ کر رکھ دو/ جو ہو سکے تو ان آنکھوں پہ پٹیاں کس دو/ نہ کوئی پاؤں کی آہٹ/ نہ سانسوں کی آواز/ ڈرا ہوا ہے وہ/ کچھ اور بھی نہ ڈر جائے بدن کی اندھی گپھا سے نہ کوچ کر جائے/ یہیں کہیں اسے ڈھونڈو/ وہ آج صدیوں بعد/ اداس اداس ہے/ خاموش ہے/ اکیلا ہے/ نہ جانے کب کوئی پسلی پھڑک اٹھے اس کی/ یہیں کہیں اسے ڈھونڈو یہیں کہیں ہوگا/ برہنہ ہو تو اسے پھر لباس پہنا دو/ اندھیری آنکھوں میں سورج کی آگ دہکا دو/ بہت بڑی ہے یہ بستی کہیں بھی دفنا دو/ ابھی مرا نہیں/ زندہ ہے آدمی شاید

(آدمی کی تلاش)

نظم کا بنیادی استعارہ ''آدمی کی تلاش'' ہے۔ یہاں ''آدمی'' محض انسان بطور جسم یا حیاتیاتی وجود نہیں بلکہ انسانیت کا وہ جوہر ہے جس میں شفقت، محبت، دردمندی، تعلق، احساس اور سماجی ذمہ داری سمیت وہ تمام قدریں شامل ہیں جن پر تہذیب قائم ہے۔ شاعر کو احساس ہے کہ تکنیکی ترقی، سیاسی کشمکش، سماجی انتشار اور روحانی زوال نے انسان سے اس کی اصل قدریں چھین لی ہیں، لیکن وہ یہ بھی باور کراتا ہے کہ وہ جوہر ابھی مرا نہیں، کہیں دب گیا ہے لیکن زندہ ہے۔ ''ابھی مرا نہیں، زندہ ہے آدمی شاید'' پوری نظم کی بنیاد ہے۔ یہاں شاید کی احتیاطی نرمی بتاتی ہے کہ شاعر کے یقین میں بھی ایک دردناک تذبذب موجود ہے۔ شاعر اسے بدن کی اندھی گپھا میں تلاش کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ گپھا نفس کی تاریکیاں، حرص، خود غرضی، خوف، مفاد اور ان تمام باطنی اندھیروں کی علامت ہے جنہوں نے انسان کی اصل روشنی کو چھپا رکھا ہے۔ شاعر روشنی کو گل کرنے اور ہوا کو روک دینے کی بات کرتا ہے۔ بظاہر یہ عجیب سا عمل ہے، مگر اس کی معنویت گہری ہے۔ نظم کا لہجہ فلسفیانہ نہیں بلکہ وجودی (Existential) اور انسانی ہے۔ یہ ہمیں بتاتی ہے کہ انسانیت کو واپس جگانے کے لیے جذباتی شور نہیں بلکہ باطنی سکون اور لمس درکار ہے۔ ''اکیلا ہے، اداس ہے، خاموش ہے'' یہ تینوں صفات جدید انسان کی علامات ہیں۔ نہ تو اس کی زندگی میں حقیقی گفتگو باقی رہی، نہ رشتہ، نہ باطنی سکون۔ شاعر بتاتا ہے کہ وہ انسان آج تاریخ کے ایک طویل سفر کے بعد ایک ایسی جگہ آ کھڑا ہوا ہے جہاں وہ بچ تو گیا ہے، مگر جی نہیں رہا۔ یہ نظم ایک احتجاج ہے، مرثیہ ہے، دعا ہے اور امید بھی ہے۔ اس میں لفظیات سادہ ہیں، لیکن استعارات اور داخلی معنویت گہری ہے۔ ندا فاضلی کے یہاں فلسفہ زندگی کے لطیف تجربے کے طور پر ظاہر ہوتا ہے، نہ کہ بحث و منطق کے طور پر اور یہی اس نظم کی خوبصورتی ہے کہ یہ عقل سے نہیں بلکہ قاری کے دل سے مخاطب ہوتی ہے۔ شاعر امید و بیم کی کیفیت سے دوچار ہے۔ اسے روشنی کی ایک ہلکی کرن محسوس ہوتی ہے، وہ پھر سے پرامید ہو اٹھتا ہے کہ انسان ابھی زندہ ہے اس میں زندگی کی رمق ہے بس اسے تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ انسانی جبلتوں سے آشنا ہو کر ہی ندا فاضلی نے اس طرح یاس اور محرومی کو ظاہر کیا ہے۔ انہیں یہ اچھی طرح سے معلوم ہے کہ انسانی قدروں کو ڈھونڈھنا آسان نہیں لیکن ناممکن بھی نہیں ہے۔ محبت تو شکایتوں کی پروردہ ہے، زندگی میں آلام و مصائب کا آنا ہی اس کے ہونے کی دلیل ہے۔ زمانے کی نیرنگیوں سے مقابلہ کرتے ہوئے ہی زندگی کی حقیقت تک رسائی ہو سکتی ہے۔ ندا فاضلی نے اپنی نظموں میں عام موضوعات کو بھی بیان کی سطح پر اس قدر نفاست سے پیش کیا ہے کہ ان میں ایک بہاؤ کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

جذبوں کو لفظ میں پرونا اور پھر اسے احساس کی سطح سے گزار کر ایک کیفیت کی علامت بنا دینا شاعری کا حسن ہوتا ہے۔ شاعر نے چیزوں کو کیسے محسوس کیا ہے، اس کی نظروں نے مناظر کو کس طرح قید کیا ہے، یا احساس کی شدت اسے کس طرح کی لفظیات استعمال کرنے پر مجبور کرتی ہے یہ دیکھنا کافی اہم ہوتا ہے۔ ندا فاضلی نے ایک تخلیق کار کی حیثیت سے جو محسوس ہوا سیدھے طریقے سے پیش کر دیا۔ جذبے کی سچائی اور سبک روی ان کی نظموں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ندا فاضلی کے تخلیقی مزاج سے متعلق احمد سہیل رقمطراز ہیں:

''ندا فاضلی کی شاعری کا تخلیقی جذبہ اپنے مزاج میں یکتا ہے۔ اظہار کے مختلف الجہت رنگوں میں ان کے شعری احساس میں کرب کو قاری محسوس کر کے روتا ہے، آنسو بہاتا ہے اور بے بسی اور لاچارگی کو اپنے وجود میں ڈھونڈھ لاتا ہے۔ ان کا یہی موضوعی احتجاج ہی ان کی شاعری کا ماخذ ہے۔ ان کا شاعرانہ احساس، جمالیات اور نظام پیکریت مصورانہ اور ایک سنگیت کار کا خواب آلود واہمہ تو ہے جس میں انتشار متن اور میکانیکی اسلوب متن کا الزام تو عائد کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی لفظیات میں بشری کہانیاں پوشیدہ ہوتی ہیں، جہاں فرد کی شناخت تبدیل یا معدوم ہو جاتی ہے۔ اپنوں سے

> **ندا فاضلی کی نظموں میں داخلی کرب کی جہتیں نہایت تہ دار انداز میں سامنے آتی ہیں۔ ان کے یہاں انسان ایک ایسے وجود کی صورت ابھرتا ہے جس کے گرد سماج کا شور تو ہے، لیکن اس کے اندر خاموشی کی ایک وسیع دنیا آباد ہے۔ ندا فاضلی انسان کو مسلسل تلاش کا مسافر قرار دیتے ہیں۔ایک ایسا مسافر جو اپنے ہی وجود کے اندھیرے میں گم ہو چکا ہے۔**

ایک سیاسی حادثے کے بعد بچھڑنے کا احساس ان کی شاعری کا حاوی محرک ہے۔''1

مندرجہ بالا اقتباس ندا فاضلی کی شاعری کے بنیادی محرکات، داخلی کرب اور نظریاتی احتجاج کی نشاندہی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ندا فاضلی کی شاعری میں ذاتی المیے، ہجرت، تقسیم کا دکھ اور رشتوں کے ٹوٹنے کی اذیت موجود ہے۔ اقتباس اس شعری کیفیت کو اس انداز میں بیان کرتا ہے کہ قاری ندا کی شاعری کو صرف تخلیق نہیں بلکہ ایک اجتماعی جذباتی تجربے کے طور پر محسوس کرے۔ ''شاعرانہ احساس، جمالیات اور نظام پیکریت'' جیسی ترکیبیں ان کے فن کی ان تہوں کا احاطہ کرتی ہیں جہاں مشکل سوالات، وجودی اضطراب اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے تضادات ابھرتے ہیں۔ ''اپنوں سے ایک سیاسی حادثے کے بعد بچھڑنے کا احساس ان کی شاعری کا حاوی محرک ہے۔'' ندا فاضلی کی شخصیت اور شاعری کے تاریخی پس منظر کو ایک جملے میں سمیٹ دیتا ہے۔

ندا فاضلی کی شاعری میں ہندوستان کا گاؤں پوری طرح آباد ہے۔ پیکر تراشی اور مختلف اجزا کو جس طورسے وہ پیش کرتے ہیں اس سے ایک صاف وشفاف ہیولیٰ تیار ہوجاتا ہے جس کو پہچاننے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔

بیٹھے بیٹھے اوب رہے ہیں/ آؤ سہیلی رسرپٹ بھاگیں/ سر کے بال تلک کھل جائیں/ دھم دھم ریوں دہلیزیں لانگیں/ گھٹنوں گھٹنوں تال میں چل کر منہ منہ تک/ گاگر بھر لائیں/ اور نشانے تاک تاک کر/ پتھر سے پتھر ٹکرائیں ربرگد کی ننگی شاخوں پر/ بن جھولے کے/ ایسا جھولیں/ لوکٹ چٹلے میں پھنس جائے/ انگوٹھے پیشانی چھولیں/ ہنسی ہنسی میں اک دوجے پر بدلی بن بن کر یوں ٹوٹیں/ آٹے جیسا گس کر گوندھیں/ کئی جگہ سے ٹوٹیں پھوٹیں

(دو سہیلیاں)

یہ نظم بچوں جیسی معصوم، خودرو اور بے ساختہ نسائی سرشاری کی تصویر ہے۔ شاعر نے ایسا منظر بنایا ہے جس میں دو سہیلیاں روزمرہ کی یکسانیت اور گھریلو ذمہ داریوں سے نکل کر ایک لمحے کے لیے زندگی کو پوری شدت سے جینے کا فیصلہ کرتی ہیں۔ نظم میں آنگن، مٹی کی خوشبو، درختوں کی آہٹ اور بچپن کی ہنسی شامل ہے جسے زندگی کی دھول نے دھندلا کر دیا ہے۔

تقسیم کا درد جا بجا ندا کی شاعری میں نظم ہوتا رہا

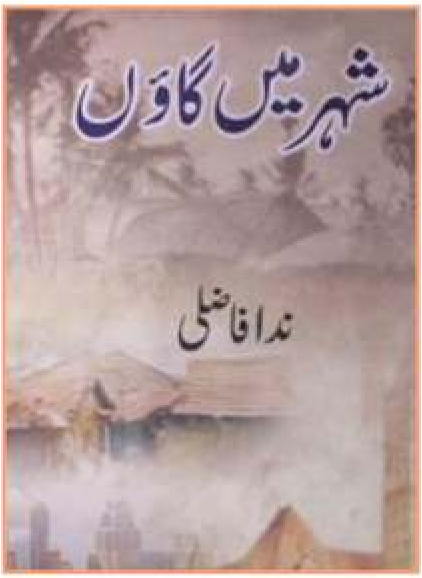

ہے۔ ہندوستان سے گہری محبت اور انس نے انہیں ہجرت سے روکا۔ ہندوی تہذیب سے مالا مال یہ فنکار اپنی مٹی کی عظمت کا ہمیشہ قائل رہا۔ تہذیبی ٹکراؤ اور لسانی بُعد کے باوجود اس نے اپنے آپ کو ہندوی تہذیب کا پروردہ بنائے رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ہندی کے سبک اور شیریں الفاظ جا بجا پیوست نظر آتے ہیں جنھیں ان کی تخلیق سے الگ کر کے دیکھنا ناممکن ہے۔ ایک اقتباس دیکھیں:

''میرا جی کی طرح ندا فاضلی کی شاعری میں ثقافتی عمل ہندی شاعری کے وسیلے سے در آیا۔ ابتدا میں انھوں نے ہندی شعر و ادب کا غائر مطالعہ کیا تھا۔ وہ تلسی داس اور کبیر سے بھی متاثر تھے اور شاید انہیں سے Inspire ہو کر وہ اپنی داخلی زندگی میں قلندری اور بے نیازی کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ تاہم اس فرق کو ملحوظ نظر رکھنا پڑے گا کہ ندا فاضلی کی شعری لفظیات ہندی سے کسی قدر ہم آہنگ ہونے کے باوجود اردو کی تہذیبی اقدار اور صوفیانہ مزاج میں ڈھلی ہوئی ہے۔''2

اس اقتباس کا حاصل میرا جی اور ندا فاضلی کا تقابلی حوالہ ہے، جو بجا طور پر پیش کیا گیا ہے، کیونکہ دونوں نے ہندی، سنسکرت اور بھگتی روایت سے اثر قبول کیا۔ یہ بات کہ ''ثقافتی عمل ہندی شاعری کے وسیلے سے در آیا'' ندا کی شاعری کی جڑوں کی جانب اشارہ ہے، جو نہ صرف لسانی بلکہ فکری اور نفسیاتی سطح پر بھی قابل تجزیہ ہے۔ تلسی داس اور کبیر کا ذکر بطور ماخذ یا اثر کے نہایت برمحل ہے، خصوصاً کبیر، جن کی بے نیازی، سادگی اور براہ راست اظہار کی روایت ندا کے اشعار میں واضح طور پر محسوس ہوتی ہے۔

تجھ سے پہلے پہلے بیت گیا جو/ وہ اتہاس ہے تیرا/ تجھ کو ہی پورا کرنا ہے/ جو بن باس ہے تیرا

(گیت)

ندا فاضلی کی نظموں میں اتہاس، بن باس، پاٹھ شالا، روپ، دھنک اس طرح مستعمل ہیں کہ ان کو علاحدہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ اُس روایت کا حصہ ہے جو ہماری شاعری کا حسن رہا ہے۔ ''گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس'' سے شروع ہونے والا ہندوی تہذیب کا سلسلہ اب بھی قائم و دائم ہے۔ ندا فاضلی نے رومانیت سے بھر پور نظمیں لکھی ہیں۔ رادھا، کرشن، کنہیا، جوگ، بیراگ، پیت اور میت سے گہری انسیت نے ہی ان میں محبت کا رنگ بھر دیا۔ غزلوں کا سب سے محبوب موضوع یہی رہا ہے، لہٰذا ان کی غزلیں اس تجربے سے بھرپور ہیں۔

ندا فاضلی نے جس طرح زندگی کو جیا اور فلم نگری سے وابستہ ہونے کے بعد بھی ادبیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا وہ قابل ستائش ہے۔

ندا فاضلی کی شاعری جدید انسان کے دکھ، اس کے خوف، اس کی تنہائی اور اس کی امیدوں کا آئینہ ہے۔ وہ زندگی کے بظاہر معمولی تجربوں سے بڑے معنوی اور فکری نتائج اخذ کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں ایک ایسا داخلی کرب ہے جو ہر قاری کو اپنی زندگی کے کسی نہ کسی موڑ کی یاد دلاتا ہے۔ ان کے یہاں الفاظ محض اظہار کے ذرائع نہیں بلکہ انسانی وجود کی پوری تاریخ کے حامل بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ندا فاضلی کی شاعری آج بھی تازہ، توانا اور معاصر محسوس ہوتی ہے۔ ندا فاضلی نے جدید اردو نظم کو نہ صرف ایک نئی نرمی، سادگی اور شفافیت عطا کی، بلکہ اسے اپنے عہد کی نفسیات اور سماجیات کا سچا ترجمان بھی بنایا۔

حواشی

1 شعور بشر کی تمثیلی پیکریت کا شاعر: احمد سہیل، سہ ماہی اردو، امراوتی، ندا فاضلی نمبر 2014، ص:144

2 ندا فاضلی، اساس شعر: مختار شمیم، سہ ماہی اردو، امراوتی، ندا فاضلی نمبر، ص:9

■

Dr. Habiburrahman
R48B/2, 4th Floor, Masjid Al Noor,
Jogabai Extn. Jamia Nagar,
Okhla, New Delhi-110025
9716929568

شیخ عمران

ڈاکٹر منشاء الرحمن خان منشا کی غزل گوئی

سرزمین ودربھ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے ایسے ہیرے پیدا کیے جو شایان زماں کے تاجوں کی زینت بنے اور لوگوں کے دلوں میں روشنی جگانے کا ذریعہ بھی۔ یہاں کے علم و ادب کے کئی چاند افق ادب پر طلوع ہوئے جن کی ضیاپاشیوں سے علم وادب کی ایک دنیا روشن ہوئی۔ ان میں ڈاکٹر منشاء الرحمن خان منشا کا نام قابل ذکر ہے۔ یوں تو ودربھ میں لاتعداد شخصیات ایسی رہیں جو اپنی پیدائش اور اس سرزمین سے اپنی وابستگی پر فخر کا اظہار کرتی رہیں۔ لیکن ودربھ کی سرزمین نے خود ڈاکٹر منشا کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھا۔ ڈاکٹر منشا نے متعدد اردو اصناف میں کامیاب تخلیقی نمونے پیش کیے اور ہر جگہ ان کی انفرادیت نے قاری کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ ہر انسان کی شخصیت اور افکار کی تعمیر اور نشوونما میں بہت سے محسوس اور غیر محسوس محرکات کارفرما رہتے ہیں۔ اسے وراثت میں جو کچھ ملتا ہے یا اپنے خاندانی ماحول میں وہ جو کچھ دیکھتا ہے یا جن بزرگوں کی آغوش تربیت میں آنکھ کھولتا ہے ان کے اثرات سب سے زیادہ دیرپا، مثبت اور دوررس ہوتے ہیں۔ شاعری ایک ایسا فن ہے جس کہ ذریعہ شاعر اپنے پوشیدہ جذبات وخیالات کا اظہار اپنے ذوق کی تسکین کے لیے کرتا ہے۔ اس کی اساس مطالعہ، مشاہدہ اور تجربے پر ہوتی ہے۔

ڈاکٹر منشاء الرحمن خان منشا کی شخصیت بہت پہلودار تھی۔ وہ ایک ذی علم اور روشن خیال آدمی تھے ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے ادیب، نقاد، غیر معمولی خطیب ،مبصر اور ایک بہترین اُستاد تھے۔ ان کی تحریر کی طرح تقریر میں بھی بلا کا جادو تھا۔ وہ جتنا اچھا بولتے تھے اتنا ہی اچھا لکھتے تھے۔ اردو کے علاوہ عربی وفارسی پر بھی انہیں کامل عبور حاصل تھا۔ ڈاکٹر منشا کے قلم سے وجود میں آئی تحریریں اردو ادب کا بیش قیمتی سرمایہ ہیں۔ وہ سماجی و ثقافتی صورت حال کا بھی بہتر شعور رکھتے تھے۔ جو ان کے ذوق ادب کی آبیاری میں کارگر محرک ثابت ہوا۔ ڈاکٹر منشا سمندروں کو حباب میں قید کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ وہ رنگ قدیم ہو یا طرز جدید حرف کو گہر بنانے کے عمل سے بخوبی واقف تھے۔

اردو شاعری میں جس صنف کو انھوں نے اپنی فکر و نظر کا محور بنایا وہ غزل ہے۔ یوں تو شاعری کے ہر میدان میں انہوں نے جوہر دکھائے لیکن غزل ان کی شہرت کا موجب ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر منشا کی غزل گوئی میں غزلیہ شاعری کی جملہ خصوصیات موجود ہیں۔ جس کی بناء پر انہیں ایک کامیاب غزل گو شاعر کہا جاسکتا ہے۔ غزل گوئی میں ایک نیا انداز انہوں نے پیدا کیا۔ ان کے دور اوّل کلام کے مجموعے 'نوائے دل' اور 'آہنگ حیات' میں بطور خاص غزل گوئی اپنی بہار دکھاتی ہے۔ نیز 'عکس دوراں' کی غزلوں میں بھی ایک طرح کی متانت وسنجیدگی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ڈاکٹر منشا کے کلام میں فصاحت ،سادگی ،شوقِ فکر کی بلندی خوبصورتی کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ ان کے شاعرانہ مسلک کو سمجھنے کے لیے یہ اشعار پیش ہیں:

راگنی بن کے مرے لب پہ فغاں آتی ہے
ہر کسی شخص کو یہ بات کہاں آتی ہے

سچ بولنے کا ہنر جانتے ہیں ہم
لفظوں کو تولنے کا ہنر جانتے ہیں ہم

اردو شعری ادب میں کئی طرح کے شعرا پائے جاتے ہیں۔ شعرا کی ایک قسم وہ ہوتی ہے جو صرف مشاعروں میں واہ واہ کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ جب تک ان کی آواز ہے وہ زندہ رہتے ہیں، ان کی آواز ختم ہوتے ہی ان کی شاعری ختم ہوجاتی ہے۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو نام ونمود کو ترجیح دیتے ہیں۔ صرف وہی شاعر اپنی اور اپنی شاعری کی اہمیت کو سمجھتا ہے جس میں تنقیدی شعور موجود ہوتا ہے۔ ڈاکٹر منشا ایسے ہی باشعور شعراء میں سے تھے۔ جنھوں نے شاعری کو محض شاعری نہیں سمجھا بلکہ اسے دلی جذبات واحساسات کے سرچشمہ سے تعبیر کیا۔ پروفیسر آل احمد سرور ڈاکٹر منشا کی غزل گوئی پر روشنی ڈالتے ہوئے 'آہنگ حیات' کے

پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''منشاء الرحمن منشا خوش فکر ،خوش گو اور خوش ادا شاعر ہیں۔ وطن کا یہ پرستار، انسانیت کا یہ دوست، جدید فکر ونظر کا یہ محرم، نظمیں بھی کہتا ہے اور غزلیں بھی۔ مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ اس کی غزلیں، نظموں کے مقابلہ میں زیادہ پُر کیف ہیں۔غزلوں میں بڑی بے ساختگی اور روانی ہے۔

(آہنگ حیات، منشاء الرحمن خان منشا، 1963، ناگپور، ص 12-11)

منشاء الرحمن خان منشا جتنے بڑے شاعر تھے اتنے بڑے انسان بھی تھے۔ جو بھی ان سے ملتا ان کی عظمت اور بزرگی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ وہ اردو کے ان چند باکمال اور صاحب دل شعراء میں سے تھے جنہیں زمانہ صدیوں بعد پیدا کرتا ہے۔ ان کی علمیت ،قابلیت اور صلاحیت کا تو ایک زمانہ قائل تھا لیکن خلوص وملنساری کی خوبیوں نے انہیں عوام وخواص میں بہت مقبول بنادیا تھا۔ انہوں نے اپنی شہرت اور نام آوری کو کبھی خود پر مسلط نہیں کیا اور نہ ہی اس کا گمان کیا۔ ناگپور کے غزل گوشعراء میں موصوف کا ایک منفرد مقام ہے۔ منشاء الرحمن خان منشا کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اوران کے قدردان نہ صرف ناگپور بلکہ ملک بھر میں موجود تھے۔ شعر پڑھنے کا ان کا اپنا ایک انداز تھا۔ مشاعروں میں جب شرکت کرتے تو بہت سنجیدگی کا مظاہر کرتے۔ ہر مشاعرے میں تازہ کلام سناتے۔ مشاعروں میں منشا صاحب نے جو غزلیں پڑھی ان میں نیا پن ہے۔ اکثر شعر سناتے وقت وہ سراپا شعر ہوجاتے اور بہت ڈوب کر کلام سناتے۔ ایک اچھے سخنور کی یہی پہچان ہے کہ وہ موقع اور محل کی مناسبت سے اشعار نذر کرتا ہے۔ شعر سنانے کا انہیں بے حد شوق تھا۔ غزل صنف شاعری پر آپ نے خوب تجربے کیے ہیں۔ اپنے فکر وفن کے امتزاج سے نت نئے پیکر وضع کیے اور غزل کو تازگی عطا کی۔ اس میں قوت بھی ہے اور عصری میلان بھی۔ منشاء الرحمن منشا کی شاعری سنگ تراشی کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ یہ شاعری ایک حساس انسان کی شاعری ہے۔ غزل عاشقانہ طرز کلام کا نام ہے۔ اسی لیے شاعر نے بھر پور کوشش کی ہے کہ وہ غزل کے اصل رنگ سے دور نہ جائے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

ہم زیست کے ماروں کو جلا کیوں نہیں دیتے
آپ اپنی مسیحائی دکھا کیوں نہیں دیتے
بیمار کہیں باتوں سے اچھے بھی ہوئے ہیں
ہمدرد بنے ہو تو دوا کیوں نہیں دیتے
آتے ہیں ہمیں کام کڑے وقت پہ منشا
پھر شکوہ ہے ہم دادِ وفا کیوں نہیں دیتے

شاعر کے نزدیک شاعری صرف جذبات کی ترجمان نہیں بلکہ حکمت کی آئینہ دار بھی ہے اور جمالیات کی عکاس بھی۔ ڈاکٹر منشا اردو غزل کے مزاج

داں اور نباض تھے۔ دراصل غزل کا ایک مزاج اور اس کی کچھ خصوصیات اور اُصول ہیں جن کی پابندی ہر شاعر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اردو شعراء کے کلام میں بظاہر یکسانیت سی محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے غزل کی تمام خصوصیات کو اپنے فن میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ ان کے اشعار سادگی اور پُر کاری سے لبریز ہیں۔ مثلاً

یہ فیض غم ہم اہل دل کے ہاتھوں
دو عالم کا خزینہ آگیا ہے
بھڑک اٹھتی ہے جس میں آگ دل کی
وہ ساون کا مہینہ آگیا ہے

غزل گو شعرا کی صف میں ڈاکٹر منشا نے اپنا ایک منفرد انداز پیش کیا۔ انہوں نے اپنی غزلوں کے لیے مترنم بحریں تلاش لیں، دلچسپ ردیف وقوافی کا انتظام کیا اور اکثر طویل ردیفوں سے کام لے کر ترنم پیدا کرنے کی کوشش کی اور اپنے فن کی پختگی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اردو غزل کو انہوں نے جو مزاج دیا بعد آنے والے شعراء نے اس کی پیروی کی۔ وہی محبوب پر فداکاری کا سرفروشانہ جذبہ، وہی نیاز مندانہ کیفیت ،وہی شکوہ شکایت میں محبت بھرا انداز، غم عشق کی رواں دواں کیفیتوں کی ترجمانی اور ساتھ ہی اخلاقی مضامین کی بھرمار ان کی غزلوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ معروف اردو شاعر ڈاکٹر شرف الدین ساحلؔ منشاء الرحمن خان منشا کی غزل گوئی کے متعلق لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر منشاء الرحمن خان منشا نے یوں تو کئی صنف سخن میں اپنا زور فکر صرف کیا ہے لیکن غزل کے ساتھ انہوں نے جس احترام سے سلوک کیا ہے۔ دیگر اصناف میں ایسا احترام نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں ،منظومات ،قطعات اور رباعیات کے بالمقابل زیادہ پر کیف اور دلنشیں ہیں۔ اُن میں جان بھی ہے اور توانائی بھی ،شائستگی بھی ہے اور نفاست بھی ، بے ساختگی بھی ہے اور روانی بھی ،غرض کہ ان میں ایک ایسی ایمائی قوت ہے جس کے سامنے ڈاکٹر منشا کی غزلوں کا قاری غیر ارادی طور پر اپنا سرخم کردیتا ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں کے لئے مترنم بحریں تلاش کیں۔ دلچسپ ردیف وقوافی کا انتخاب کیا۔ اور اکثر طویل ردیفوں سے کام لے کر ترنم پیدا کرنے کی کوشش کی اور اپنے فن کی پختگی کا ثبوت فراہم کیا۔ طویل ردیفیں اگر خوبصورتی اور شاعرانہ شعور کے ساتھ استعمال نہ کی جائیں تو شعر کا حسن زائل ہوجاتا ہے۔ منشا صاحب نے اس پر خطر وادی کو سلاست و سادگی کے بل بوتے پر نہایت ہی آسانی کے ساتھ عبور کیا ہے۔ موجودہ زمانے میں اس قسم کی مثالیں بہت کم سامنے آتی ہیں۔ ڈاکٹر منشا روایت کی گود میں پلے ہیں۔ بچپن سے جوانی اور جوانی سے کہولت کی منزلوں کو اسی کے آغوش میں گذارا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں کا ہر شعر روایت کا امین ہے۔''

(حسب منشا، مرتب: عبدالرحیم نشتر، بشمولہ مضمون 'ڈاکٹر منشا کی غزل گوئی'، ڈاکٹر شرف الدین ساحل، اگست 1983، ص 1)

ڈاکٹر منشاء الرحمن منشا کی غزلیات کا جائزہ بھی اس حقیقت کے اعتراف کے لئے کافی ہے کہ ان کا دائرہ فکر محدود نہیں بلکہ وسیع تر ہے۔ انہیں غزل کی روایت سے کما حقہ آگاہی اور غزل کے اسلوب پر مکمل قدرت حاصل ہے۔ انہوں نے ہر قسم کے مضامین اور خیالات کو بڑی خوبی اور حسن نزاکت کے ساتھ غزل کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی غزلیں

صرف حسن وعشق کی فرسودہ داستانیں ہی نہیں سناتیں بلکہ زندگی کے بہت سے اہم پہلوؤں تک بھی ڈاکٹر منشا کی نگاہ دوررس تک پہنچتی ہے۔ڈاکٹر منشاء الرحمن خان منشا نے زندگی کی نغمہ خوانی کی ہے اور خوب کی ہے۔ آپ کی غزلیں صرف محبوب کے دیار تک ہی محدود نہیں بلکہ سماج کے ان واقعات کی دنیا میں بھی پہنچتی ہے جہاں مظلوموں کی آہیں، بزرگوں کی شفقتیں، یتیم بچوں کی خواہشات کے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔اپنی بیشتر غزلوں میں انہوں نے انسانی زندگی کی کشمکش اور رموز کو موثر پیرائے میں پیش کیا ہے۔ پروفیسر احتشام حسین 'نوائے دل' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''کسی شاعر کے رنگ سے متاثر ہونے کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ طرز ادا، جذبات، خیالات اور افکار میں سو فیصدی اس کی پیروی کی جائے لیکن اس رنگ کی ایک ہلکی سی تہ متاثر ہونے والے کے رنگ میں شامل ہوجاتی ہے جسے اس نے اپنے رنگ میں بسا رکھا ہے۔ پروفیسر منشاء الرحمن منشا اس کو راز میں نہیں رکھتے کہ وہ جگر کے شعلہ طور اور آتش گل میں نور ہی نور دیکھتے ہیں پھر اگر اس نور سے وہ اپنا چراغ بھی جلا لیتے ہوں تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہوسکتی۔جو شخص بھی پروفیسر منشاء الرحمن منشا کی غزلوں کا مطالعہ کرے گا اسے اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد کیف ولطف حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔کیونکہ غزل کی شاعری اگر غالبؔ یا اقبالؔ کی طرح ذہنی اور فکری نہ ہوتو اسے انسانی جذبات اور تجربات، قلبی واردات اور کیفیات کے بیان سے بھی اسی طرح وقیع اور جاندار، پُر کیف اور پُر اثر بنایا جاسکتا ہے۔

جیسے ذہنی تجربات اور تصورات کے بیان سے، یہ صورت حال پروفیسر منشا کی غزلوں میں بھی ملتی ہے۔

(نوائے دل، منشاء الرحمن خاں منشا، 1963 حیدرآباد، ص 9-8)

اصناف اردو میں غزل نرم جذبوں کی ترجمانی کرتی ہے۔اس میں پرشکوہ لہجہ کے بجائے نرم وشریں اور دل میں اُتر جانے والا لب ولہجہ پسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔غنائیت ترنم اور موسیقیت سے اس کے حسن واثر میں اضافہ ہوتا ہے۔ڈاکٹر منشا کی غزلوں میں بھی ہمیں یہ خوبی قابل قدر حد تک ملتی ہے۔ان کی غزل کے بعض اشعار میں موسیقیت اور غنائیت کی وجہ سے ساحرانہ کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔اشعار پیش ہیں:

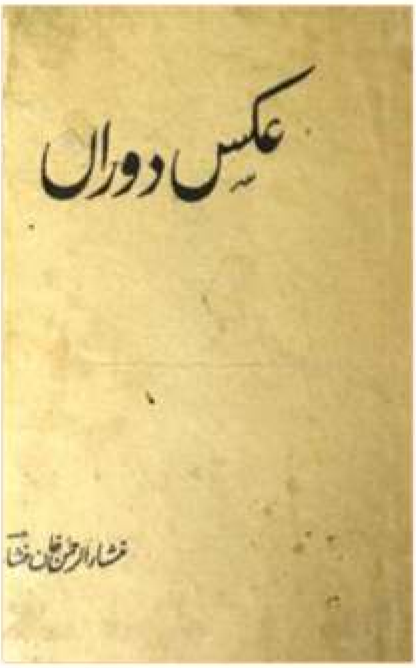

عشق کا کام بخت سازی ہے
اس کی ہر بات امتیازی ہے
جس کو کہتے ہیں انقلاب حیات
اک جنوں کی کرشمہ سازی ہے
اس میں کیا آئے بو حقیقت کی
جو مجازی ہے وہ مجازی ہے

ان اشعار کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر منشاء الرحمن خان منشا نے شاعری خاص کر غزل کے اعلی ومعیاری تقاضوں کو بہت ہوش مندی کے ساتھ نبھایا ہے۔ڈاکٹر منشاء الرحمن خان منشا اردو غزل کی کلاسیکی روایت سے گہرا ربط رکھتے تھے۔اپنی غزلوں میں عشقیہ مضامین کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ باندھا ہے۔وہ پند وموعظمت، حکمت ومعرفت اور تصوف و اخلاق کے مضامین کو بھی رمزیت وایمائیت، روانی و سلاست سے بیان کرنے کے ہنر سے واقف تھے:

لوگ کیا جانے کیوں رسم وفا بھول گئے
جینے کے شوق میں مرنے کی ادا بھول گئے
عیش وعشرت کی تمنا میں کچھ ایسے اُلجھے
درد کا لطف، تڑپنے کا مزہ بھول گئے
منشا آلام زمانہ پریشاں ہوکر
اچھے اچھے بھی تو آئین وفا بھول گئے

سادگی، سلاست اور روانی ڈاکٹر منشا کے غزلوں کے نمایاں اوصاف ہیں۔ان کا کلام زبان کی پختگی کا حامل اور فنی عروضی عیوب سے پاک ہے۔ڈاکٹر منشا کے متعدد اشعار زبان زد خاص وعام ہوگئے ہیں۔ان اشعار میں برجستگی، صفائی، لہجے کا حسن وانداز بیان کی سادگی پائی جاتی ہے۔ان میں سادگی بھی ہے اور پُر کاری بھی، جلال بھی ہے اور جمال بھی واقفیت کا حسن بھی ہے، حسن وعشق کے دلکش پیکر بھی ہیں اور روایات کی پاسداری بھی۔سادہ زبان میں شعر کہنا آسان کام نہیں۔سادگی میں ادبیت برقرار رکھنا اور اس میں فلسفہ کا عنصر پیدا کرنا اہم کام ہے۔ان کا یہی سب سے اہم کارنامہ ہے کہ انہوں نے نہایت عام فہم زبان میں شاعری کی۔اشعار ملاحظہ ہوں:

کس طرح بسر ہوتے ہیں دن رات نہ پُوچھو
صورت ہی فقط دیکھ لو حالات نہ پُوچھو
جینے کا یہ سامان ہمیں بخشا ہے کس نے
ہے کس کی عطا درد کی سوغات نہ پُوچھو

اردو ادب کی حقیقت ہے کہ کسی فن کار کو خواہ وہ کتنا ہی بلند مرتبہ اور باصلاحیت کیوں نہ ہو، اس کی حیات میں وہ مرتبہ نہیں ملتا جس کا وہ مستحق ہوتا ہے۔ ڈاکٹر منشا بہت خوش نصیب تھے۔انہیں ان کی زندگی ہی میں کافی شہرت حاصل ہوئی اور سبھی نے ان کی شعری صلاحیت کا اعتراف کیا۔ڈاکٹر منشاء الرحمن خان منشا نے غزل میں وہ کمال حاصل کیا جو مشکل ہی سے کسی شاعر کو حاصل ہوتا ہے۔قدرت جن قلم کاروں پر مہربان ہوتی ہے انہیں قوت قلم کے ساتھ عمر کی درازی بھی عطا کرتی ہے۔طویل عمر اگر خدا کے فضل سے کسی قلم کار کو حاصل ہوتی ہے تو صفحہ قرطاس پر بے شمار تخلیقات پیش کی جاسکتی ہیں۔ایسی صورت ڈاکٹر منشا کے ساتھ بھی پیش آئی۔حیرت کی بات ہے کہ عمر کے ۸۶ سال میں انہوں نے ایک مشاعرے میں غزل پڑھی اور اس پر خوب داد حاصل کی تھی۔ڈاکٹر منشا نے تادم مرگ کام کیا، کبھی تھکے نہیں ایک طویل عرصہ تک اردو شاعری کی آبیاری کرتے رہے۔اردو غزل کے سرمائے میں ڈاکٹر منشاء الرحمن خان منشا نے جو بیش قیمتی اضافے کیے اس کے لیے وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

■

Dr.Shaikh Imran
Assistant Professor & Research Guide Urdu
Vasantrao Naik Govt.Instt.of Arts & Social Sciences,
Nagpur Maharashtra.
Mob:9921986904

محمد اویس سنبھلی

قیصر الجعفری کی غزلیہ شاعری

اردو غزل کی تاریخ میں کچھ نام ایسے ہیں جو اپنی فکری وسعت، فنی مہارت اور اسلوب کی ندرت کے باعث ہمیشہ یادر کھے جائیں گے۔ ان ہی معتبر ناموں میں ایک درخشاں نام قیصر الجعفری کا ہے۔ ایک ایسے شاعر جنھوں نے اردو غزل کو ایک نیا رنگ اور نیا آہنگ عطا کیا۔ قیصر الجعفری اردو ادب کے اُن شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے غزل کو روایتی سانچوں میں ڈھالنے کے بجائے اس میں اپنی انفرادیت کے رنگ بھرے۔ ان کا اسلوب اگرچہ کلاسیکی غزل کے طرز اور آہنگ کی توسیع کرتا ہے لیکن بعض اوقات یہی وابستگی ان کی شاعری کو روایت کی حدود میں مقید بھی کر دیتی ہے۔ تاہم، ان کے اشعار میں ایک سلیقہ مندانہ رومانیت کی جھلک نظر آتی ہے، جو قاری کو اپنی گرفت میں لیتی ہے۔ ان کا کلام نہ صرف روایتی غزل کی موسیقیت اور لطافت کو برقرار رکھتا ہے بلکہ اس میں ایسی جدت اور فکری توانائی بھی شامل ہے جو ان کی شاعری کو معاصر عہد میں منفرد شناخت بخشتی ہے۔

14 ستمبر 1926 کو نظر گنج، الہ آباد میں پیدا ہونے والے قیصر الجعفری نے اپنی شاعری سے نہ صرف ادبی حلقوں کو مسحور کیا بلکہ عام قارئین کے دلوں کو بھی مسخر کیا۔ ان کی غزل رومان کی لطافت، سماجی شعور کی آنچ، فلسفیانہ فکر کی گہرائی اور عرفانی بصیرت کا حسین امتزاج ہے۔ ان کے شعری مجموعے 'رنگِ حنا'، 'سنگ آشنا'، 'دشت بے تمنا'، 'اگر دریا ملا ہوتا'، 'نبوت کے چراغ' اور 'چراغِ حرا' اردو شاعری کی روایت کو تقویت بخشتے ہیں۔

اردو کے علاوہ ہندی زبان میں بھی انھوں نے اپنے تخلیقی جوہر کا مظاہرہ کیا، اور 'پتھر ہوا میں پھینکے' اور 'تازہ تازہ' دو مجموعے شائع ہوئے۔ کچھ عرصہ قبل ریختہ فاؤنڈیشن سے ان کی 150 منتخب غزلوں پر مشتمل ایک خوبصورت انتخاب 'تمھارے شہر کا موسم بڑا سہانا لگے' کے عنوان سے منظرِ عام پر آیا، جس نے ان کی شاعری کے نئے قارئین پیدا کیے۔

2023 میں 'قیصر الجعفری فاؤنڈیشن' کے زیرِ اہتمام جناب عرفان جعفری نے 'کلیات قیصر الجعفری' بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کی، جو ان کے شعری سرمائے کا نہایت قیمتی اور مکمل مجموعہ ہے۔ راقم الحروف کو بھی یہ کلیات، دستخط شدہ نسخے کی صورت میں بطورِ ہدیہ موصول ہوئی، جو راقم کے لیے ایک یادگار ادبی تحفہ ہے۔

اس مختصر تمہید و تعارف کے بعد، قیصر الجعفری کی غزلوں کی تفہیم و تعبیر کا سلسلہ ان کے اس دلآویز شعر سے آگے بڑھاتے ہیں۔

حرف بہار لکھ کر، پیشانیِ سحر پر
ہم لوگ جا رہے ہیں، اک دوسرے سفر پر

قیصر الجعفری کی شاعری موضوعاتی تنوع اور اسلوبیاتی ندرت کا ایک درخشاں نمونہ ہے۔ انھوں نے غزل کے دامن میں رومانیت کے لطیف رنگ، سماجی شعور کی آنچ، اور عرفانی و فلسفیانہ افکار کی ژرف نگاہی کو یکجا کر کے ایک ایسی شعری کائنات خلق کی جو بیک وقت کلاسیکی وقار اور عصری شعور کی حامل ہے۔ رومانیت اور عشقیہ واردات ان کی غزلوں کا بنیادی سنگھار ہیں۔ وہ محبت کے جذبے کو انتہائی نزاکت اور شائستگی سے باندھتے ہیں۔ ان کی معروف غزل کا یہ مطلع۔

تمہارے شہر کا موسم بڑا سہانا لگے
میں ایک شام چرا لوں اگر برا نہ لگے

محبت کے جذبات سے مملو ہے۔ مکمل غزل موضوعاتی تنوع اور رومانوی کیفیت کے امتزاج سے مزین ہے، لیکن اس کا مرکزی دھارا محبت اور اس کی جزئیات کے گرد گھومتا ہے۔ 'ایک شام چرا لوں' میں محبوب کی قربت کی آرزو ہے، اور 'اگر برا نہ لگے' کے اضافہ و خدشہ سے یہ آرزو ایک موقر اور باادب اظہار میں ڈھل جاتی ہے۔ یہ جذبہ اردو غزل میں متعدد بار مختلف صورتوں میں برتا جا چکا ہے لیکن قیصر الجعفری کے تخلیقی بیانیے نے یہاں جدت پیدا کر دی ہے۔ اسی غزل کا دوسرا شعر۔

تمھارے بس میں اگر ہو تو بھول جاؤ مجھے
تمھیں بھلانے میں شاید مجھے زمانہ لگے

محبت کی شدت، بے بسی اور یک طرفہ پن کو نہایت سلیقے سے بیان کرتا ہے۔ 'زمانہ لگے' محض ایک محاورہ نہیں، بلکہ محبوب کے نقش کو دل سے نہ مٹا سکنے کا مایوسانہ اعتراف ہے۔ ایک اور شعر۔

جو ڈوبنا ہے تو اتنے سکون سے ڈوبو
کہ آس پاس کی لہروں کو بھی پتا نہ لگے

اپنی علامتی معنویت میں فلسفیانہ گہرائی رکھتا ہے۔ یہاں ڈوبنا کسی جذباتی یا روحانی کیفیت کا استعارہ ہے، جسے شاعر خاموشی اور وقار کے ساتھ ضبط کا مشورہ دیتا ہے، گویا دکھ کا شکوہ بھی محض دل تک محدود رہے۔ یہاں

ایک داخلی تجربے کی لطافت ہے، مگر 'لہروں کو پتا نہ لگے' جیسا اختتام اس شدت کو مزید جلا بخشتا ہے۔ اسی تسلسل میں۔

وہ پھول جو مرے دامن سے ہو گئے منسوب
خدا کرے انھیں بازار کی ہوا نہ لگے

محبت اور رشتوں کی حفاظت کی دعا ہے۔ بظاہر 'پھول' محبوب کا استعارہ ہے لیکن شاعر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس مقام پر اولاد اور ان کے ساتھ وابستہ تمام تر نرم احساسات کو استعارتاً برتا ہے، جب کہ 'بازار کی ہوا' دنیاوی آلودگی اور بے قدری کی علامت ہے۔ کچھ اشعار میں قیصر الجعفری نے بے وفائی کے موضوع کو دلچسپ موڑ دینے کی کوشش کی ہے مثلاً۔

نہ جانے کیا ہے کسی کی اداس آنکھوں میں
وہ منہ چھپا کے بھی جائے تو بے وفا نہ لگے

محبت میں اعتماد اور محبوب کے خلوص پر غیر مشروط یقین کا بیان ہے، چاہے وہ رخصت ہی کیوں نہ ہو جائے۔ جب کہ اسی تسلسل میں ان کا کہنا کہ۔

تو اس طرح سے مرے ساتھ بے وفائی کر
کہ تیرے بعد مجھے کوئی بے وفا نہ لگے

یہ شعر محبوب کی بے وفائی کو بھی ایک منفرد انداز سے پیش کرتا ہے۔ یہ خیال نیا ضرور ہے، مگر اس میں جذباتی مبالغہ زیادہ نمایاں ہے۔ اور آخر میں، مقطع۔

تم آنکھ موند کے پی جاؤ زندگی، قیصر
کہ ایک گھونٹ میں ممکن ہے بدمزہ نہ لگے

زندگی کو ایک گھونٹ میں پینے کی تمثیل بہت ہی معنی خیز ہے۔ یہ شعر زندگی کی تلخیوں کو نظر انداز کر کے اسے قبول کرنے اور کھل کر جینے کا فلسفہ پیش کرتا ہے۔ محبت کی شدت، اس کی نزاکت، زندگی کے عارضی پن اور انسانی جذبات کی گہرائی کو ایک ساتھ سمیٹے ہوئے یہ غزل انفرادیت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ایک مکمل تخلیق ہے۔

مجموعی طور پر یہ غزل زبان کی روانی، نرم آہنگی اور کلاسیکی فضا میں کامیاب ہے، لیکن موضوعات میں تازگی اور فکری طور پر ندرت کم نظر آتی ہے۔ قیصر الجعفری کی قوت ان کی نرمی اور حسنِ بیان میں ہے، مگر یہی قوت اس وقت کمزوری بن جاتی ہے جب وہ روایتی مناظر اور جذبات سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ قیصر الجعفری کی شاعری اس امر کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ غزل محض عشقیہ واردات کا بیان نہیں، بلکہ یہ زندگی کے ہر رنگ، ہر کرب اور ہر امید کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

قیصر الجعفری کی غزل 'دیواروں سے مل کر رونا اچھا لگتا ہے' اپنے موضوع اور جذبات کے اعتبار سے تنہائی، اداسی، محبت، اور وجودی بحران کی عکاسی کرتی ہے۔ شاعر نے اس غزل کو ایک ایسی شاعری کے طور پر ترتیب دیا ہے جو ذاتی غم اور اجتماعی تجربات کو ایک ساتھ جوڑتی ہے۔ ہر شعر میں ایک گہری حسرت، یادوں کا بوجھ، اور ایک ایسی دنیا کی تصویر کشی ہے جہاں انسان تنہائی اور بے بسی سے دوچار ہے۔ غزل کا مطلع ملاحظہ ہو۔

دیواروں سے مل کر رونا اچھا لگتا ہے
ہم بھی پاگل ہو جائیں گے ایسا لگتا ہے

قیصر الجعفری نے اپنی شاعری سے نہ صرف ادبی حلقوں کو مسحور کیا بلکہ عام قارئین کے دلوں کو بھی مسخر کیا۔ ان کی غزل رومان کی لطافت، سماجی شعور کی آنچ، فلسفیانہ فکر کی گہرائی اور عرفانی بصیرت کا حسین امتزاج ہے۔ ان کے شعری مجموعے 'رنگِ حنا'، 'سنگ آشنا'، 'دشت بے تمنا'، 'اگر دریا ملا ہوتا'، 'نبوت کے چراغ' اور 'چراغِ حرا' اردو شاعری کی روایت کو تقویت بخشتے ہیں۔

مطلع ایک رومانی فضا قائم کرنے میں کامیاب ہے، مگر 'اچھا لگتا ہے' اور 'ایسا لگتا ہے' جیسی تکرار فنی طور پر کمزور تاثر پیدا کرتی ہے۔ اسلوب میں دردمندی موجود ہے۔ ہاں مصرعِ ثانی کا بیان نسبتاً سیدھا اور روایتی ہونے کے باوجود مطلع کی شدتِ تاثر میں اضافہ کرتا ہے۔ اسی طرح یہ شعر۔

کتنے دنوں کے پیاسے ہوں گے یارو سوچو تو
شبنم کا قطرہ بھی جن کو دریا لگتا ہے

احساسِ محرومی کو شدت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ یہ شعر علامتی طور پر بہت زیادہ معنویت کا حامل ہے۔ یہ کسی ایسی خواہش کی علامت ہے، جہاں معمولی سی توجہ یا محبت بھی بڑی چیز لگتی ہے۔ یہ شاعر کی نفسیاتی کیفیت اور اس کے اندر کی بے چینی کو عیاں کرتا ہے۔ 'شبنم کا قطرہ' ایک چھوٹی سی چیز ہے، لیکن پیاس کی شدت ایسی ہے کہ اس پہ دریا کا گمان ہوتا ہے۔ 'پیاس' اور 'شبنم کا قطرہ' جیسے استعارے اردو شاعری میں صدیوں سے رائج ہیں۔ شاعر نے اس مقام پر اپنی مہر تو ثبت کی ہے ساتھ ہی کسی شدید پیاسے کے لیے شبنم کو دریا کا متبادل کہنا بالکل نیا تجربہ ہے۔ اسی غزل کے چند اشعار۔

آنکھوں کو بھی لے ڈوبا یہ دل کا پاگل پن
آتے جاتے جو ملتا ہے تم سا لگتا ہے
اس بستی میں کون ہمارے آنسو پونچھے گا
جو ملتا ہے اُس کا دامن بھیگا لگتا ہے
دنیا بھر کی یادیں ہم سے ملنے آتی ہیں
شام ڈھلے اس سونے گھر میں میلہ لگتا ہے

'آتے جاتے جو ملتا ہے تم سا لگتا ہے' اس کی پیشکش میں معنوی تہہ کی بجائے زیادہ تر جذباتی شدت کا سہارا لیا گیا ہے۔ اس مصرعے میں محبوب کا تصور ہر منظر میں بسا دینا بلاشبہ عاشقانہ شدت کو ظاہر کرتا ہے، مگر یہ شدت فنی نکتے سے زیادہ جذباتی تاثر پر قائم ہے۔

'دامن بھیگا لگتا ہے' اس غزل کا ایسا شعر ہے جو غم کے عمومی اور اجتماعی مظہر کو خوبصورت انداز میں باندھتا ہے، لیکن اس میں بھی اسلوبیاتی جدت کے بجائے روایتی غم انگیزی کا سہارا زیادہ ہے۔

''شام ڈھلے اس سونے گھر میں میلہ لگتا ہے'' بلاشبہ ایک تضاد آمیز حسن رکھتا ہے، یہ تضاد بیانیہ کی سطح پر تو اثر انگیز ہے ہی فکری طور پر بھی بہت معنی خیز ہے۔ ویرانی میں میلے کا تاثر، محفل میں تنہائی، کے تضاد کا اثر پیدا کرتا ہے۔

کس کو پتھر ماروں قیصر کون پرایا ہے
شیش محل میں اک اک چہرا اپنا لگتا ہے

یہ غزل کا سب سے مضبوط اور فکری طور پر پُر اثر شعر ہے۔ یہاں شاعر کی درویشانہ بے نیازی اور انسان دوستی اپنے عروج پر ہے۔ 'شیش محل' کا استعارہ اگرچہ پرانا ہے، مگر شاعر نے اسے ذاتی تجربے کے ساتھ جوڑ کر معنویت دینے کی کوشش کی ہے جو قابلِ قدر ہے اور لائق تحسین بھی۔ مجموعی طور پر یہ غزل سادہ بیان، خلوصِ احساس، اور براہِ راست جذبات کے باعث قاری کو متاثر کرتی ہے، لیکن فنی نقطۂ نظر سے اس میں کچھ مقامات پر تکرارِ مضامین، روایتی استعاروں کا استعمال اور معنوی گہرائی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس کی اصل طاقت شاعر کی داخلی کیفیات اور کرب کی ایماندارانہ

پیشکش ہے، جو قاری کو ایک انسانی سطح پر متاثر کرتی ہے، چاہے وہ اس کی فنی باریکیوں سے متفق ہو یا نہ ہو۔ مجموعی طور پر یہ غزل جذباتی اثر رکھتی ہے۔

قیصر الجعفری کی شاعری محض ذاتی جذبات کے محدود دائرے میں مقید نہیں بلکہ اپنے دامن میں سماجی و ثقافتی حیات کے گوناگوں رنگ سمیٹے ہوئے ہے۔ مفلسی کی کرب انگیز تصویر کشی ہو، ہجرت کے زخموں کی گونج ہو، یا انسانی رشتوں کی پیچیدہ کیفیات، ان کے اشعار میں یہ تمام پہلو ایک لطیف اور شائستہ پیرائے میں جلوہ گر ہیں۔ مثال کے طور پر،

گھر لوٹ کے روئیں گے ماں باپ اکیلے میں
مٹی کے کھلونے بھی سستے نہ تھے میلے میں

یہ محض ایک منظر کشی نہیں بلکہ معاشرتی ناہمواریوں اور محرومیوں کی دلخراش علامت ہے۔ غریب والدین کی وہ بے بسی، جو اپنے بچوں کے لیے معمولی خوشیاں بھی خریدنے سے قاصر ہوں، اس شعر میں گویا مجسم ہو جاتی ہے۔ یہاں شاعر نے براہِ راست احتجاج کے بجائے ایک سادہ منظر کے ذریعے سماجی ناانصافی کو قاری کے دل میں اتار دیا ہے۔

اسی طرح ہجرت کا کرب اور اجنبیت کا زہر، جسے مکمل طور پر بیان کر پانا ناممکنات میں سے ہے، قیصر الجعفری کے اشعار میں مختصر مگر بھرپور صورت اختیار کرتا ہے،

گھر بسا کر بھی مسافر کے مسافر ٹھہرے
لوگ دروازوں سے نکلے کہ مہاجر ٹھہرے

یہاں ہجرت کو صرف مکانی تبدیلی نہیں بلکہ شناخت کے بحران کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ایک ایسا تجربہ جس میں گھر کی چار دیواری وجود رکھتی ہے مگر اس کے اندر سکونت کا احساس غائب ہے۔ اس شعر میں ہجرت کے درد اور شناخت کے بحران کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک شخص جو مجبوری میں اپنا وطن ترک کر کے دوسرے شہر میں سکونت اختیار کرتا ہے لیکن برسوں گزارنے کے باوجود وہ دوسرا شہر اسے اجنبی ہی محسوس ہوتا ہے۔ اسے دوسرے شہر سے اپنائیت کا احساس نہیں ہوتا۔ کسی مقام پر محض گھر بنا لینا ہی کافی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس مقام سے جذباتی وابستگی بھی لازم ہے۔ اس حقیقت کو شاعر نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

قیصر الجعفری کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تلخ سماجی حقائق، ہجرت کے زخم اور وقت کی بے رحمی کو نعرہ بازی یا خطابت کے شور میں نہیں ڈبوتے، بلکہ ایک شائستہ، تہذیبی اور رمز آفریں لہجے میں پیش کرتے ہیں،

یہ وقت بند دریچوں پہ لکھ گیا قیصر
میں جا رہا ہوں مرا انتظار مت کرنا

یہاں 'بند دریچے' محض ایک مادی شے نہیں بلکہ امید کے دروازوں، انسانی روابط، اور وقت کے ساتھ ٹوٹتے تعلقات کی علامت ہیں۔ موضوعاتی اعتبار سے ان کا کلام ایک وسیع اور متنوع منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ رومانیت، سماجی شعور، عرفانی فکر، ہجرت کا کرب، وقت کی عارضیت کو نہایت سلیقے سے نرم لہجے میں عصری حسیت کے ساتھ پیش کرنا ان ہی کا خاصہ ہے۔ ان کا اسلوب نرم رو، سادہ مگر معنی خیز، اور علامتی سطح پر گہرا ہے۔

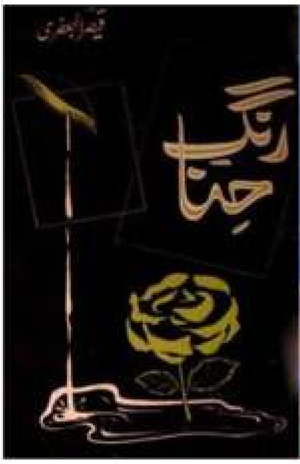

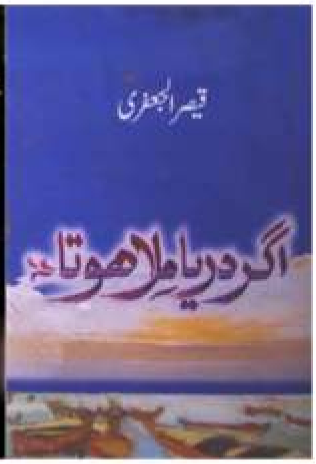

قیصر الجعفری کا فن نہ صرف اردو غزل کی کلاسیکی روایت کو برقرار رکھتا ہے بلکہ اسے عصری مسائل سے بھی ہم آہنگ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اردو ادب میں ایک زندہ اور تابندہ حوالہ ہیں۔ ان کی غزلیہ شاعری، اردو ادب کی روایتی جمالیات اور جدید فکری جہات کے ایک دلنشین امتزاج کا حسین نمونہ ہے۔ ان کا اسلوب نہ صرف زبان و بیان کی نزاکتوں سے آشنا ہے بلکہ معنوی تہہ داری اور جذبے کی گہرائی میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔

ان کے ہاں زبان کی ساخت کلاسیکی اردو کی خوشبو لیے ہوئے ہے، مگر الفاظ کے انتخاب اور تراکیب میں ایک شعوری تازگی جھلکتی ہے۔ وہ محاورات کو محض روایتی معنوں میں نہیں برتتے بلکہ انھیں نئے سیاق میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں، جس سے ان کی غزل روایتی ڈگر پر چلتے ہوئے بھی قاری کے ذوق سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

قیصر الجعفری کی غزل کا سب سے نمایاں پہلو اس کا آہنگ ہے۔ مصرعوں میں صوتی توازن، ردیف و قافیے کی موزونیت اور بحر کی روانی ایسی ہے کہ قاری کو سماعتی لذت کے ساتھ ساتھ فکری ارتعاش بھی ملتا ہے۔ یہ موسیقیت محض فنی پختگی کا نتیجہ نہیں بلکہ جذبے کی صداقت کا بھی غماز ہے۔ ان کی غزلوں میں بصری اور حسی تصویریں ایک مکمل منظر نامہ تخلیق کرتی ہیں۔ 'رنگِ حنا' اور 'دشت بے تمنا' جیسے مجموعوں میں جگہ جگہ ایسے اشعار ملتے ہیں جو ایک لمحے کو قاری کو روزمرہ کی دنیا سے کاٹ کر ایک ایسی شعری کائنات میں لے جاتے ہیں، جہاں رنگ، خوشبو، لمس اور روشنی سب مل کر معنیاتی سطح پر ابتسام فراہم کرتے ہیں۔ ان کے یہاں محض رومانیت نہیں بلکہ وہ محبت، ہجر، اور حسن کی بات کرتے ہوئے انسانی وجود، وقت کے بہاؤ اور معاشرتی رویوں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ یوں ان کی غزل محض ذاتی جذبات کی ترجمان نہیں بلکہ اجتماعی شعور کی بھی آئینہ دار ہے۔

قیصر الجعفری کی غزلوں میں روایت کی بازیافت قوی طور پر محسوس ہوتی ہے، جس کے باعث جدید غزل کی تجرباتی جسارت ان کے ہاں نسبتاً کم دکھائی دیتی ہے۔ تاہم یہی روایت پرستی ان کی غزل کو ایک کلاسیکی وقار بھی عطا کرتی ہے، جو انھیں محض وقتی رجحانات کے شاعر بننے سے محفوظ رکھتی ہے۔ قیصر الجعفری کی غزلیہ شاعری روایتی جڑوں اور جدید فکری شاخوں کا ایسا متوازن درخت ہے، جس کے سائے میں قاری کو جمالیاتی سرور اور فکری انبساط دونوں میسر آتے ہیں۔ ان کا کلام اردو غزل کی کلاسیکی روایت میں ایک درخشاں اضافہ ہے، اور آنے والے وقتوں میں بھی یہ روشنی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ قاری کے دل و دماغ کو منور کرتی رہے گی۔

■

Mohd Ovais Sambhli
178/157 Barood Khana
Near Lal Masjid, Golaganj,
Lucknow - 226018 (UP)
Mobile : 7905636448
ovais.sambhali@gmail.com

ڈاکٹر بشریٰ رحمٰن کی ادبی خدمات

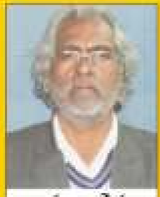

ذاکر حسین ذاکر

ڈاکٹر بشریٰ رحمٰن (1940-2009) شہر گورکھپور کے ایک ایسے روشن خیال اور اعلیٰ تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، جو عالمی شہرت کا حامل ہے۔ ان کے والد عبد القدوس شہر کے مشہور ومعروف حکیم تھے۔ان کے دادا قاضی عبدالباسط جونپور کے قاضی رہے۔ ان کے بڑے بھائی پروفیسر نجات اللہ صدیقی [1931-2022] عالمی شہرت یافتہ ماہر اقتصادیات اورمعروف اسلامی اسکالر تھے۔انھوں نے علی گڑھ سے لے کر امریکہ تک دنیا کی کئی نامور یونیورسٹیوں میں درس وتدریس کا کام انجام دیا ہے۔ انھوں نے 67 کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب 'اسلام میں غیر سودی کاروبار' 3 زبانوں میں 27 بار چھپ چکی ہے اور دنیا کی بیشتر لائبریریوں میں محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ اسلام اور فنون لطیفہ، عصر حاضر میں اسلامی فکر، اسلام کا نظریہ ملکیت اور معاصر اسلامی فکر بے حد اہم اور مقبول عام کتابیں ہیں۔ ان کی کتابوں کا دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے۔ انھیں اسلامی اسٹڈیز کے لیے 1982 میں سعودی حکومت کی جانب سے کنگ فیصل بین الاقوامی انعام سے نوازا گیا تھا۔ بشریٰ کے دوسرے بڑے بھائی حمید اللہ صدیقی لندن کی آکسفورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔اردوادب سے ان کی گہری وابستگی تھی۔ ان کی وفات لندن میں ہی 2009 میں ہوگئی۔ بشریٰ کے سب سے بڑے بھائی حیات اللہ صدیقی ریلوے گورکھپور میں افسر تھے۔ ان کا انتقال کافی پہلے ہوگیا تھا۔ بشریٰ کے بھتیجے ڈاکٹر احمد اللہ صدیقی حیات اللہ صدیقی کے بیٹے ہیں۔ ڈاکٹر احمد اللہ امریکہ کے فلاڈیلفیا کے ٹیمپل یونیورسٹی سے ماس میڈیا اور جرنلزم میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد شکاگو کے ویسٹرن الینوس یونیورسٹی میں ماس میڈیا کے پروفیسر رہے ہیں۔ اسی یونیورسٹی میں وہ ڈین کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ ماس میڈیا کے حلقے میں ان کی مقبولیت پوری دنیا کے لیے مثال ہے۔احمد اللہ صدیقی پوری دنیا میں مسلمانوں کو میڈیا کے منفی اثرات سے آگاہی کے لیے کام کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میڈیا پر پراثر کنٹرول کے بغیر دنیا میں مسلمانوں کی شبیہ کو بہتر نہیں بنایا جا سکتا۔ ڈاکٹر بشریٰ رحمٰن کی ولادت ایسے ہی علمی وادبی خانوادے میں ہوئی۔

بشریٰ کی ولادت 10 جنوری 1940 کو ہوئی۔ بشریٰ کے والد عبدالقدوس کے تین بیٹوں کی ولادت کے 9 سال بعد بشریٰ کی ولادت ہوئی تھی۔ اس لیے بشریٰ کی ولادت کے بعد خاندان میں خوب خوشیاں منائی گئیں۔ ان کی پرورش بڑے لاڈ پیار سے کی گئی۔ بشریٰ کا پورا نام بشریٰ خاتون صدیقی رکھا گیا تھا۔ میجر صدیق الرحمٰن 1936-2023 سے شادی کے بعد ان کا نام بشریٰ رحمٰن پڑ گیا، جو ان کی ادبی شناخت کا باعث بنا۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر والدہ کی نگرانی میں مکمل ہوئی۔ ان کے استاد مولوی خلیل تھے، جو گھر پر انھیں پڑھانے آتے تھے۔ بشریٰ نے ابتدائی تعلیم اسکول جا کر حاصل نہیں کی۔ اس کی وجہ اس وقت کا ماحول رہا ہوگا، جہاں لڑکیوں کو اسکول بھیجنے کا رواج عام نہیں تھا۔ تمام طرح کی بندشیں لڑکیوں کی راہ میں حائل تھیں۔ لیکن بشریٰ کی ذہانت نے انھیں اعلیٰ تعلیم کے در پر پہنچادیا اور انھوں نے ایک مشہور ومعروف مصنفہ بن کر گورکھپور کا نام روشن کیا۔ بشریٰ کے خاندان میں علم وادب کا چرچا اتنا عام تھا کہ ان کے لیے علم وادب سے محبت اور فریفتگی عام بات تھی۔ ان کے گھر میں کتابیں اوڑھنا بچھونا تھیں۔ ایسے علمی ماحول میں ڈاکٹر بشریٰ رحمٰن نے خوب استفادہ کیا۔

بشریٰ نے اپنے بھائی پروفیسر نجات اللہ صدیقی کی نگرانی میں علی گڑھ سے 1956 میں ہائی اسکول پاس کیا۔ اس وقت پروفیسر نجات اللہ علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے۔ 1960 میں 20 سال کی عمر میں بشریٰ کی شادی میجر صدیق الرحمٰن سے کردی گئی۔ صدیق الرحمٰن بھی علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے۔ بچپن میں ہی دونوں کی نسبت طے ہوگئی تھی۔ دونوں خاندانوں میں پہلے سے ہی رشتہ داری تھی۔ شادی ہوجانے کے بعد بشریٰ کی تعلیمی سرگرمیوں میں رکاوٹ پیدا ہوگئی۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد بشریٰ نے پھر اپنی تعلیم شروع کی۔ انھوں نے 1968 میں علی گڑھ سے اردو میں بی اے آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ اس وقت تک بشریٰ کی عمر 28 سال ہوچکی تھی۔ بی اے کرنے کے بعد بشریٰ اپنے خانگی مسائل میں الجھی رہیں۔ لیکن اس دوران انھوں نے اپنے لکھنے پڑھنے کے عمل کو تعطل کا شکار نہیں ہونے دیا۔ ڈاکٹر بشریٰ رحمٰن کی شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر افغان اللہ خان کہتے ہیں: ''ڈاکٹر بشریٰ رحمٰن ایک سنجیدہ، باشعور اور باصلاحیت خاتون ہیں۔ ابتدا ہی سے انھیں لکھنے پڑھنے کا شوق رہا ہے شروع میں ان کے مضامین الحسنات، فردوس اور نگار میں شائع ہوتے رہے، جیوں جیوں شعور میں پختگی آتی گئی ان کے پڑھنے لکھنے کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور ان کے مضامین ہندوستان کے معتبر جرائد 'آجکل'، 'نیا دور' وغیرہ میں شائع ہوتے رہے یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ہمیشہ پڑھنے لکھنے سے دلچسپی زیادہ اور پڑھانے سے کم رہی۔''[1]

ڈاکٹر بشریٰ کی لگن، محنت اور علم وادب سے ان کی رغبت نے ان کے شوہر میجر صدیق الرحمٰن کو مجبور کیا کہ وہ انھیں ایم اے کرنے کی اجازت دیں۔ انھوں نے بشریٰ رحمٰن کا داخلہ گورکھپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں کرایا۔ بشریٰ نے 1980 میں اردو سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ایم اے کرنے کے بعد بشریٰ نے پی ایچ ڈی کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ پروفیسر محمود الٰہی نے انھیں پی ایچ ڈی میں داخلہ دے دیا۔ استاد معظم بشریٰ کی لگن اور محنت سے بے حد متاثر تھے۔ انھوں ان کے مقالے کا عنوان 'اردو کے غیر مذہبی سفرنامے' طے کیا۔

اردو کے غیر مذہبی سفرناموں پر کام کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ لیکن بشریٰ نے اس کام کو بہت عرق ریزی سے کیا۔ اس کتاب کی فہرست دیکھنے کے بعد خود بخود اس کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ چالیس سال کی ایک شادی شدہ عورت کے لیے اتنی سخت محنت کرکے اس عنوان پر کام کرنا کتنا مشکل رہا ہوگا۔ اس کا اندازہ بشریٰ کے کام کی نوعیت کو دیکھ کر لگایا جاسکتا ہے۔ اس مشکل کام کو بھی بشریٰ نے اتنی خوبصورتی سے کیا ہے کہ اس میں جان پڑگئی ہے۔ انھوں نے اردو کے تمام غیر مذہبی سفرناموں کا بہترین مطالعہ کرکے بہت ہی جامع نتائج اخذ کیے ہیں۔ بشریٰ کو 1986 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔ ڈاکٹر بشریٰ رحمٰن نے اس موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھنے کے لیے پروفیسر محمود الٰہی کے فیصلے کا خیر مقدم کیا۔ مواد کی فراہمی کے لیے انھیں مختلف شہروں اور لائبریریوں کا دورہ کرنا پڑا۔ ایک خاتون کے لیے سفر کتنا جوکھم بھرا ہوتا ہے اس کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔ وہ کہتی ہیں: ''مجھے سفر سے بڑی دلچسپی ہے اور خوش قسمتی سے مجھے ریسرچ کے لیے صدر شعبہ اردو پروفیسر محمود الٰہی صاحب نے جو مقالے کے لیے موضوع دیا وہ 'اردو کے غیر مذہبی سفرنامے' تھا۔ اس عنوان کے پانے کے بعد خوشی تو بہت ہوئی لیکن ایک خاتون کے لیے ان سخت اور ناہموار راستوں پر چل کر جوئے شیر نکالنا کتنا مشکل ہوگا۔ اس کا مجھے بعد میں اندازہ ہوا۔ اگر پروفیسر محمود الٰہی صاحب نے ہر قدم پر میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی نہ کی ہوتی تو شاید یہ مقالہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچتا۔''2

اردو ادب اور تحقیق کے شعبہ میں بشریٰ کے علمی کارناموں کا مقام اور ان کے ادبی مرتبہ کا تعین ابھی باقی ہے۔ ان کی علمی اور ادبی خدمات کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی تک ان کی تخلیقات کا محاسبہ نہیں ہوسکا ہے۔ انھوں نے پانچ کتابیں تصنیف کی ہیں اور ان پانچوں کا عنوان ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ بشریٰ نے ایک تھیسس لکھا اور اپنی زندگی کے سارے عمل کو اس کے اردگرد لپیٹ دیا۔ بلکہ ان کی تھیسس کا موضوع بالکل مختلف تھا اور ان کی دیگر تخلیقات کا موضوع بالکل ہی مختلف ہے۔ یقیناً بشریٰ کی ادبی تخلیقات میں سب سے کامیاب تخلیق 'اردو کے غیر مذہبی سفرنامے' ہے۔ یہ ان کی پہلی کتاب تھی، لیکن اس سے قبل ان کی تخلیقات مختلف رسائل کی زینت بنتے رہے۔ اردو کے غیر مذہبی سفرنامے کی اشاعت 1999 میں ہوئی۔ اردو کے سفرناموں پر ان کا تحقیقی مقالہ اردو ادب میں یقیناً اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے پیش لفظ میں پروفیسر نجات اللہ صدیقی لکھتے ہیں: ''جب میں نے اپنی پہلی تحریر چھپوائی تھی تو میری بہن کی عمر دس سال تھی۔ جب وہ اپنی پہلی تصنیف پر مجھ سے پیش لفظ لکھوا رہی ہے تو میری عمر ستھ سال کی ہے۔ پڑھنے والے کو یہ انکشاف ادھورا معلوم ہوا اور اگر کوئی باعث ہے تو وہ سمجھ میں نہیں آیا۔ زندگی کے سفر کا بھی یہی حال ہے مسافر کا سفر جاری رہتا ہے پر ادھوری بات پوری نہیں ہو پاتی۔ سفر کے بہت سے محرک ہوں گے۔ میں زندگی کے غیر اختیاری سفر کی نہیں، خود اپنے اختیار وارادہ سے کیے گئے سفر کی بات کر رہا ہوں۔ ایسے سفر کے محرکات میں سے ایک شاید اس تشنگی کو دور کرنا بھی ہے، جو سفر زندگی نے پیدا کی ہے۔ کوئی جستجو ہے جو ابن بطوطہ اور ہیونگ سانگ ہی کو نہیں بہت سے دوسرے اصحاب سفر کو اٹھا کھڑا کرتی ہے۔ نہ میں نے سفرنامہ لکھا ہے نہ، 'غالباً' اس پیش لفظ کے پڑھنے والے نے۔ ہم نے لوگ تب سفر کرتے ہیں جب کوئی کام آپڑتا ہے۔ سفرنامہ لکھنے والوں کی بات دوسری ہے۔ یہ 'دوسری بات' کیا ہے؟ اس کا تھوڑا جواب آپ کو بشریٰ کی اس کتاب میں ملے گا۔''3

ڈاکٹر بشریٰ رحمٰن نے اپنی بلیغ تحقیق کو 10 ابواب میں منقسم کرکے سفرناموں کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ اس کے اہم موضوعات میں سفرنامے کا مفہوم، مغرب اور مشرق میں سفرنامے کی روایت، اردو سفرنامے کی تاریخ، اردو میں مترجم سفرنامے کے علاوہ ایک باب میں انھوں نے ابتدا سے 1900 تک کے سفرناموں کا جائزہ لیا ہے۔ ایک الگ باب میں انھوں نے 1901 سے 1947 تک کے سفرناموں کا جائزہ لیا ہے۔ 1947 کے بعد کے سفرناموں کا جائزہ بہت اہم باب ہے۔ وہ اعتراف کرتی ہیں کہ اردو میں 1947 کے بعد بہت اہم سفرنامے لکھے گئے۔ انھوں نے مزاحیہ اور خطوط کی شکل میں لکھے گئے سفرناموں کا بھی جائزہ لیا ہے اور سفرناموں کے مستقبل کا بھی تعین کیا ہے۔ اس تحقیق کی تکمیل کے لیے بشریٰ نے ساڑھے تین سو کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے 1947 کے بعد لکھے گئے سفرناموں کے ادبی مرتبہ کا تعین کرتے ہوئے کہا ہے: ''1947 کے بعد سفرناموں میں جو ترقی ہوئی اس نے ادب کی نئی صنف اختیار کرلی۔ ان دس سالوں میں سفرناموں میں انقلاب آگیا۔ مستنصر حسین تارڑ نے جب اس میدان میں قدم رکھا تو اس میں ایک نئی روح پھونک دی۔ محمود نظامی، اختر ریاض الدین کا بولا بالا اور اس دور کے سفرنامہ نگاروں نے ستاروں سے آگے راستے نکالنے کی کوشش کی ہی ان سفرناموں میں ماضی اور ماضی کی تاریخ ایک زندہ کردار کی حیثیت رکھتی ہے جگہ جگہ حال کو ماضی کی تاریخ کی مدد سے تابناک بنایا گیا ہے۔ ان سفرناموں میں داخلی ضروریات موجود ہیں۔ ان کی خوشبو کی مہک اور چمک دمک آنکھوں کو خیرہ ہی نہیں کرتیں بلکہ دل ودماغ کو سکون اور آسودگی بخشتی ہیں۔4

اردو میں غیر مذہبی سفرنامے کی اشاعت کے بعد بھی بشریٰ مستقل پڑھنے لکھنے کے عمل میں مصروف رہیں۔ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت، سیاست اور صحافتی خدمات کا کثیر جہاتی مطالعہ کیا۔ بشریٰ نے اس کتاب کو بہت جانفشانی سے تیار کیا ہے۔ اس کتاب کو سات حصوں میں منقسم کرکے مولانا کے فن اور شخصیت پر جامع مقالہ لکھا ہے۔ یہ کتاب 2005 میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر بشریٰ نے اس کتاب کو الہلال کی روشنی میں مرتب کیا ہے۔ بشریٰ نے الہلال کا وسیع پیمانے پر مطالعہ کیا ہے۔ اس میں ایک اہم باب اس زمانے کے ہندوستان کے حالات کے متعلق شامل کیا گیا ہے۔ جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے لے کر برٹش حکومت کے تسلط کی پوری داستان بیان کی گئی ہے۔ اسی طرح مولانا آزاد کی زندگی کے مختصر حالات اور 'الہلال' 'البلاغ' کے پس منظر پر بھی ایک باب خرچ کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں مولانا کی جامع مسجد میں اکتوبر 1947 کی تاریخی تقریر بھی آخر میں دی گئی ہے۔ الہلال کے متعلق بشریٰ رقم طراز ہیں: ''الہلال کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ اس میں ادبی مطبوعات سیاسی وسماجی حالات، مذہبی وشخصی معاملات، ملک اور قوموں کے حالات، شاہ وفقرا کے تذکرات، سیاہ وسفید کے حالات، حسن وعشق کی کہانیاں، جنگ وجدل کے تاثرات گویا ہر طرح کی کتابیں ملکوں، قوموں اور بڑی بڑی شخصیتوں کے کارناموں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اس سے آپ مختلف فکر ونظر کا اندازہ کرسکتے ہیں اور آپ یہ بھی اندازہ لگاسکتے ہیں کہ مولانا کو الہلال کی اشاعت میں کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔''5

■

Dr. Zakir Husain Zakir
Gulshan Hyder, Shanti Nagar
Near Sant Pushpa School
Deoria- 274001 (UP)
Mob.:9415276138
zakirhssn8@gmail.com

عبدالحافظ فاروقی

بالی وڈ اور اردو

زبان، ثقافت اور شناخت کا امتزاج

اردو زبان کی تاریخ محض ادبی ارتقا کی کہانی نہیں بلکہ مختلف تہذیبی اثرات کا حسین امتزاج ہے۔ اس کی بنیاد میں ہندی کی مٹھاس، فارسی کی نزاکت، ترکی کی روانی اور عربی کی گہرائی شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو برصغیر کی مشترکہ ثقافتی شناخت کی سب سے روشن علامت بن کر ابھری۔ اگر کہا جائے کہ اردو ایک جذبہ ہے، ایک خوشبو ہے جو صدیوں سے اس خطۂ دلنواز میں مہک رہی ہے تو یہ بالکل درست ہوگا۔ برصغیر کی محبت، اس کی نفرتیں، اس کے خواب اور اس کی داستانیں سب اردو ہی کے دامن میں سمٹی ہوئی ہیں، اور یہی ان کو ایک نرالی چاشنی عطا کرتی ہے۔

اردو کا حسن صرف اس کی شعری روایت میں نہیں بلکہ اس کی روزمرہ گفتگو میں بھی جھلکتا ہے۔ یہ زبان انسان کے دل کی دھڑکنوں کو بھی لفظوں میں ڈھال لیتی ہے اور معاشرتی رشتوں کی نزاکت کو بھی شائستگی کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ غالب اور میر کی غزلوں سے لے کر اقبال کے انقلابی اشعار تک، اور پھر فراق و جوش کے جدید اسلوب تک، اردو نے ہر دور میں انسان کے جذبات کو ایک نئی صورت عطا کی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو نے نہ صرف ادب کو زندہ رکھا بلکہ عام زندگی اور تہذیب کو بھی اپنی آغوش میں پروان چڑھایا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں جب ہندوستانی سنیما نے پہلی بار سانس لی تو مکالمے، گیت اور بیانیے کے لیے سب سے موزوں اور شیریں زبان اردو ہی ٹھہری۔ اردو کی نغمگی اور آہنگ نے پردۂ سیمیں کو وہ جادو بخشا جس نے لاکھوں دلوں کو مسحور کر دیا۔ 'مغلِ اعظم' کے مکالمے، 'پاکیزہ' کے نغمے، 'دیوار' کے جذباتی جملے اور 'آنندی' جیسے فلموں کے گیت سب اردو کی تہذیبی اور جمالیاتی وراثت کے گواہ ہیں۔ فلمی دنیا میں ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، مجروح سلطان پوری اور گلزار جیسے شعرا نے اردو کو صرف مکالموں اور نغموں تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کو عام انسان کی زندگی، اس کے دکھ سکھ اور خوابوں کا ترجمان بنا دیا۔

بمبئی فلم انڈسٹری، جسے آج ہم بالی وڈ کے نام سے جانتے ہیں، اور اردو کے درمیان ایسا گہرا رشتہ قائم ہوا کہ بعض اوقات یہ فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کہاں زبان ختم ہوتی ہے اور کہاں فلم کا جادو شروع ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو نے بالی وڈ کو زبان دی اور بالی وڈ نے اردو کو ایک نئی شناخت، ایک نیا افق عطا کیا۔ سنیما نے اردو کو عام لوگوں کے گھروں تک پہنچا دیا، اور یوں یہ زبان صرف خواص کی مجلسوں تک محدود نہ رہی بلکہ عوام کی دل کی دھڑکن بن گئی۔

آج جب ہم اردو اور بالی وڈ کے رشتے پر نگاہ ڈالتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ محض ایک لسانی یا فلمی تعلق نہیں بلکہ ایک تہذیبی رشتہ ہے، ایک ایسا رشتہ جس نے نسل در نسل لوگوں کے جذبات کو آواز دی ہے۔ اردو کی نرمی اور بالی وڈ کی مقبولیت نے مل کر ایک ایسا ورثہ تخلیق کیا ہے جس پر برصغیر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

تاریخی پس منظر

اردو اور سنیما کا باہمی رشتہ محض ایک حادثہ نہیں بلکہ برصغیر کی تہذیبی، لسانی اور ادبی تاریخ کا ایک لازمی تسلسل ہے۔ انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز میں جب برصغیر میں تھیٹر اور اسٹیج ڈراما اپنی مقبولیت کے عروج پر تھا، اسی وقت اردو زبان دہلی اور لکھنؤ کی ادبی، شعری اور ثقافتی فضاؤں میں مرکزیت اختیار کر چکی تھی۔ اس دور میں مشاعروں کی محفلیں، داستان گوئی کی روایت، ڈراما نگاری اور فکشن نے اردو کو محض ایک زبان نہیں بلکہ تہذیبی اظہار کا سب سے مؤثر وسیلہ بنا دیا تھا۔ عوامی زندگی سے لے کر شاہی درباروں تک، علمی مباحث سے لے کر روزمرہ بول چال تک، اردو نے ایک ایسے لسانی پُل کا کردار ادا کیا جو مختلف طبقات کو یکجا کرتا تھا۔

اسٹیج پر پیش کیے جانے والے ڈراموں کے مکالمے، طرزِ بیان کی برجستگی، نغموں کی مٹھاس اور قصوں کی دلکشی نے برصغیر کے تماش بینوں کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا تھا۔ یہی خصوصیات جب فلمی اسکرین پر منتقل ہوئیں تو قدرتی طور پر زبان کے انتخاب کے لیے اردو ہی سب سے زیادہ موزوں اور دلنشیں ثابت ہوئی۔ خاموش فلموں کے بعد جب ناطق فلموں کا دور شروع ہوا تو یہ فیصلہ ناگزیر تھا کہ وہی زبان منتخب کی جائے جو ایک طرف عوام کے دلوں کو چھو سکے اور دوسری طرف اپنی ادبی اور شعری شان کے ذریعے جذبات کو بلند تر سطح پر پہنچا سکے۔ ان تمام اوصاف کی جامعیت صرف اردو کو حاصل تھی۔

1931 میں جب ہندوستان کی پہلی ناطق فلم 'عالم آرا' ریلیز ہوئی تو اس کے مکالمے اور نغمے خالص اردو میں تھے۔ فلم کی غیر معمولی کامیابی نے یہ بات حتمی طور پر ثابت کر دی کہ سنیما میں جذباتی اور فکری اظہار کے لیے سب سے مؤثر زبان اردو ہی ہے۔ یہ محض ایک زبان کا انتخاب نہیں تھا بلکہ صدیوں پر محیط ایک تہذیبی و

ادبی روایت کی نئی صورت میں توسیع تھی، جس نے برصغیر کی فلمی صنعت کو ایک پختہ لسانی بنیاد فراہم کردی۔

اس کے بعد بننے والی مشہور فلمیں جیسے 'شیریں فرہاد'، 'پکار' اور 'نور جہاں' اس حقیقت کی مزید تصدیق بنیں۔ ان فلموں کے مکالمے اور نغمے نہ صرف ادبی شان اور فصاحت کے حامل تھے بلکہ ان میں وہی تغزل، وہی شیرینی اور وہی جذباتی گہرائی جھلکتی تھی جو اردو شاعری اور نثر کی اصل پہچان تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان فلموں کے جملے اور گانے محض اسکرین تک محدود نہ رہے بلکہ عوام کی روزمرہ گفتگو اور یادداشت کا حصہ بن گئے۔

آنے والے برسوں میں فلمی کہانیوں میں جو موضوعات شامل کیے گئے وہ براہ راست اردو ادب اور کلاسیکی شاعری کے سرمائے سے ماخوذ تھے۔ عشق و محبت، ایثار و قربانی، عزت و غیرت، خاندانی روایت، وطن پرستی اور روحانی وابستگی جیسے موضوعات دراصل وہی عناصر تھے جو صدیوں سے اردو شاعری اور نثر کا حصہ چلے آرہے تھے۔

یوں اردو نے فلمی کہانیوں کو محض ایک بیانیہ نہ رہنے دیا بلکہ انھیں ادبی اور تہذیبی سطح پر بلند کردیا۔

رفتہ رفتہ یہ حقیقت واضح ہوتی گئی کہ اردو فلمی دنیا میں محض ایک زبان نہیں بلکہ ایک فکری و جذباتی سرمایہ ہے۔ اس کے ذریعے فلموں نے عوام کی زبان کو نکھارا، ان کے ذوق کو جلا بخشی اور ایک ایسا رشتہ قائم کیا جس میں تفریح، جذبات اور تہذیب سب یکجا ہوگئے۔ اردو کی اسی انفرادیت نے ہندوستانی سینما کو ایک خاص وقار اور سنجیدگی عطا کی اور فلم کو محض تماشے یا وقت گزاری کا ذریعہ رہنے کے بجائے ایک سنجیدہ اور باوقار ثقافتی اظہار میں ڈھال دیا۔

اردو مکالمہ نگاری اور بالی وڈ کی سنہری روایت

مکالمہ نگاری دراصل وہ فن ہے جس کے ذریعے جذبات کو الفاظ کا قالب دیا جاتا ہے۔ ایک اچھا مکالمہ صرف اداکار کی زبان سے ادا نہیں ہوتا بلکہ سننے والے کے دل و دماغ میں اتر کر دیرپا اثر چھوڑتا ہے۔ بالی وڈ کی سنہری تاریخ (1940 تا 1970) میں یہ کمال اردو زبان کو حاصل ہوا کہ اس نے مکالمہ نگاری کو محض فلمی ضرورت کے بجائے ایک باقاعدہ فن کا درجہ دیا۔ اردو مکالمے اپنے محاوراتی حسن، فصاحت و بلاغت، روانی اور آہنگ کے سبب فلمی دنیا میں ایک الگ پہچان بناتے ہیں۔

اس دور کے مکالموں میں تشبیہ و استعارہ، محاورہ اور زبان کی تہذیبی لطافت اس انداز سے استعمال ہوئی کہ وہ صرف ڈائیلاگ نہ رہے بلکہ فنِ ادب اور فنِ خطابت کی روشن مثالیں بن گئے۔ درباری مناظر میں فصیح اور شستہ اردو نے شاہانہ وقار پیدا کیا جب کہ رومانی مناظر میں نرم، مترنم اور دل آویز لب و لہجہ اپنایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مکالمے کانوں سے گزر کر سیدھے دل میں اترنے لگے۔

مثال کے طور پر مغلِ اعظم (1960) کا وہ یادگار لمحہ جب شہزادہ سلیم (دلیپ کمار) انارکلی (مدھوبالہ) سے کہتا ہے:

''پتا کی سرزمین پر محبت کے قدم رکھنے سے پہلے اس کو اجازت لینی پڑتی ہے۔''

یہ جملہ محض ایک مکالمہ نہیں بلکہ تاریخ، وقار اور جذبات تینوں کا حسین امتزاج ہے۔

اسی طرح دیوار (1974) میں امیتابھ بچن کا جذباتی اعلان:

''میرے پاس ماں ہے۔''

یہ تین الفاظ سادہ ہیں مگر اردو کی جذباتی لے اور تہذیبی پس منظر نے انھیں ایسا لازوال بنادیا کہ یہ جملہ بالی وڈ کی تاریخ میں امر ہوگیا۔

امراؤ جان (1981) میں ریکھا کا دل گرفتہ جملہ:

''ہم بھی وہاں موجود تھے جہاں فیصلے ہو رہے تھے، مگر ہم پر کوئی فیصلہ نہ ہوا۔'' یہ مکالمہ غم، رمز اور تہذیبی نزاکت کا ایسا خوبصورت مرقع ہے جو اردو کے بغیر ممکن ہی نہ تھا۔

اگر ہم دیگر فلموں کو دیکھیں تو پاکیزہ (1972) میں گیت اور مکالمے کی زبان اردو ہی تھی جس نے فلم کو کلاسیک کا درجہ بخشا۔ صاحب، بیوی اور غلام (1962) میں مکالموں کی نرمی اور دردمندی نے کہانی کو ایک تہذیبی اور جذباتی رنگ دیا۔ اسی طرح مدر انڈیا (1957) میں مکالموں کی طاقت نے فلم کو محض ایک کہانی کے بجائے ایک قومی و سماجی علامت بنادیا۔

یہ تمام مثالیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اردو زبان نے فلمی دنیا میں محض اظہار کا ذریعہ نہیں دیا بلکہ اسے تہذیبی شناخت، ادبی لطافت اور جذباتی تاثیر سے مالا مال کیا۔ بالی وڈ کی تاریخ میں اردو مکالمہ نگاری دراصل زبان کی اس قوت کا مظہر ہے جو فن کو امر اور جملوں کو تاریخ بنادیتی ہے۔

بالی وُڈ کے نغمے اور اردو شاعری کا تہذیبی تسلسل

بالی وُڈ کے نغمے محض تفریح یا فلمی دنیا کی رونق نہیں بلکہ اردو شاعری کے اس لازوال تسلسل اور تہذیبی جمالیات کی روشن علامت ہیں، جو سلور اسکرین پر بھی اپنی پوری عظمت کے ساتھ جلوہ گر ہوئے۔ یہ نغمے ایک طرف انسانی جذبات کی عکاسی کرتے ہیں اور دوسری جانب سماجی شعور، تہذیبی ورثہ اور اجتماعی فکر کے نمائندہ بھی ہیں۔ فلمی نغمہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ اس میں شامل بڑے شعرا نے اپنی تخلیقی بصیرت اور شعری گہرائی سے ان گیتوں کو محض موسیقی تک محدود نہیں رکھا، بلکہ انھیں احساس، فکر اور روحانیت کی نئی جہتیں عطا کیں۔

ساحر لدھیانوی نے اپنی انقلابی اور بامقصد شاعری کے ذریعے فلمی نغموں کو طبقاتی شعور اور سماجی بیداری کی ایک توانا آواز بنادیا۔ ان کا شہرہ آفاق گیت ''یہ محلوں یہ تختوں یہ تاجوں کی دنیا'' آج بھی ظلم و استحصال کے خلاف مزاحمت اور عدل و انصاف کی جستجو کا استعارہ ہے۔ کیفی اعظمی نے مشرقی حسن کو ترقی پسند فکر کے ساتھ جوڑ کر اردو نغمہ نگاری کو ایک فکری بلندی بخشی۔ ان کا نغمہ 'وقت نے کیا کیا حسین ستم' بظاہر محبت کی ناکامی ہے، لیکن دراصل یہ وقت کی بے رحمی اور اجتماعی المیوں

کی علامت ہے، جہاں وقت کو ایک ایسی طاقت کے طور پر دکھایا گیا ہے جو خوابوں اور محبت کو کچل دیتی ہے۔

گلزار نے اپنی شاعری میں روزمرہ زبان کی سادگی اور فکر کی گہرائی کو اس طرح ہم آہنگ کیا کہ ان کے نغمے ایک طرف سادہ اور دل نشین معلوم ہوتے ہیں تو دوسری طرف سننے والے کو ایک روحانی اور داخلی تجربے سے گزار دیتے ہیں۔ ان کا نغمہ 'تیرے بنا زندگی سے کوئی شکوہ تو نہیں' اردو زبان کی لطافت، مٹھاس اور سوز کی ایک درخشاں مثال ہے، جہاں ہر لفظ جذبے کی مجسم صورت اختیار کر لیتا ہے۔

قمر جلال آبادی نے اپنی سادہ مگر دل کو چھو لینے والی شاعری سے فلمی نغموں کو ایسی نغمگی بخشی جس میں سوز بھی ہے اور روانی بھی۔ ان کا مشہور گیت 'اک دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے، کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا' اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ اردو کے عام اور روزمرہ الفاظ اپنی فطری موسیقیت اور سوز کے ساتھ کس طرح ایک عام خیال کو بھی امر کر سکتے ہیں۔

یوں ساحر کی انقلابی فکر، کیفی کی ترقی پسند نگاہ، گلزار کی لطافت اور قمر جلال آبادی کی سادگی مل کر اردو نغمہ نگاری کو وہ عظمت عطا کرتے ہیں جس نے بالی وڈ کے نغموں کو صرف فلمی دنیا کی دلکشی تک محدود نہ رکھا بلکہ انھیں اردو زبان، تہذیب اور اجتماعی شعور کا دائمی سرمایہ بنا دیا۔

تہذیبی و ثقافتی پس منظر

اردو زبان برصغیر کی سب سے نایاب تہذیبی متاع ہے۔ یہ محض ایک بولی یا ابلاغ کا وسیلہ نہیں بلکہ ایک ایسا زندہ ورثہ ہے جس میں صدیوں کی تاریخ، محبت، رواداری اور ثقافتی رنگ جڑے ہوئے ہیں۔ اردو کی سب سے بڑی طاقت اس کا لہجہ، اس کی شائستگی اور اس کا تہذیبی وقار ہے۔ اس زبان میں محبت کا اظہار محض ایک لفظ نہیں بلکہ ایک رویہ ہے، ایک انداز زندگی ہے۔ اردو کی گفتگو سننے والا فرد محض بات نہیں سنتا بلکہ اس کے پس منظر میں ایک تہذیبی خوشبو کو محسوس کرتا ہے۔

جب فلمی کردار 'جناب'، 'مہربانی'، 'بصد شکریہ' یا 'عرض ہے' جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو وہ محض رسمی جملے نہیں ہوتے، بلکہ اپنے ساتھ ایک تہذیبی فضا، شرافت، وقار اور محبت بھرا رویہ لے کر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے مکالمے اور نغمے جب پردۂ سیمیں پر ابھرتے ہیں تو ناظرین محض فلمی منظر نہیں دیکھتے بلکہ

> ہندوستانی فلموں کی کامیابی میں اردو کا کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ مکالموں کی نرمی، نغموں کی مٹھاس، جذبات کی گہرائی اور شائستگی کی وہ روایت جو اردو کے بغیر ممکن نہیں، بھارتی سینما کو ایک عالمی شناخت عطا کرتی ہے۔

ایک تہذیبی تجربے سے گزرتے ہیں۔

اردو کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ زبان اپنے اندر مشترکہ ہندوستانی ورثے کی جھلک رکھتی ہے۔ اس میں ہندو اور مسلم تہذیب کا حسین امتزاج ہے۔ اردو میں وہی روانی ہے جو گنگا کے پانی میں ہے، اور وہی وسعت ہے جو جمنا کے کناروں پر ہے۔ یہی زبان ہے جہاں 'عید' اور 'دیوالی' دونوں کا ذکر آتا ہے، جہاں 'رحمٰن' اور 'کرشن' دونوں کے قصے سنے جاتے ہیں، جہاں صوفیائے کرام کے اشعار بھی ہیں اور بھگتی سنتوں کی صدائیں بھی۔ یہ زبان اپنی اصل میں فرقہ واریت سے بلند، محبت اور اتحاد کی علمبردار ہے۔

ہندوستانی فلموں کی کامیابی میں اردو کا کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ مکالموں کی نرمی، نغموں کی مٹھاس، جذبات کی گہرائی اور شائستگی کی وہ روایت جو اردو کے بغیر ممکن نہیں، بھارتی سینما کو ایک عالمی شناخت عطا کرتی ہے۔ دنیا بھر میں جب ہندوستانی فلمیں دیکھی جاتی ہیں تو ان کے پس منظر میں اردو کی وہ تہذیبی خوشبو بھی پہنچتی ہے جو سامعین و ناظرین کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بالی وڈ کا بڑے سے بڑا کردار اپنی پہچان کے لیے اردو کے آہنگ کا سہارا لیتا ہے۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان دراصل ہندوستان کی روح ہے۔ ایک ایسی روح جو اپنے اندر ماضی کی کہانیاں، حال کی حقیقتیں اور مستقبل کی امیدیں سمیٹے ہوئے ہے۔

اختتامیہ

بالی وڈ اور اردو کا تعلق دراصل روشنی اور خوشبو کا رشتہ ہے۔ ایک نے اپنی کہانیوں کو آواز دی تو دوسری نے ان آوازوں کو دل کی دھڑکن بنا دیا۔ آج اگرچہ فلمی دنیا کی زبان ہندی اور انگریزی کے امتزاج سے نئی صورتیں تراش رہی ہے، لیکن اردو کی لطافت، اس کی مٹھاس اور اس کا جمالیاتی وقار اب بھی ہر دل میں اپنی پہچان باقی رکھے ہوئے ہے۔

حالیہ فلمیں اور ڈیجیٹل پلیٹ فارم اس بات کے شاہد ہیں کہ اردو محض الفاظ نہیں بلکہ ایک تہذیب ہے — ایک ایسا دریا جو محبت، شائستگی اور فکری گہرائی کی لہریں اپنے ساتھ بہاتا ہے۔

اگر بالی وڈ نے شعوری طور پر اردو کو اپنی تخلیقی روح میں دوبارہ جگہ دی تو یہ محض ایک زبان کی واپسی نہیں ہوگی بلکہ ایک تہذیب کی تجدید، ایک تاریخ کی بازیافت اور ایک شناخت کی تکمیل ہوگی۔ اردو کے بغیر بالی وڈ ایک ایسا جسم ہے جس کی روح کھو گئی ہو، اور اردو کے ساتھ یہ وہ زندہ روایت ہے جو نسل در نسل منتقل ہوتی چلی آتی ہے۔

یہ ہماری اجتماعی ذمہ داری ہے کہ ہم اردو کے اس ورثے کو نہ صرف محفوظ رکھیں بلکہ اسے آنے والی نسلوں کے سپرد بھی کریں۔ ہمیں یہ شعور پیدا کرنا ہوگا کہ زبانیں محض الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتیں بلکہ وہ ایک تہذیب کا عکس ہوتی ہیں۔ اردو کا تحفظ دراصل ہماری تہذیبی بقا کا تحفظ ہے۔ جب نئی نسل وہی مکالمے سنے گی جو دل کو چھو جائیں اور وہی نغمے گائے گی جو وقت کی دھول میں بھی اپنی روشنی برقرار رکھتے ہیں، تب ہی ہم یہ کہہ سکیں گے کہ اردو کا حسن زندہ ہے۔

جب تک اردو اپنی لطافت اور شائستگی کے ساتھ زندہ ہے، بالی وڈ کی روح بھی زندہ رہے گی۔ یہ امتزاج ہماری ثقافتی شناخت کا سب سے روشن حوالہ ہے، ایک ایسا حوالہ جس پر ہم فخر بھی کر سکتے ہیں اور جسے ہم آنے والی نسلوں کے لیے ایک قیمتی ورثے کے طور پر چھوڑ سکتے ہیں۔ بالی وڈ اور اردو کا یہ ملاپ نہ صرف ماضی کی پہچان ہے بلکہ مستقبل کی امید بھی ہے۔ یہی وہ دھڑکن ہے جو سینما کو دل کی گہرائیوں سے جوڑتی ہے اور یہی وہ روشنی ہے جو ہماری تہذیبی شناخت کو ہمیشہ تابندہ رکھے گی۔

■

Abdul Hafeez Farooqui Alig
230/7, Begam Ganj
Raja Bazar, Chowk
Lucknow- (UP)
Mob.:8738010996
abdulhafizfarooqi@gmail.com

ڈراما انارکلی اور فلم مغلِ اعظم کا تقابلی مطالعہ

وسیم احمد

ناٹک اور ڈرامہ بنیادی طور پر ایک سکے کے دو پہلو ہیں یعنی ایسی کہانیاں یا قصے جو اداکاری کے ذریعہ پیش کیے جائیں۔ انھیں پیش کرنے کی چاہے جو بھی مختلف شکلیں ہوں ''یعنی اسٹیج پر ہوں یا ریڈیو پر نشر کیا جائے یا پھر بصری انداز میں پیش کیا جائے''۔ ناٹک کا لفظ عام طور پر برصغیر ہند و پاک میں استعمال ہوتا ہے۔ ڈرامہ ایک یونانی لفظ ہے جو 'دراما' سے نکلا ہے جس کا مطلب حرکت یا عمل ہے۔ خاص طور سے اس کا مقصد ناظرین کو تفریح سے لطف اندوز کرانا یا پھر کسی خاص واقعے یا نظریے سے روشناس کرانا ہوتا ہے۔ ڈرامہ کی نمایاں خصوصیات یہ ہوتی ہیں کہ وہ بیانیہ کے بجائے عملی طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ڈرامہ میں کوئی کہانی بیان نہیں ہوتی ہے بلکہ اشخاص کے روبرو کہانی کو عملی طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے تمام کردار، افکار اور واقعات زندہ جاوید معلوم ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں محمد اسلم قریشی نے بہت اچھی بات لکھی ہے:

''ڈرامہ انسانی افعال کی ایسی نقل ہے جس میں الفاظ کی موزونیت اور نغمے کے ذریعے کرداروں کو محوِ گفتگو اور مصروفِ عمل ہو بہو ویسا ہی دکھایا جائے جیسے کہ وہ ہوتے ہیں۔ یا ان سے بہتر یا بدتر انداز میں پیش کیا جائے۔''

(محمد اسلم قریشی 'ڈرامے کا تاریخی و تنقیدی پس منظر' ص76، لاہور، 1971)

قدیم زمانے میں ہندوستان اور یونان ڈرامے کے مراکز سمجھے جاتے تھے۔ سنسکرت میں ڈراموں کی بہتات ہے۔ صدیوں سے فنِ ناٹک کو ہندوستان میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ آج بھی اس فن کے گراں قدر نمونے موجود ہیں جن کے ذکر کے بغیر ڈرامے کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی لیکن رفتہ رفتہ ناٹک زوال پذیر ہوتا رہا مگر یوروپ کی قومیں جب ہندوستان آئیں تو اپنے ساتھ ادبی، تہذیبی سرمایہ بھی لائیں جس کا اثر ہندوستانی علم و ادب پر بھی پڑا اور ان ہی حالات کے پیشِ نظر اردو ڈرامے کا آغاز و ارتقا ہوا۔

والیِ اودھ واجد علی شاہ کو فنونِ لطیفہ سے حد درجہ دلچسپی تھی۔ انھوں نے قیصر باغ میں ایک عالیشان عمارت تعمیر کروائی اور یہ عالیشان مکان رہسیہ کے لیے خاص کر دیا گیا تھا۔ عشرت رحمانی یوں رقمطراز ہیں:

''ان رہسوں کی پیش کش کے دوران میں سلطان نے اپنی ایک مثنوی 'افسانۂ عشق' کو بھی اسی طرز پر تیار کرایا اور تمثیل کیا۔ اس کا حوالہ شرح اندر سبھا میں سید امانت لکھنوی نے بھی دیا ہے جس میں رہسیہ کی شان و شوکت کا اظہار کیا ہے۔ چونکہ اس سے پہلے اردو ڈرامے کے کوئی نام و نشان کا کوئی پتہ نہیں ملتا۔ اس لیے قرائن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اردو ڈراما کا پہلا نقش 'افسانۂ عشق' تھا جو رہسیہ یا اوپیرا کی شکل میں پیش کیا گیا اور اس طرح اردو کے سب سے پہلے ڈرامہ نگار واجد علی شاہ تھے اور اس کے بعد امانت لکھنوی نے دوسرا نقش 'اندر سبھا' پیش کیا۔''

(عشرت رحمانی 'اردو ڈراما کا ارتقا' ص46، ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ، 1978)

امتیاز علی تاج نے ڈرامے کے فن کو گہرائی اور توانائی بخشی۔ اردو ڈرامہ کی تاریخ میں امتیاز علی تاج کا ڈرامہ 'انارکلی' کو شہرتِ دوام حاصل رہا۔ اس ڈرامہ کی حیثیت ہماری ادبی تاریخ میں سنگِ میل کی ہے اور اگر دیکھا جائے تو ادبی اعتبار سے اس ڈرامہ نے قارئین کو اس قدر مسحور کیا کہ دیگر ڈرامے اس کے سامنے ہیچ تصور کیے جانے لگے۔ اسی ڈرامہ کی بنیاد پر ایک شاہکار فلم 'مغلِ اعظم' بنی۔ 'انارکلی' ایک رومانی موضوع پر لکھا گیا ڈرامہ ہے جو فنی اعتبار اور ادبی لحاظ سے ایک اعلیٰ کارنامہ ہے جسے اردو ڈرامہ کی تاریخ میں بلند درجہ دیا گیا ہے۔ سید حیدر عباس رضوی لکھتے ہیں:

''امتیاز علی تاج ادبی لحاظ سے ایک متنوع شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے صنفِ ڈراما کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ فلم کے لیے بھی انھوں نے کہانیاں لکھیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ادبی خدمات متنوع ہیں اور ان کی تصانیف کی فہرست قدرے طویل ہے۔ لیکن ان کی لازوال ادبی شہرت کا انحصار ڈراما 'انارکلی' کے مصنف کی حیثیت سے ہے۔ یہ ڈراما تاج کے قلم کا شاہ کار ہے اور اس سے اردو ڈراما نگاری کی تاریخ کا اعتبار قائم ہے۔''

(سید حیدر عباس رضوی 'اردو ڈراما اور انارکلی' ص50,51، بھوپال، بک ہاؤس، بدھوارہ، بھوپال، ایم پی، 1977)

ڈراما انارکلی اور فلم مغلِ اعظم کا بنیادی جزو عشق کی فتحیابی ہے جو بظاہر محبت کی ہار معلوم ہوتی ہے مگر ایسا نہیں ہے بلکہ سچی محبت کی جیت دکھائی پڑتی ہے۔ ڈراما انارکلی اور فلم مغلِ اعظم کی اگر بات کی جائے تو کہانی، کردار، واقعات وغیرہ کئی ایسے مقامات ہیں جہاں واضح طور پر فرق نظر آتا ہے۔ انارکلی اور فلم مغلِ اعظم کے قصے کی بات کی جائے تو جس طرح ڈرامے میں کہانی کا آغاز محل کے شاہانہ ماحول، کنیزوں کی ہنسی تفریح، چھیڑ چھاڑ اور خوشگوار ماحول کو پیش کیا گیا ہے۔ مگر اس کے برعکس اگر فلم مغلِ اعظم کی بات کی جائے تو اس کی

کہانی کی ابتدا محل سے نہیں ہوتی ہے بلکہ تپتے صحرا میں اکبر کے اس سفر سے ہوتی ہے جس میں لاولد بادشاہ ایک بڑے لشکر کے ساتھ مزار پر منت مانگنے جاتا ہے اور بڑی منت سماجت اور مرادوں کے بعد ایک نونہال کی آمد ہوتی ہے۔ جس کی پرورش و پرداخت شاہی محل میں ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ عہد طفولیت سے گزرتے ہوئے وہ نوجوانی میں قدم رکھتا ہے۔ وہ حرم کی ایک کنیز پر فریفتہ ہوجاتا ہے، ایک ادنی کنیز کی محبت اس کے رگ و پے میں ہلچل مچادیتی ہے اور وہ انارکلی کے لاکھ سمجھانے سے بھی باز نہیں آتا۔ ادھر محل میں ایک اور کنیز دلآرام ہے جو ایک طرفہ سلیم کی محبت میں مبتلا ہوچکی تھی اور سلیم کو کسی کا ہوتے نہ دیکھ سکتی تھی۔ جب کہ انارکلی دلارام کے حسن کو پہلے سے ہی ماند کرچکی تھی۔ ایک رات دلارام نے اپنی آنکھوں سے باغ میں دونوں کے ملن کو دیکھ لیا تھا اور اس کے دل میں رشک وحسد کا جوالامکھی پھوٹ پڑا تھا۔ وہ یہ چاہتی تھی کہ انارکلی اور اس کی محبت کو جلا کر راکھ کردے۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھی کہ یہ بات اکبر کے دل پر بجلی بن کر گرے گی۔ دلارام کو ایسا موقع نوروز پر ملا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انارکلی ظل الٰہی کے حکم سے سپرد زندان کردی گئی۔

انارکلی کی موت کے سبب اس ڈرامہ کو ایک طرح سے انارکلی کی ٹریجڈی بھی کہا جاسکتا ہے۔ چونکہ انارکلی کی موت سے دلی جذبات کو ٹھیس ضرور پہنچتی ہے لیکن دلارام کی موت اور اکبر کے انجام سے یقیناً ہمارے دل کو سکون ملتا ہے۔ اسی وجہ سے یہاں اکبر کو ٹریجڈی کا ذمہ دار قرار دیا جاسکتا ہے۔ چونکہ اکبر سے ہی وہ غلطیاں ہوئیں جس کی وجہ سے انارکلی کی موت واقع ہوئی۔ یہاں اکبر اپنے مقاصد میں یکسر ناکام نظر آتا ہے اکبر کی اولین غلطی یہ ہے کہ وہ صرف شہنشاہیت کو ہی ترجیح دیتا ہے اور اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ ایک ادنیٰ کنیز مغلیہ سلطنت کی بہو بنے۔

اکبر اپنے فرزند کے جذبات وخواہشات کو شہنشاہ کے طور پر محسوس کرتا رہا۔ اگر وہ سلیم کو باپ کی شفقت سے دیکھتا تو کہانی کا انجام کچھ اور ہی ہوتا۔ چونکہ اکبر نے ایک مستحکم ومنظم حکومت قائم کی تھی۔ اور وہ یہ چاہتا تھا کہ سلیم بھی اسی کی طرح کارنامے انجام دے۔ اس نے سلیم سے اپنے خواب وابستہ کر رکھے تھے اور وہ ہر حال میں ان خوابوں کی تکمیل چاہتا تھا۔

امتیاز علی تاج کے ڈرامہ 'انارکلی' پر دو فلمیں بنائی گئیں۔ پہلے نند لال خشونت لال نے انارکلی کے نام سے پھر کے آصف نے 'مغل اعظم' کے نام سے۔ تاریخی نوعیت کے اس قصے کا اکبر اعظم یا مغلیہ تاریخ سے کوئی تعلق نہیں ہے بس یہ ایک قصہ ہے جو بہت مشہور ہے۔ دونوں فلموں میں اس بات کا اظہار نہیں کیا گیا کہ یہ فلم 'انارکلی' ڈرامے پر مبنی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ ڈرامہ لکھے جانے سے قبل یہ قصہ مقبول اور عام ہوچکا تھا۔ مغل اعظم فلم کا راوی ہندوستان ہے جو اپنے ایک چاہنے والے بادشاہ اکبر اور اس کے بیٹے

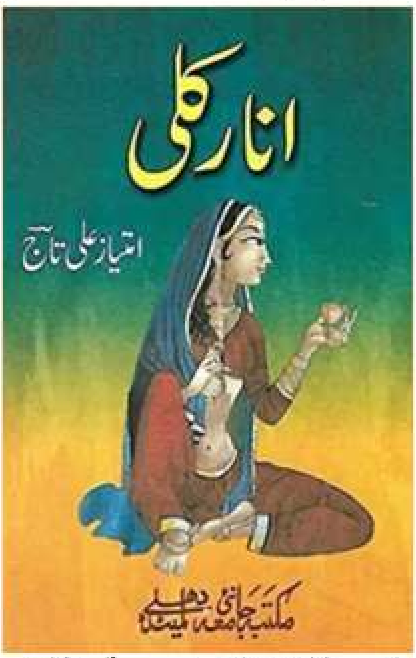

سلیم اور انارکلی کی کہانی بیان کرتا ہے۔ فلم انارکلی میں ایک غائب راوی ہے جو انارکلی کی محبت کی دردبھری کہانی بیان کرتا ہے۔ اس لیے مغل اعظم میں اکبر بادشاہ کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ دونوں فلموں کا آغاز انارکلی ڈراما جہاں سے شروع ہوا ہے اس سے کافی پہلے ہوتا ہے۔ انارکلی فلم میں سلیم کی محبوبہ ایک معمولی سپاہی سمجھ کر اس سے محبت کرتی ہے۔ مغل اعظم میں پیدائش سے جوانی تک کے واقعات دکھائے گئے ہیں جو ڈرامے میں نہیں ہیں۔ جہاں ڈرامے کی شروعات ہوتی ہے دونوں فلموں میں اس سے پہلے آدھے گھنٹے کی فلم گزر چکی ہوتی ہے۔ دونوں فلموں میں انارکلی کو قید کرنے کے بعد اس کو سزائے موت دے دی جاتی ہے اور سلیم کو نظر بند کردیا جاتا ہے۔ ڈراما یہیں پر ختم ہوجاتا ہے جب کہ دونوں فلموں میں باقاعدہ جنگ ہوتی ہے جس میں اکبر فتحیاب ہوتا ہے۔ پھر اس کے عدل وانصاف کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور انارکلی کو سزائے موت تجویز ہوتی ہے۔ لیکن اکبر نے انارکلی کی ماں سے ایک بار وعدہ کیا تھا کہ اس کی زندگی میں ایک بار جو مانگو گی عطا کیا جائے گا۔ وہ انارکلی کی زندگی مانگ لیتی ہے اس طرح انارکلی کو ایک سرنگ سے نکلوا کر سرحدوں سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔

مغل اعظم کو ماہرین نے ہندوستان کی ایک بہترین فلم قرار دیا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ فلم ہو یا ڈراما ہر انسان کو متاثر ضرور کرتا ہے۔ ڈرامے کی تقریباً ساری چیزیں دونوں فلموں میں شامل ہیں۔

کے آصف مغل اعظم میں انارکلی ڈراما کو پیش نہیں کر رہے تھے بلکہ وہ انارکلی کو اپنے تصور کے لحاظ سے اس میں نئے رنگ وروغن بھر کر اس کی تخلیق نو کر رہے تھے۔ اس فلم کے آرٹ ڈائریکٹر ایم کے سعید صاحب تھے۔ اسکرین پلے کی ذمہ داری امان نے سنبھالی۔ مکالمے اور ڈائیلاگ کمال امروہوی، احسان رضوی اور وجاہت مرزا نے لکھے۔ یہ فلم 1960 میں بنی۔ اس موضوع پر 1953 میں نند لال جسونت لال نے انارکلی کے نام سے فلم بنائی تھی۔ جب کہ انارکلی 1922 میں لکھی گئی اور مغل اعظم 1960 میں منظر عام پر آئی۔ ڈرامے میں انارکلی دیواروں میں چنوادی جاتی ہے اور اس کے برعکس فلم میں اسے سزا سنائی جاتی ہے۔ ڈرامے میں جنگ نہیں ہوتی جب کہ فلم میں بھرپور طریقے سے جنگ ہوتی ہے۔

مجموعی طور پر یہ بات بالکل درست ہے کہ کے آصف نے فلم 'مغل اعظم' میں اس قصے کو ہی نہیں بلکہ مغلیہ سلطنت کے جاہ وجلال، شان وشوکت، تہذیب وتمدن کو ہر کس و ناکس سے روبرو کرادیا۔ اس فلم کی مقبولیت کا عوام پر اتنا گہرا اثر پڑا کہ ہر خاص وعام ان مکالموں کو روزمرہ کی گفتگو میں استعمال کرنے لگے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح ڈراما 'انارکلی' فنی پختگی کی حیثیت سے بقائے دوام کا درجہ رکھتا ہے اسی طرح کے آصف نے فلم 'مغل اعظم' بنا کر ناظرین کو لازوال اور حسین تحفہ دیا ہے۔

■

Dr. Waseem Ahmad
Ministry of Defence, Government of India
Office of JS & CAO
New Delhi- 110003
Mob.:9958485519
wasim137@gmail.com

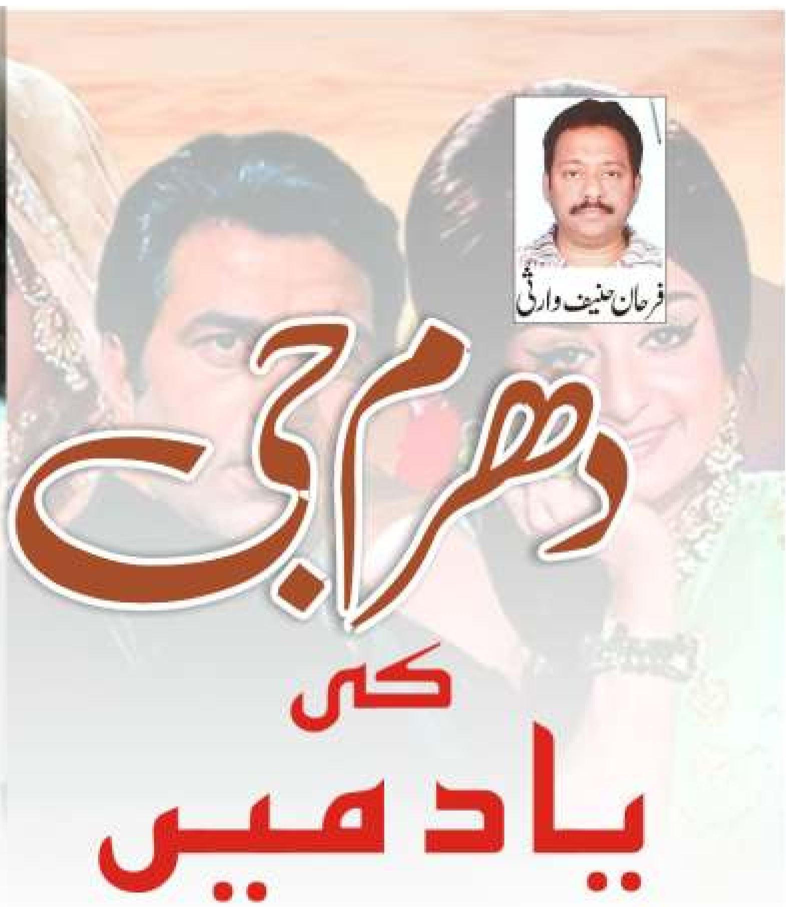

فرحان حنیف وارثی

دھرم جی کی یاد میں

مجھے جوانی میں بالی وڈ کے جن اداکاروں نے اپنی خوبصورتی اور اداکارانہ صلاحیتوں سے متاثر کیا، ان میں دھرمیندر کا نام سرفہرست ہے۔ دھرم پاجی مجھے اس قدر پسند تھے کہ میں نے انھیں کی طرح اپنی ہیئر اسٹائل رکھی تھی اور جب کوئی مجھ سے یہ کہتا کہ تمہاری ہیئر اسٹائل دھرمیندر جیسی ہے تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔ سچ کہوں تو میں ایک لمحے کے لیے خود کو دھرمیندر ہی سمجھتا۔ بالی ووڈ کے اداکاروں اور اداکاروں کے مداحوں میں یہ خوش فہمی عام سی بات ہے۔

قلابہ ممبئی کے تاریخی ریگل سنیما میں 31 مئی 2025 کو بالی ووڈ کے کامیاب ہدایت کار راج کھوسلہ کی پیدائش کی 100 ویں سالگرہ کے موقع پر ان کی تین سو پر ہٹ فلموں: سی۔آئی۔ڈی (1956)، 'بمبئی کا بابو (1960) اور 'میرا گاؤں میرا دیش' (1971) کی اسکریننگ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جب مجھے وہاٹس ایپ پر اس نمائش کا دعوت نامہ موصول ہوا، تو میں 'میرا گاؤں میرا دیش' دیکھنے پہنچ گیا۔ اس سے پہلے میں یہ فلم متعدد مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ جب طے شدہ وقت پر یہ فلم شروع ہوئی اور دھرم جی کا پہلا سین آیا، تو پورا سنیما ہال تالیوں اور سیٹیوں سے گونج اٹھا تھا۔ اس سے دھرمیندر کی سدابہار مقبولیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ہندی سنیما میں جب راجیش کھنہ اور امیتابھ بچن کا طوطی بولتا تھا اور انھیں 'سوپر اسٹار' کا خطاب دیا گیا تھا، ٹھیک اسی دور میں دھرمیندر کی فلمیں بھی باکس آفس پر یکے بعد دیگرے کامیابی کے ریکارڈ قائم کر رہی تھیں، مگر میڈیا نے کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھیں کبھی 'سوپر اسٹار' لکھنے کی زحمت نہیں کی، جبکہ وہ 'سوپر اسٹار' ہی تھے۔ البتہ میڈیا نے انھیں 'ہی مین' کا خطاب ضرور تفویض کیا تھا۔ دھرمیندر سے پہلے بھی ہندی فلموں میں ایسے کئی اداکار آئے جو 'ہی مین' کہلانے کے مستحق تھے، لیکن اس وقت یہ اعزاز کسی کو حاصل نہ ہو سکا۔ دھرمیندر اپنے مضبوط اور پھرتیلے کسرتی بدن، مسکراتی اور بولتی ہوئی آنکھوں اور اپنی اداکاری کے سبب ایک مکمل اور ہینڈسم ہیرو تھے۔

دھرم جی دلیپ کمار کی اداکاری کے مداح تھے اور دوسری طرف دلیپ کمار کو ان کے قد، کاٹھی اور مسکان کے ساتھ لاثانی آنکھیں پسند تھیں۔ دلیپ صاحب اپنے دل میں یہ کہتے تھے کہ کاش میں دھرمیندر کی طرح ہینڈسم ہوتا۔ دلیپ کمار نے ایک ایوارڈ فنکشن کے دوران اسٹیج پر دھرمیندر کو ایوارڈ دیتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا تھا۔ دلیپ کمار کی 'شہید' (1948) فلم نے دھرمیندر کو اس قدر متاثر کیا تھا کہ وہ دلیپ صاحب کی اداکاری کی نقل کرنے لگے تھے۔ انھی کی اسٹائل میں مکالمے ادا کرتے، چلتے اور آئینے کے سامنے خود کو سنوارتے اور دل ہی دل میں خوش ہوتے۔

دھرم جی کا جب دور چل رہا تھا، اس وقت ان کے دوست اور ہم عصر جیتندر (جمپنگ جیک)، شتروگھن سنہا (شاٹ گن)، منوج کمار (مسٹر بھارت) اور امیتابھ بچن (اینگری ینگ مین) کبھی بھی ان کے قریب نہیں آئے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب ایک ہی سال میں ان کی 9 فلمیں سنیما گھروں میں دکھائی جا رہی تھیں۔ ہندی فلموں کی تاریخ میں سب سے زیادہ کامیاب تجارتی فلمیں دینے کا ریکارڈ تاحیات دھرم جی کے پاس رہا۔

دھرمیندر کا جنم 8 دسمبر 1935 کو پنجاب کے لدھیانہ ڈسٹرکٹ کے نصرالی (ساہنوال) نامی گاؤں کے ایک ہندو جاٹ خاندان میں ہوا تھا۔ انھوں نے گورنمنٹ سینئر سیکنڈری اسکول (لالٹن کلاں، لدھیانہ) سے اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کی تھی جہاں ان کے والد کیول کرشن ہیڈ ماسٹر تھے۔ انھوں نے 1952 میں میٹرک (پھگوارہ) پاس کیا تھا۔ ان کی والدہ ستونت کور ایک خاتون خانہ تھیں۔ بالی ووڈ میں ہیمچو امیج کے حامل دھرم پاجی کا پیدائشی نام دھرم سنگھ دیول تھا۔ انھوں نے اسکول میں زیور تعلیم سے آراستہ ہونے کے دوران ایک استاد سے اردو زبان کی مٹھاس کا ذائقہ چکھا اور اس کے سحر میں کچھ ایسے گرفتار ہوئے کہ زندگی کی آخری سانس تک دلوں کو جوڑنے والی اس زبان پر فریفتہ رہے۔ یہ

وہ دور تھا کہ جب اسکولوں میں اردو پڑھائی جاتی تھی اور پنجابیوں میں اردو سیکھنے کا رجحان تھا۔

دھرم سنگھ دیول کی 1954 میں اٹھارہ برس کی عمر میں پرکاش کور سے سگائی ہوئی۔ پرکاش کور سے ان کے دو بیٹے سنی دیول (اجے سنگھ دیول)، بابی دیول (وجے سنگھ دیول) اور دو بیٹیاں وجیتا دیول اور اجیتا دیول ہیں۔انھوں نے 1980 میں دوسری شادی ہندی فلموں کی ڈریم گرل ہیما مالنی سے کی تھی۔ڈریم گرل سے ان کی دو بیٹیاں ایشا دیول اور اہانا دیول ہیں۔ دھرم جی کی حقیقی زندگی کی محبت کی کہانی فلمی شائقین کے لیے ان کی ذاتی زندگی کا سب سے زیادہ متاثر کن باب ہے۔

عام روایت ہے کہ دھرمیندر اور ہیما مالنی کی پہلی ملاقات 1970 میں 'تم حسین میں جوان' کے سیٹ پر ہوئی تھی۔

انگریزی کے صحافی، اسٹارڈسٹ کے سابق چیف ایڈیٹر اور فلم ڈائریکٹر رام کمل مکھرجی نے ہیما مالنی کی بائیوگرافی 'ہیما مالنی: بیونڈ دی ڈریم گرل' کے عنوان سے تحریر کی ہے جو 2017 میں منظر عام پر آئی تھی۔اس کتاب کو نوشین ماؤلا نے ایڈٹ کیا ہے۔اس کتاب کے مطابق دونوں کی پہلی ملاقات 'آسماں محل' نامی فلم کے پریمیئر پر ہوئی تھی۔ ہیما مالنی کو دھرمیندر نے جب پہلی مرتبہ دیکھا، تو ششی کپور سے پنجابی میں کہا کہ 'کڑی بڑی چنگی ہے'۔ بالی ووڈ کی اس خوبصورت جوڑی نے چرس، رضیہ سلطان، سیتا اور گیتا، علی بابا اور چالیس چور، دی برننگ ٹرین، شرافت، کرودھی، جگنو، ڈریم گرل، شعلے، آس پاس، راجا جانی اور 'پتھر اور پائل' سمیت تقریباً 40 فلموں میں ساتھ کام کیا ہے۔

بالی ووڈ کے گلیاروں میں بتایا جاتا ہے کہ ہیما مالنی اور جیتیندر کا رومانس جاری تھا اور چنئی (مدراس) میں دونوں شادی کے بندھن میں بندھنے ہی والے تھے کہ دھرمیندر کو کسی طرح یہ اطلاع موصول ہوئی اور وہ فلائٹ کے ذریعے وہاں پہنچ گئے اور ہیما مالنی کو شادی سے روک دیا اور ان سے اپنا حال دل بیان کیا۔ہیما مالنی نے دھرمیندر کی محبت تسلیم کرلی اور ان کی روایتی شادی جلد ہی ایک بڑے عوامی اسکینڈل کا باعث بنی۔

دھرمیندر اور ہیما مالنی نے ہنگامہ خیز تنازعات کے باوجود اپنی اپنی زندگیاں قابل ستائش محبت اور مثالی اعتماد کے ساتھ چلائیں۔ پرکاش کور اور ان کے چار بچوں نے مل کر اس طوفان کا بہادری سے مقابلہ کیا اور اس موضوع پر کسی بھی بحث میں حصہ لینے سے انکار کردیا اور کچھ برسوں بعد یہ معاملہ دونوں خاندان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہا۔

بالی ووڈ شادی ڈاٹ کام نے 11 نومبر 2025 کو مونیشا جی کمار کا ایک مضمون شائع کیا ہے۔مونیشا جی کمار کے مطابق اگرچہ دھرمیندر کو ہیما مالنی سے اٹوٹ محبت تھی، لیکن وہ اپنی پہلی بیوی پرکاش کور اور چار بچوں کے لیے بھی پُرعزم تھے۔انھوں نے پرکاش کور کو طلاق دینے سے منع کردیا اور کسی بھی دباؤ کے آگے مجبور ہوئے بغیر ہیما مالنی سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔

انھوں نے آگے لکھا ہے: 'دھرمیندر اور ہیما مالنی نے افواہوں پر توجہ دینے کے بجائے اپنے مسائل کو

آپسی مشوروں سے حل کیا۔2004 میں جب دھرم جی نے بی جے پی کے ٹکٹ پر بیکانیر (راجستھان) سے لوک سبھا کے چناؤ میں حصہ لیا،تو کانگریس پارٹی نے انکشاف کیا کہ اداکار اپنے اثاثوں کے اعلان میں صرف اپنی پہلی بیوی کی جائیدادوں کا ذکر کیا اور ہیما مالنی کے کسی بھی تذکرے کو چھوڑ دیا۔ ہیما مالنی سے جب اس بارے میں دریافت کیا گیا، تو انھوں نے جواب دیا: 'یہ ہمارے درمیان کا انتہائی ذاتی معاملہ ہے اور ہم اسے آپس میں طے کرلیں گے۔ کسی اور کو اس کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔' دھرم جی نے اپنی سیاسی زندگی کی شروعات بھارتیہ جنتا پارٹی سے کی تھی۔انھوں نے 2004 میں بیکانیر (راجستھان) لوک سبھا سیٹ سے الیکشن میں حصہ لیا اور کامیابی حاصل کی۔ وہ 2009 تک ممبر آف پارلیمنٹ رہے۔انھوں نے پارلیمانی مدت مکمل ہونے کے بعد دوسرا چناؤ لڑنے سے یہ کہتے ہوئے منع کردیا کہ وہ سیاست کے لیے موزوں نہیں ہیں اور انھیں سیاسی شعبدہ بازی سخت ناپسند ہے۔

دھرمیندر کے نصیب میں اداکار بننا لکھا تھا۔ انھیں اداکاراؤں میں ثریا پسند تھیں۔انھیں پڑھنے لکھنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ پابندی کے ساتھ فلمی رسالہ 'فلم فیئر' کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔انھوں نے 1949 میں ثریا کی فلم 'دل لگی' دیکھی اور اداکارہ کی خوبصورتی اور اداکاری کے مداح ہوگئے۔ان کے گاؤں سے سنیما گھر میلوں دور تھا۔انھوں نے چالیس سے زائد مرتبہ میلوں پیدل چل کر یہ فلم دیکھی تھی۔

1958 میں 'فلم فیئر' میں اداکاری کے ایک مقابلے کا کوپن شائع ہوا تھا۔دھرم جی نے یہ کوپن بھرا اور اس کے ساتھ اپنی ایک تصویر لفافے میں رکھ کر ڈاک سے ممبئی میں واقع 'فلم فیئر' کے دفتر کو ارسال کردی۔ ان کا انتخاب ہوگیا اور انھیں ممبئی مدعو کیا گیا۔ 1960 میں ان کی پہلی فلم 'دل بھی تیرا ہم بھی تیرے' سنیما گھروں میں ریلیز ہوئی۔اس فلم کے دیگر ستاروں میں بلراج ساہنی، کُم کُم اور اوشا کرن شامل تھیں ۔ہدایت کار ارجن ہنگورانی کی اس فلم کا چار لاکھ روپے بجٹ تھا۔ اس فلم میں کام کے لیے انھیں 51 روپے معاوضہ دیا گیا تھا۔پہلی فلم کے ریلیز ہونے کے بعد انھیں وہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکی، جس کی انھیں امید تھی۔اس فلم کے دو نغموں کو ناظرین نے پسند کیا تھا۔دو برسوں تک وہ کام کی تلاش میں بھٹکتے رہے۔مکان نہیں تھا۔ بحالت مجبوری ایک گیراج میں رات میں قیام کرتے اور پیٹ کی آگ بجھانے اور خرچ نکالنے کے لیے ایک ڈرلنگ فرم میں کام کرتے تھے جہاں

ان کی تنخواہ 200 روپے تھی۔

قسمت مہربان ہونے میں دیر نہیں لگی اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہندی فلموں کی ایک تاریخ ہے۔ 1962 میں 'انپڑھ' اور 1963 میں 'بندنی' ریلیز ہوئی اور ایک اسٹار کی طرح ان کا نام چمک اٹھا۔ بعد ازاں: آئی ملن کی بیلا، حقیقت (1964)، کاجل (1965)، پھول اور پتھر، ممتا، انوپما (1966)، میرے ہمدم میرے دوست، آنکھیں (1968)، ستیہ کام، خاموشی، آدمی اور انسان، آیا ساون جھوم کے (1969)، تم حسین میں جوان، میرا نام جوکر، کب، کیوں اور کہاں (1970)، گڈی، میرا گاؤں میرا دیش (1971)، سیتا اور گیتا، راجا جانی (1972)، یادوں کی بارات، بلیک میل، جگنو، کہانی قسمت کی، لوفر (1973)، چپکے چپکے، شعلے، پرتگیا (1975)، چرس، ماں (1976)، ڈریم گرل' اور 'دھرم ویر' (1977) جیسی فلموں نے بالی ووڈ کے اس 'ہی مین' کو سدا بہار اداکار بنا دیا۔

انھوں نے اپنے فلمی کیریئر کے دوران تقریباً 300 فلموں میں اپنی لاجواب اداکاری اور قابلیت کا لوہا منوایا ہے۔

دھرمیندر کو فلم انڈسٹری میں 'گرم دھرم' بھی کہا جاتا تھا، مگر وہ اپنی رحم دلی اور مروت کے سبب 'نرم دھرم' تھے۔ وہ خوبصورتی کے دلدادہ تھے۔ فلم انڈسٹری میں ان کی عاشق مزاجی مشہور تھی۔ انھیں اپنے فلم سازوں کو پیسوں کے لیے ہراساں کرنا سخت ناپسند تھا۔ وہ مزاجاً شریف النفس تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ میں لوگوں کی محبت کا بھوکا ہوں اور مجھے اس کے بغیر کبھی اطمینان نہیں ملتا۔

دھرم جی کی انسان دوستی کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ بالی ووڈ میں انھیں 'دل بھی تیرا ہم بھی تیرے' فلم میں پہلا بریک دینے والے ارجن ہنگورانی کا یہ احسان وہ زندگی بھر بھول نہیں پائے۔ دھرمیندر کے ساتھ 'نوکر بیوی کا' 'غلامی' اور 'جینے نہیں دوں گا' جیسی فلموں میں کام کرنے والی اداکارہ انیتا راج کے مطابق دھرم جی جیسا دریا دل اسٹار کوئی نہیں ہوسکتا ارجن ہنگورانی میرے چاچا تھے۔ انھوں نے دھرم جی کو پہلا بریک دیا تھا اور دھرم جی نے ساری زندگی اس قرض کو یاد رکھا تھا۔ انھوں نے ایک اسٹار بننے کے بعد ارجن ہنگورانی کی: کب، کیوں اور کہاں، کون کرے قربانی، کھیل کھلاڑی کا، قاتلوں کے قاتل، کرشمہ قدرت کا، کیسے کہوں کہ پیار ہے، اور 'سلطنت' جیسی متعدد فلموں میں کام کیا اور کسی بھی فلم کے لیے کوئی فیس نہیں لی۔ میرے چاچا جب بھی فیس کے بارے میں تذکرہ کرتے، ان کا جواب ہوتا 'ارے ارجن! کیا بات کر رہا ہے؟ میں اب تجھ سے پیسے لوں گا۔ میں یہ کیسے بھول سکتا ہوں کہ میرے لیے انڈسٹری کے دروازے کھولنے والا تو ہی تھا۔'

ہدایت کار ایس۔ آر پرتاپ نے دھرمیندر کیساتھ 'ڈاکو کالی بھوانی' (2000) فلم بنائی تھی۔ مجھے ایک پروجیکٹ میں ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔

ایس۔ آر۔ پرتاپ نے ایک دن سٹنگ کے دوران ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ اپنی فلم کے لیے دھرم جی کو سائن کرنا چاہتے تھے مگر ان کا بجٹ کم تھا اور وہ پوری فیس دینے کے قابل نہیں تھے۔ انھیں یہ پتہ تھا کہ دھرم جی کو چیک سے زیادہ زرِ نقد پسند ہے۔

وہ طے شدہ وقت پر دھرم جی سے ملاقات کے لیے ان کی رہائش گاہ پہنچ گئے۔ ایس۔ آر۔ پرتاپ نے دھرم جی کو کہانی سنائی جو انھیں اچھی لگی اور انھوں نے کام کرنے کی رضا مندی ظاہر کردی۔ سدابہار اداکار نے دریافت کیا کہ وہ کتنی فیس ادا کریں گے؟ پرتاپ جی نے کوئی رقم بتانے سے گریز کیا اور ٹاٹ کی ایک چھوٹی سی گونی ان کے سامنے رکھ دی۔ دھرم جی نے گونی کا سرا کھولا اور دیکھا کہ گونی 50 اور 100 روپے کے نوٹوں کے بنڈل سے بھری ہے۔ وہ ڈھیر سارے نوٹ دیکھ کر خوش ہوگئے۔ یہ بھی نہیں پوچھا کہ کتنی رقم ہے اور اسی وقت شوٹنگ کی تاریخیں دے دیں۔

ہندی فلموں کے اس سوپر اسٹار میں اداکاری کی قدرتی صلاحیت موجود تھی۔ ان کا ڈراموں سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا اور نہ ہی انھوں نے کوئی ایکٹنگ کورس کیا تھا۔ موصوف کے بقول 'میں ایکٹنگ سیکھ کر نہیں آیا تھا' یہاں میرا جذباتی ہونا ہی کام آیا۔ اصل میں ایکٹنگ ری ایکشن ہے اور ایک جذباتی آدمی ری ایکٹ جلدی اور اچھے سے کرتا ہے۔ کسی کو چوٹ لگی تو فوراً بے چین ہوگیا۔ غصہ آیا تو اسی وقت گالیاں بک دیں۔ میرے پریوار میں سبھی جذباتی ہیں۔' ان میں اپنے سین کو اپنے انداز سے یادگار بنانے کی قابلیت موجود تھی۔ بہت کم لوگوں کو یہ پتہ ہے کہ 'شعلے' فلم کا مندر میں کنیا والا یادگار سین، انھیں کے ذہن کی اپج تھا۔

دھرم جی سے مجھے دو مرتبہ ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی۔ ایک مرتبہ ممبئی کے ملنڈ اور بھانڈوپ علاقے کے درمیان واقع ایک بڑی کمپنی میں وہ اور راج ببر اپنی کسی فلم کی شوٹنگ میں مشغول تھے۔ معروف رسالے 'شمع' اور روزنامہ 'انقلاب' سے وابستہ فلمی نامہ نگار شکیل احمد اور میں ان سے ملنے پہنچ گئے۔ اس ملاقات کے دوران انھوں نے اپنی اردو نوازی کا ذکر کیا تھا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ مقبول عام ادبی اور فلمی رسالے 'شمع' کے مالک حاجی محمد یوسف دہلوی اور ان کے بیٹوں محمد یونس دہلوی، محمد ادریس دہلوی اور محمد الیاس دہلوی سے ان کے گھریلو مراسم ہیں۔ دھرم جی پابندی کے ساتھ 'شمع' کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ وہ روزنامہ 'انقلاب' کے بھی قاری تھے۔

اپنے پسندیدہ اداکار سے میری دوسری ملاقات ٹرامبے میں واقع بھابھا اٹامک ریسرچ سینٹر کے پاس واقع ایک اسٹوڈیو میں ہوئی تھی، جہاں میں نے ان کا انٹرویو بھی کیا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ اردو شاعری کے شوقین دھرم جی نے میری کتاب 'ممبئی ڈائری' کی ورق گردانی کی ہے۔ ہوا یوں کہ امریکہ میں مقیم ان کے دوست اور مصنف راج گرور جی ایک دن ممبئی کے 'کتاب دار' میں شاداب رشید سے ملاقات کی غرض

سے تشریف لائے تھے۔ انھوں نے وہاں سے میری کتاب 'ممبئی ڈائری' خریدی اور اس کے بعد طے شدہ پروگرام کے مطابق دھرم جی کی رہائش گاہ پہنچے۔ راج گروور جی کا جوانی کے ایام میں عروس البلاد ممبئی میں قیام رہ چکا ہے۔ وہ بالی ووڈ میں معاون ہدایت کار کی حیثیت سے فعال تھے۔ ان کے سنیل دت، ونود کھنہ اور دھرمیندر سے دیرینہ تعلقات تھے۔ دھرم جی کی نگاہ 'ممبئی ڈائری' پر پڑی اور انھوں نے اسی وقت ان کے پاس سے 'ممبئی ڈائری' حاصل کی اور چند صفحات پڑھنے کے بعد مطالعے کی غرض سے 'ممبئی ڈائری' اپنے پاس رکھ لی۔

اردو کے شیدائی دھرم جی نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا 'میں نے اردو پڑھی ہے، میں اردو زبان کا احسان مند ہوں، کچھ جذباتی ہوں، میں نے کبھی زندگی میں سوچا نہیں تھا کہ میں شاعری کروں گا مگر آتے آتے شاعری آگئی۔ مجھے اب بہت سی چیزیں مل رہی ہیں، مجھے لگتا ہے کہ اوپر والا مجھ پر بہت زیادہ مہربان ہے، مجھے کچھ نہ کچھ دیتے رہتا ہے۔' دھرم جی کو اپنی شاعری کا ویڈیو بنانا پسند تھا۔ دھرم جی نے شاعری کا آغاز کب کیا؟ اس کا صحیح علم کسی کو نہیں ہے۔ سوشل اور پرنٹ میڈیا میں ان کی شاعری کے بارے میں کافی کچھ لکھا اور کہا جاتا رہا ہے مگر سب قیاس آرائی ہی ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ انھیں شاعری میں دلچسپی 'شمع' کا مطالعہ کرتے ہوئے یا پھر اداکارہ مینا کماری سے مراسم کے دوران پیدا ہوئی تھی۔ انھیں دنوں یا پھر بعد میں ان کا شوق پروان چڑھا ہوگا۔ مینا کماری کو شاعری کا شوق تھا اور وہ غزلیں کہا کرتی تھیں، وہ اپنی غزلیں گلزار صاحب کو دکھاتی تھیں۔

مجھے آج بھی یاد ہے کہ جب میں دھرم جی سے پہلی مرتبہ ملا تھا، انھوں نے خوشگوار موڈ میں کہا تھا کہ اردو سے محبت نے انھیں لکھنے کا فن بھی سکھا دیا ہے۔ ان کی مختصر نظم ہے 'موقع دیا مقدر نے/ دل دماغ ایک ہوئے / نیکی بھی ساتھ ہوئی / محنت اور مشقت سے / منزلیں طے ہوگئیں / اور ہم سرخرو ہوئے۔' ایک اور نظم ملاحظہ کریں: 'مٹی کا بیٹا ہوں / مرتے مرتے کچھ کر جاؤں گا / اُکھڑتی، بوڑھی سانسوں سے / چُرا کے چند سانسیں میں / چیر کر سینہ دھرتی کا / فصل نئی ایک بو دوں گا / کھیتوں میں پھر ہریالی کی / چادر جب بچھ جائے گی / اُگ آئے گی جوانی میری / سانسوں میں سانسیں بھی آجائیں گی۔'

مصنفہ اور دستاویزی فلموں کی ہدایت کار رنکی بھٹاچاریہ نے دھرم جی کی یادوں سے وابستہ ایک مضمون میں لکھا ہے: 'میرے والد بمل رائے نے انھیں 'بندنی' فلم سے دریافت کیا۔ انھوں نے دھرم جی کو فلم کے سیٹ پر 150 روپے میں سائن کیا تھا۔ اس وقت ان کا بینک اکاؤنٹ نہیں تھا۔ بعد میں انھوں نے میرے والد کے چیک سے اپنا اکاؤنٹ کھولا تھا۔ اب میری پوتی (دشا) کی ان کے پوتے (سنی دیول کے بیٹے کرن) سے سگائی ہوئی ہے۔'

دھرم جی کی فلم 'بندنی' 1963 میں ریلیز ہوئی تھی، جبکہ اس سے پہلے 'دل بھی تیرا ہم بھی تیرے' (1960) اور 'ان پڑھ' (1962) ریلیز ہو چکی تھی۔ رنکی بھٹاچاریہ کا 'بندنی' فلم سے دھرمیندر کو دریافت کرنے کا دعویٰ شاید ان معنوں میں ہوگا کہ انھیں پہلی مرتبہ بمل رائے جیسے قابل اور معروف ہدایت کار کے ساتھ کام کرنے اور اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کو پیش کرنے کا موقع ملا۔ دھرم جی کی پہلی کمرشیل ہٹ اور بلاک بسٹر فلم 'ان پڑھ' تھی جو ان کی دوسری فلم تھی۔ اس فلم کے گانوں نے مقبولیت حاصل کی تھی۔ اس فلم میں دھرمیندر کے ساتھ بلراج ساہنی، مالا سنہا اور ارونا ایرانی نے کام کیا تھا۔ 'ان پڑھ' کے ہدایت کار موہن کمار تھے۔

> اردو کے شیدائی دھرم جی نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا 'میں نے اردو پڑھی ہے، میں اردو زبان کا احسان مند ہوں، کچھ جذباتی ہوں، میں نے کبھی زندگی میں سوچا نہیں تھا کہ میں شاعری کروں گا مگر آتے آتے شاعری آگئی۔'

دھرمیندر کی ہندی سینما کی تاریخی فلم 'شعلے' اور 'سیتا اور گیتا' کے ہدایت کار رمیش سپّی کے بقول 'دھرمیندر ایک ورسٹائل اور رنگین آدمی تھے۔ وہ اتنے کثیر جہتی تھے کہ جب میں انھیں 'شعلے' کے لیے کاسٹ کر رہا تھا، تو ان کا انتخاب گبر سنگھ اور ٹھاکر کے درمیان ٹاس اپ تھا۔ میں نے انھیں یہ کہتے ہوئے ویرو کا کردار ادا کرنے کے لیے راضی کیا کہ اگر وہ گبر سنگھ یا ٹھاکر کا کردار نبھاتے ہیں، تو انھیں ہیما مالنی (بسنتی) نہیں ملے گی۔ میں نے کہا تھا 'پھر آپ کو ہیما مالنی نہیں ملے گی۔' انھوں نے یہ سن کر ویرو کا کردار ادا کرنے کے لیے اپنی رضامندی ظاہر کردی اور مجھے مشورہ دیا کہ 'جے' کے کردار کے لیے امیتابھ بچن کو سائن کریں۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ امیتابھ بچن پہلے ہی بورڈ میں موجود تھے۔'

انگریزی کی معروف مصنفہ اور کالم نویس شوبھا ڈے کا ایک مضمون دھرم جی کی رحلت کے بعد 25 نومبر 2025 کے 'ہندوستان ٹائمز' میں شائع ہوا ہے۔ موصوفہ کے بقول 'دھرمیندر کو شہرت یا دولت سے کہیں زیادہ سچے انسانی رشتوں کی چاہت تھی۔ انسٹاگرام پر ان کے 2.6 ملین فالوورز تھے۔ ان کے مداحوں میں ہر عمر کی خواتین شامل تھیں اور وہ اپنی خواتین مداحوں کو آٹوگراف دیتے وقت گلے لگاتے یا پھر مصافحہ کرتے۔ انھوں نے سوشل میڈیا پر خود کو ایک شاعر کی حیثیت سے پیش کیا اور اکثر اپنی شاعری پیش کرتے رہے مگر ایک خاص عمر کے طبقے میں وہ اٹالین ایکٹر Rudolph Valentino کی طرح گلوبل رومانٹک آئیکون کی امیج رکھتے تھے اور اوریجنل اداکار اور فلموں کے دل کی دھڑکن جیسی مقبولیت کے حامل تھے۔' مجھے یاد ہے کہ دھرم جی نے ایک مرتبہ اعتراف کیا تھا کہ ہر عورت کو یہ محسوس کرانا کہ وہ خاص ہے، ان کی ڈیوٹی ہے۔

دھرم جی نے 2021 میں ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا 'مجھ سے کیمرہ عشق کرتا ہے۔ ابھی تو میں جوان ہوں۔ ہم دونوں آنکھ مچولی کھیلتے رہتے ہیں اور جب موقع ملتا ہے، تو گلے لگ جاتے ہیں۔ ہماری کافی یاری ہے۔' دھرمیندر واقعی جوان تھے۔ انھوں نے بڑھاپے کو کبھی اپنے اوپر حاوی ہونے کا موقع نہیں دیا۔ انوراگ باسو کی سوپر ہٹ فلم 'لائف ان اے میٹرو' (2007) میں انھوں نے نفیسہ علی کے مقابل اپنے بہترین رومانوی انداز کے سبب ناظرین کے دلوں کو چھو لیا تھا۔ اس فلم میں ان کے ساتھ شلپا شیٹی، کے کے مینن، شائنی آہوجا، عرفان خان، کونکنا سین شرما، شرمن جوشی اور کنگنا رناوت نے کام کیا تھا۔

ناقابل یقین حد تک ان کی آخری بڑی ہٹ فلم

'راکی اور رانی کی پریم کہانی' سال 2023 میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس وقت وہ 87 سال کے تھے اور اپنی ساتھی اداکارہ شبانہ اعظمی کے ساتھ بوسہ لینے والے سین کی وجہ سے میڈیا میں چمکے تھے۔ کرن جوہر کی ہدایت میں بننے والی اس فلم میں دھرم جی، شبانہ اعظمی، جیا بچن، رنویر سنگھ اور عالیہ بھٹ شامل تھیں۔ 'راکی اور رانی کی پریم کہانی' کی کامیابی کی پریس کانفرنس میں ستاروں اور میڈیا کے نمائندوں سے کھچا کھچ بھرے ہال میں جب دھرم جی سے کسی نے شبانہ اعظمی کے ساتھ بوسے والے سین کے بارے میں سوال کیا، تو ان کے جواب سے پورا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا تھا۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا 'ارے! یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ بہت مزہ آیا اور جب جب موقع ملتا ہے، میں ایسے چھکّے لگا دیتا ہوں۔' 87 سال کی عمر میں اتنی دلکش شرارت اور ایسی زندہ دلی، صرف اور صرف دھرم جی کے بس کی بات تھی۔

دھرمیندر کی بایوپک کی بھی خوب چرچا ہوتی رہی ہے۔ جب ان سے اس ضمن میں پوچھا گیا کہ وہ اپنی بایوپک میں کس اداکار کو دیکھنا پسند کریں گے، تو انھوں نے اپنے بیٹوں کی بجائے سلمان خان کا نام لیا تھا۔ دھرم جی نے 1983 میں اپنے بیٹے سنی دیول کو لانچ کرنے کی خاطر 'وجیتا فلمز' نامی ایک فلم کمپنی کی بنیاد رکھی اور سنی دیول کو 'بیتاب' (1983) جیسی زبردست کامیاب فلم سے متعارف کرایا۔ اس فلم کے ہدایت کار راہل رویل تھے۔ بعد میں انھوں نے 'گھائل'، 'برسات' اور 'سوچا نہ تھا' نامی فلمیں بنائیں۔ اپنے دوسرے بیٹے بابی دیول کو انھوں نے 'برسات' (1995) سے لانچ کیا۔ راج کمار سنتوشی اس فلم کے ہدایت کار تھے۔ اسی پروڈکشن ہاؤس سے سنی دیول نے اپنے بیٹے کرن دیول کو 'پل پل دل کے پاس' (2019) سے متعارف کیا تھا۔

دھرمیندر بالی ووڈ کے ان چنندہ اداکاروں میں شامل ہیں جن کے مکالموں سے ناظرین لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ ان کے چند مقبول مکالمے ہیں: 'یہ دنیا بہت بُری ہے شانتی! جو کچھ دیتی ہے، بُرا بننے کے بعد دیتی ہے' (پھول اور پتھر: 1966)، 'عشق ایک عبادت ہے اور عبادت میں جھوٹ نہیں چلتا' (آیا ساون جھوم کے: 1969)، 'کُتّے، کمینے، میں تیرا خون پی جاؤں گا' (یادوں کی بارات: 1973)، 'گاؤں والو! تم کو میرا آخری سلام۔ گڈ بائے بسنتی! ان کُتوں کے سامنے مت ناچنا' (شعلے: 1975)، 'صاحب لوگ یوں ہی مذاق میں کہتے تھے، لیکن میں کبھی نہیں مانا کہ میں پاگل ہوں' (چپکے چپکے: 1975)، 'تیرے گھر میں کیلینڈر ہے، 97 غور سے دیکھ لے، کیونکہ 98 تو دیکھ نہیں پائے گا' (لوہا: 1987)، 'دل کے معاملے میں ہمیشہ دل کی سُننی چاہیے' (لائف ان میٹرو: 2007) اور 'اوئے علاقہ کتوں کا ہوتا ہے، شیر کا نہیں' (یملا پگلا دیوانہ: 2011) وغیرہ۔

دھرم جی کو اپنے فارم ہاؤس میں کھیتی کا شوق تھا۔ وہ نامیاتی کاشتکاری کے ذریعے مختلف سبزیاں اگاتے تھے۔ وہ کھیتی کے ویڈیوز اور فوٹو اکثر سوشل میڈیا پر پوسٹ کرتے تھے۔ خود کو فٹ رکھنے کے لیے وہ سوئمنگ کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ بلاناغہ ورک آوٹ کرتے اور اس کا ویڈیو اپنے مداحوں کے لیے جاری کرتے تھے۔ انھوں نے 26 ستمبر 2025 کو سوشل میڈیا پر اپنی ایک تصویر کے ساتھ یہ لائن شیئر کی تھی 'آج کل غم دُنیا سے دور، اپنے ہی نشے میں جھومتا ہوں۔'

'ہی مین' کو 2012 میں ہندوستان کا تیسرا بڑا شہری اعزاز 'پدم بھوشن' اور 2020 میں 'نیوجرسی' (یو۔ایس۔اے) میں 'لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ' سے نوازا گیا تھا۔ اپنے ہی نشے میں جھومنے والے دھرم جی کی آخری فلم 'اکیس' 25 دسمبر 2025 کو ریلیز ہونے والی تھی۔ ہدایت کار شری رام راگھون کی اس فلم میں دھرمیندر، جے دیپ اہلاوت اور اگستیا نندا شامل ہیں۔

تجربہ کار اداکار دھرمیندر کی بگڑتی ہوئی صحت کی خبریں 10 نومبر 2025 کو انٹرنیٹ پر چھا گئیں۔ انھیں بریچ کینڈی اسپتال میں داخل کرایا گیا جب کہ اہل خانہ، مداح اور ان سے محبت کرنے والے ان کی صحت یابی کے لیے دعائیں کرتے رہے۔ ڈاکٹروں نے انھیں 'آئی۔سی۔یو' میں رکھا تھا۔ اس دوران ان کی موت کی جھوٹی افواہ سوشل اور الیکٹرانک میڈیا میں گردش کرنے لگی۔ مجبوراً سنی دیول اور ہیما مالنی کو اس خبر کی تردید کے لیے سامنے آنا پڑا۔ دھرم جی کو 12 نومبر کے دن اسپتال سے ڈسچارج کیا گیا۔ اہل خانہ نے جوہو میں واقع رہائش گاہ میں ہی میڈیکل کی تمام سہولیات کا انتظام کیا اور ڈاکٹروں اور نرسوں کی ایک ٹیم چوبیس گھنٹے وہاں علاج کے لیے رکھی گئی۔ اس دوران اہل خانہ نے میڈیا کو جانکاری دیتے ہوئے کہا کہ وہ اب ٹھیک ہو رہے ہیں اور ان کی صحت پہلے سے بہتر ہے۔ قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ 24 نومبر 2025 کو اپنی 90 ویں سالگرہ سے پندرہ دن پہلے وہ اس دنیا کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے گئے۔ ولے پارلے میں واقع پون ہنس شمشان میں ان کی آخری رسومات ادا کی گئیں۔

دھرم جی کی رحلت پر سیاست، فلم، اسپورٹس اور دیگر شعبوں کی معروف شخصیتوں نے اپنی تعزیت کا اظہار کیا ہے، مگر جو درد سائرہ بانو نے بیان کیا، وہ ناقابل فراموش ہے۔ سائرہ بانو کے مطابق دلیپ صاحب اور دھرم جی میں بھائی جیسا رشتہ تھا۔ انھوں نے کہا 'دلیپ صاحب کے بعد مجھے دھرمیندر کا تحفظ حاصل تھا، ان کی موت سے میرا یہ سہارا بھی ختم ہو گیا۔'

دھرمیندر بھلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے ہوں، مگر وہ اپنے اہل خانہ، رشتے داروں، گاؤں والوں، دوستوں، مداحوں اور بالی ووڈ سے وابستہ افراد کے دلوں، یادوں اور باتوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے، کیونکہ لیجنڈ کبھی نہیں مرتے، الوداع دھرم جی!

■

Farhan Hanif Warsi
Ramzan Bangi Chawl ,
Room No: 5. 1st Floor.
Kamathi Pura 3rd Lane ,
Mumbai : 400008
Mob: 9320169397
farhanhanifwarsi@gmail.com

دھرمیندر

انسانیت اور اداکاری کا سنگم

منتظر قاسمی

دھرمیندر کا فلمی سفر سندباد جہازی کی داستانوں سے کم دلچسپ اور تجسس آمیز نہیں ہے۔ کہاں پنجاب کا ایک دور افتادہ گاؤں سانہوال اور کہاں بمبئی کی چمک دمک بھری دنیا۔ لیکن ناظرین کے دلوں پر حکمرانی کرنے کے باوجود دھرمیندر کبھی فلمی چکا چوند میں کھو کر رہ نہیں گئے بلکہ صارفیت پرست دنیا میں انھوں نے ہر ایک سے پیار، محبت، دوستی، ہمدردی، وفاداری اور رواداری کا رشتہ بنایا اور نبھایا۔ دلیپ کمار کے تو وہ ایسے دیوانے اور گرویدہ تھے کہ بچپن میں ان کو فلمی پردے پر دیکھ کر ان کے حسن و جمال اور فن کاری و اداکاری پر ایسے فریفتہ ہو گئے کہ ان ہی کے جیسا ہی فنکار بننے کی ٹھان لی اور من ہی من میں اداکاری کے گُر سیکھنے کے لیے دلیپ کمار کو فلم ایکٹنگ کا درونا چاریہ مان کر ایکلویہ کی طرح ایکٹنگ کی مشق کرنے لگے۔ دلیپ کمار سے نہ صرف انھوں نے فن کاری کے جوہر سیکھے بلکہ نہایت پرکشش اور پر لطف گفتگو اور بات چیت کا سلیقہ بھی سیکھا۔ دھرمیندر بات چیت کے دوران ایسی نفیس، شائستہ اور شبنم سے دھلی ہوئی اردو بولتے تھے کہ سننے اور دیکھنے والا دم بہ خود رہ جاتا۔ ایک فن کار کے طور پر ان کا مزاج عاشقانہ اور شاعرانہ تھا چونکہ وہ ایک شاعرانہ طبیعت رکھتے تھے اس لیے اپنی باتیں اکثر و بیشتر شعری پیرائے میں کہتے تھے۔

ہر چند ان کے شاعرانہ بیان میں خوبصورت، بامعنی اور مترنم الفاظ ہوتے تھے لیکن ردیف اور قافیے کی قید سے آزاد ہوتے تھے۔ اپنے تمام انٹرویوز میں ہر ایک موقع پر شہنشاہ جذبات دلیپ کمار کی فن کاری کے متعلق یہ بات دہراتے رہتے تھے کہ:

”فلم انڈسٹری کا وہ ایک درخشاں آفتاب ہے جس سے کچھ روشنی چرا کے میں نے اپنی حسرتوں کے دیے کی لو کو روشن کیا ہے۔ ان کے لیے میرے دل میں بے پناہ عزت، سمان اور پیار ہے اور ہمیشہ ہی رہے گا وہ میرے بڑے بھائی، دوست اور سب کچھ ہیں۔“

دلیپ کمار فلم ایکٹنگ کا ایسا مکتب تھے جس میں فنکاری کے ہر طالب علم نے پڑھائی کی ہے اور ان سے کچھ نہ کچھ ضرور سیکھا ہے۔ دلیپ کمار کی ایکٹنگ کی جھلک ہر اداکار کی ایکٹنگ میں دکھائی دیتی ہے جس کا اعتراف ان کے زمانے اور ان کے بعد کے زمانے کے نامی گرامی فلمی ستارے کیا کرتے ہیں۔ انھیں فلم انڈسٹری کا پہلا میتھڈ ایکٹر کہا جاتا ہے۔ میتھڈ ایکٹنگ میں کرداروں میں ڈوب کر یا اتر کر کسی کردار کو اپنے اندر جذب کیا جاتا ہے۔ اس میں فن کار فقط اداکاری ہی نہیں کرتا ہے بلکہ کردار کے جذبات اور ذہنی کیفیت کو سمجھنے اور محسوس کرنے کے لیے خود کو کردار کے روپ میں ڈھال لیتا ہے۔

دلیپ کمار کو دنیا اگر ’شہنشاہ جذبات‘ کے طور پر تسلیم کرتی ہے تو ملینیم اسٹار امیتابھ بچن کو ’اینگری ینگ مین‘ کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے وہیں دھرمیندر کو ان کی خوبصورتی، دلکشی اور مردانہ وجاہت کے سبب ’ہی مین‘ کے نام سے پکارتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ انھیں People's Actor یعنی عوام کے فن کار کا بھی خطاب ملا ہے۔ بچپن سے ہی وہ دلیپ کمار کے حسن، کشش اور اداکاری میں ایسے کھو گئے کہ زندگی بھر اس سے باہر نکل ہی نہیں پائے اور نہ ہی وہ نکلنا چاہتے تھے۔ اکثر و بیشتر وہ اپنے خوابوں اور خیالوں میں یہ سوچا کرتے تھے کہ میں بھی دلیپ کمار کے جیسا فن کار بننا چاہتا ہوں۔ ایک اسکول ٹیچر کے بیٹے ہونے کے سبب ان کے والد چاہتے تھے کہ وہ ایک پروفیسر بن جائیں مگر دھرمیندر کا دل پڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔ ان کے من میں تو ایکٹنگ کا بھوت سوار تھا ایک دن اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے دھرم جی نے اپنی والدہ سے کہا کہ ماں میں ایک ایکٹر بننا چاہتا ہوں۔ ماں بھی اتنی سادہ دل تھی کہ بیٹے سے کہا کہ عرضی ڈال دو۔ اتفاق سے اسی دوران گرودت کو اپنی ایک فلم کے لیے ہیرو کی تلاش تھی جس کے متعلق آل انڈیا فلم فیئر ٹیلنٹ ہنٹ (All India Filmfare Talent Hunt) کا ایک اشتہار دھرمیندر کی نظر سے گزرا جس کی عرضی دھرمیندر نے واقعی بھیج دی اور ان کا انتخاب ہوا

اور بمبئی (ممبئی) کے لیے بلاوا بھی آ گیا۔ بعد میں دھرمیندر باپ کی خواہش کے مطابق پروفیسر بنے تو فلم 'چپکے چپکے' میں پروفیسر پریمل ترپاٹھی کے رول میں۔

پنجاب کے ایک دور دراز خطے نصرالی میں 8 دسمبر 1935 کو پیدا ہونے والے اور سانہوال میں اپنا بچپن گزارنے والے دھرمیندر سنگھ دیول جب اپنے خوابوں کو سینے سے لگائے ہوئے ممبئی یعنی اس وقت کی بمبئی گئے تو اپنے ہمراہ اپنے گاؤں کی مٹی کی خوشبو اور کھیت کھلیان کی بو باس بھی لے گئے اور تا عمر اپنے فرقت زدہ پنجاب کو سینے سے لگائے رکھا۔ ان کے فلمی کیریئر کے اتار چڑھاؤ میں کئی ایسے موڑ آئے جہاں اکثر لوگ ٹوٹ جاتے ہیں۔ ایسے میں ان کے گاؤں کی مٹی نے دھرم جی کو منتشر ہونے سے روکا۔ وہ ایک متوسط طبقے سے آتے تھے اور انھوں نے اپنا بچپن بھی اسی طبقے میں رہ کر گزارا تھا اس لیے وہ کبھی اس بات کو فراموش نہیں کر سکے۔ بس دل میں فنکاری کا ایک جنون اپنے سر میں لے کر گھر سے نکلے تھے۔ وہ اکثر شعری پیرائے میں اپنی بات کہتے ہیں جو کہ ہر کسی کے لیے جدو جہد کے دنوں میں امید کی راہ دکھاتی ہے وہ کہتے ہیں۔

غربت نام کی ننگی تلوار پر چل کر میں نے زندگی کا توازن سیکھا ہے
وقت کے نوکیلے پتھر اب کیا ڈرائیں گے مجھے

ہندوستانی سنیما نے ایسے بہت کم ہیرو دیکھے ہیں جنھیں شہروں سے زیادہ گاؤں کے لوگوں نے اپنا ہیرو تسلیم کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی دیسی امیج، مردانہ وجاہت اور دم دار مکالمہ کی ادائیگی نے ناظرین کے دلوں میں ایک الگ ہی مقام پیدا کیا۔ کہا تو یہ بھی جاتا ہے کہ دھرمیندر سے زیادہ خوبصورت پردے پر کوئی دوسرا ہیرو اب تک نہیں آیا ہے۔ جس کو قدرت نے اپنے دست ہنر سے ایسا گوندھا تھا کہ وہ جسم و جسامت، پیکر اور قد کاٹھی کے اعتبار سے بھی نہایت دلیر اور مردانہ وجاہت کا مالک تھا۔ اس کی آواز میں بھی عجیب سی مردانہ کشش تھی جب وہ غصہ میں ہوتا تو زبان اور آنکھوں سے شعلے ابلنے لگتے اور جب پیار کرنے پر آتا تو ایک بے لوث عاشق کے مانند نظر آتا تھا یعنی پردے پر اس کا ہر ایک روپ ناظرین کو پسند آتا تھا۔ معروف نغمہ نگار، اسکرپٹ رائٹر اور مکالمہ نگار جاوید اختر نے اپنے پروگرام 'زی کلاسک' میں دھرم جی سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ:

''آپ دیکھیے کہ 'پھول اور پتھر' سے جو آدمی اسٹار بنا ہے اگلے سال اس کی فلم 'انوپما' ہے جس میں وہ ایک قلم کار ہے۔ 'دیور' میں وہ ایک نہایت ہی شریف، ایماندار اور سیدھا سادہ آدمی ہے جو اپنی شادی طے کرنے کے لیے اپنے دوست کو بھیجتا ہے لیکن دوست خود ہی اپنی شادی اس لڑکی سے طے کر لیتا ہے اور وہ اندر ہی اندر گھٹ کے رہ جاتا ہے۔ 'بہاریں پھر بھی آئیں گی' میں وہ ایک صحافی ہے۔ آپ دیکھیے کہ 'پھول اور پتھر' میں جو آدمی اتنا ٹف (Tuff) مردانہ قسم کا رول کرتا ہے آگے ایسا ہی رول کرنا چاہیے اگر ایسا نہیں ہے تو ہمیں Convince نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بڑے ہی دمدار قسم کے آدمی کا رول کر رہا تھا اب یہ کیسے رول کر رہا ہے۔ مگر دھرم جی کی Personality کا کمال ہے کہ وہ جیسا چاہتے ہیں وہ اتنا ہی نرمل، شیتل، شانت اور سمجھیہ خاموش سا شرمیلا آدمی ہے۔ دراصل یہ دونوں ہی خوبیاں ان کی شخصیت میں بھی ہیں۔''

انھوں نے ایک بھولے بھالے، سادہ اور شریف دیہاتی سے لے کر شہری ہیرو تک، ایک رومانی ہیرو سے کر ایکشن ہیرو تک ہر طرح کے رول نبھائے ہیں۔ دھرمیندر کو فقط فلموں کا 'ہی مین' سمجھ لینا اس کے فن کے ساتھ زیادتی ہے بلکہ وہ اصل زندگی میں بھی ہی مین تھے ہمیشہ ہر ایک کی مدد کرنا، انڈسٹری میں نئے آنے والوں کی ہر ممکن مدد کرنا، اپنے گھر میں رکھنا، کھانے پینے کا بندوبست کرنا اور اگر کبھی کوئی ان کے گاؤں سے ملنے آئے تو اس کی ہر طرح سے خاطر تواضع کرنا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ وہ ایکشن ہیرو جو اکیلے ہی درجنوں غنڈوں کے چھکے چھڑا دے اور جب رومانس کرنے پر آ جائے تو ناظرین کے دلوں کی دھڑکن بن جائے۔ فلموں میں کچھ ایسے بھی ہیرو یا کردار گزرے ہیں جن کا مکالماتی انداز اور لہجہ فلم ناظرین کے دلوں پر نقش ہو جاتا ہے۔ پرتھوی راج کپور کا اکبری لہجہ اور شہزادہ سلیم کا جہانگیری لہجہ، راج کپور سے لے کر نصیرالدین شاہ تک سب ایک ایسا کھنک دار اور پر کشش لہجہ رکھتے ہیں کہ پردے پر جب یہ کسی مکالمے کو ادا کرتے ہیں تو اس میں زندگی بھر دیتے ہیں۔ ایسے ہی دھرمیندر کا بھی لہجہ اور آواز ہے۔ دلیپ کمار جو کہ اپنے زمانے کے سب سے مقبول اداکار ہیں وہ دھرمیندر کے بارے میں فلم فیئر ایوارڈ کی ایک تقریب میں دھرم جی کو ایوارڈ سے نوازنے کے بعد کہتے ہیں کہ 'جب میں نے پہلی بار دھرم کو دیکھا تو دیکھتے ہی میرے دل میں

'فلم انڈسٹری کا وہ ایک درخشاں آفتاب ہے جس سے کچھ روشنی چرا کے میں نے اپنی حسرتوں کے دیے کی لو کو روشن کیا ہے۔ ان کے لیے میرے دل میں بے پناہ عزت، سمان اور پیار ہے اور ہمیشہ ہی رہے گا وہ میرے بڑے بھائی، دوست اور سب کچھ ہیں۔'

(دلیپ کمار کے تئیں دھرمیندر کا تاثر)

ایک امنگ پیدا ہوئی کہ اے اللہ مجھ کو بھی ایسا ہی بنایا ہوتا۔ اس قدر خوبصورت، حسین، صحت مند چہرہ، آنکھوں سے روحانی روشنی ٹپکتی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ شخص ہوگا جو آگے چل کے، جس کی فطرت سادہ ہو وہ آدمی ٹریجڈی کرسکتا ہے۔'

دھرمیندر اکثر یہ بات دہرایا کرتے تھے کہ دلیپ کمار، مینا کماری اور افتخار کی وجہ سے ان کی اردو اچھی ہوگئی۔ محمد علی ماسٹر سے انھوں نے اردو سیکھی اور چھ جماعت تک انھوں نے اردو پڑھی۔ انھوں نے اپنی سوانح بھی اردو میں لکھی تھی مگر وہ پوری نہیں ہوسکی۔ راجیو ایم وجیا کر نے ان کی سوانح 'Dharmendra: Not Just a He man' میں ان کی نجی زندگی سے لے کر فلمی زندگی اور عوامی زندگی سب کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ دھرمیندر کی دوستی، وفاداری، رواداری اور خودداری انتہا درجے کی تھی۔ وہ اور فلمی ستاروں کی طرح نمبر ایک نمبر دو کے چکر میں کبھی نہیں پڑتے تھے بلکہ تقدیر میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب مل کر رہے گا اس بات پر یقین کامل کر کے باقی تمام چیزیں اوپر والے کے حوالے کر دیتے تھے۔ زندگی کے متعلق ان کا فلسفہ بہت ہی عیاں اور واضح تھا۔ وہ ہر حال میں خوش رہنے کا ہنر رکھتے تھے اور انھیں زندگی کے فنا ہونے پر پورا یقین تھا۔ اس لیے ہر ایک لمحے میں زندگی بھر دینا چاہتے تھے۔ ایک جگہ وہ کہتے ہیں کہ 'زندگی کو جینا چاہیے، کہاں بار بار ملتی ہے یہ زندگی، کسی کو Hurt یعنی چوٹ نہیں پہنچانا چاہیے۔' یہی وجہ ہے کہ ہر ایک آدمی یہ کہتا ہوا نظر آتا ہے کہ وہ بہت ہی زندہ دل انسان تھے۔ ان کی باتوں میں کہیں بھی مایوسی، ناکامی اور نامرادی کا گزر نہیں۔ بلکہ وہ محنت، لگن، کوشش اور عمل پر یقین رکھنے والے انسان تھے۔ وہ کبھی بھی اپنی عزت نفس کو گروی رکھ کر کام کے پیچھے نہیں بھاگے اور ہمیشہ اپنا وقار اور اپنی خودی کو بہت ہی سنبھال کر رکھا۔ انھوں نے زندگی میں جدوجہد، ناکامیاں اور کامیابیاں و کامرانیاں دیکھیں مگر ان سب کا حاصل وہ اپنی تقدیر اور قناعت کو ہی مانتے تھے۔ اس قدر عالی ظرف کہ کبھی اپنی کامیابی کا نشہ نہیں رکھا۔ وہ شاعرانہ طبیعت میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے دو مصرعوں میں کہتے ہیں۔

سب کچھ پاکر بھی حاصلِ زندگی کچھ بھی نہیں
میں نے دیکھے ہیں ایک سے ایک سکندر خالی ہاتھ جاتے ہوئے

دھرمیندر ایک ایسے فنکار ہیں جن کو شہرت اور دولت سے زیادہ لوگوں کا پیار عزیز تھا، وہ کبھی بھی اپنی خودی بیچ کر اور اپنا وقار کھو کر کسی سے کام مانگنے نہیں گئے بلکہ ان کا ماننا تھا کہ جو بھی ملے گا مجھے قسمت سے ملے گا۔ وہ کبھی کام کے پیچھے نہیں دوڑے بلکہ رول خود ان کا انتخاب کرتے تھے۔ لیکن جو بھی رول ملتا تھا اس کو عبادت جان کر بڑی ہی ریاضت سے انجام دیتے تھے۔ دلیپ کمار، راجکپور، جتیندر اور امیتابھ بچن جیسے نامی گرامی فن کاروں کے درمیان خود کو ثابت کرنا اور حرف مکرر کی طرح بنے رہنا فن اور ریاضت کے تئیں ان کی دیانتداری کو ثابت کرتا ہے۔ وہ کبھی بھی نمبر ایک، نمبر دو کہلائے جانے کی بھاگ دوڑ، حربوں اور ترکیبوں میں نہیں پڑے بلکہ ان سب سے دوری بنائے رکھی اور جب بھی انھیں کوئی ایوارڈ دیا جاتا تھا تو وہ اسے اپنے مداحوں کے نام معنون کر دیتے تھے کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ ہم جو کچھ بھی ہیں شائقین اور چاہنے والوں کے دم پر ہیں۔ ایک انٹرویو میں انھوں نے کہا کہ :

''شہرت ایک نشہ ہے صاحب جو چڑھتا ہے اور اتر جاتا ہے لیکن محبت کا نشہ تو دلوں میں اتر جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ بھلے ہی مجھے پیسے کم ملیں، جب کہ میں جلدی اپنی فیس نہیں بڑھاتا تھا لیکن میری یہ خواہش رہتی تھی کہ میں لوگوں کے دلوں میں اتر جاؤں۔''

یہ بھی کسی خواب سے کم نہیں ہے کہ انھیں فلم انڈسٹری کی ایک ایسی شاہ جہانی شخصیت کے ہاتھوں فلم فیئر کا 'لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ' دیا گیا جس سے دھرمیندر کے دیرینہ خواب کی تکمیل ہوگئی۔ یہ اعزاز ان کو انھیں کے ہیرو دلیپ کمار کے بدست ملا جس نے اعزاز کے وقار میں مزید اضافہ کر دیا۔ کیونکہ وہ انھیں اپنا بڑا بھائی مانتے تھے اور اکثر یہ بات کہتے تھے کہ ہم دونوں بھلے ہی دو الگ الگ ماؤں کی اولاد ہیں لیکن میں دلیپ صاحب میں اپنے بڑے بھائی کو دیکھتا ہوں۔ وہ میرے رہنما، استاد اور یار ہیں۔ وہ اپنے تمام پرستاروں سے بے انتہا محبت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ میرے چاہنے والے جو مجھے اپنے دلوں میں بسائے ہوئے ہیں وہی میرے لیے سب سے بیش قیمتی دولت ہے میں۔ اس محبت کے آگے کبھی بھی دولت کو ترجیح نہیں دوں گا۔ یہی بیش قیمتی دولت ہے جو میں نے بہت ہی ریاضت اور عبادت سے کمائی ہے۔ فلموں میں تعاون کے لیے انھیں 2012 میں پدم بھوشن اعزاز سے نوازا گیا۔ آخر میں وہ مہاراشٹر کے لوناوالا میں فارم ہاؤس میں کھیتی کسانی کرنے لگے تھے جس میں ان کا من بھی خوب لگتا تھا۔ وہ اپنے فارم ہاؤس میں پورا نصرالی گاؤں بسائے ہوئے تھے جس سے ان کی روح کو بڑا سکون ملتا تھا۔ بہت مکمل، کامیاب اور پیار محبت سے لبریز بھرپور زندگی جی کر وہ 24 نومبر 2025 کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

■

Dr. Muntazir Qaimi
Dept of Urdu, Fakhruddin Ali Ahmad
Gov P G College, Mahmoodabad
Seetapur-261203 (UP)
Moh.:8127934734
muntazirqaimi@gmail.com

دھرمیندر
مداحِ اردو

محی الدین عبداللطیف

مشہور اداکار دھرمیندر نے اپنی رومانی اداکاری مردانہ وجاہت، شفقت بھرے لہجے اور جذباتی انداز کے سبب پانچ دہائیوں تک شائقین کے دلوں پر راج کیا۔ ان کا اس دنیا سے رخصت ہونا، ایک دور کا اختتام مانا جارہا ہے۔ وہ ایک طرف کامیاب اداکار تھے تو دوسری طرف اردو زبان کے خاموش سفیر بھی تھے، جنھوں نے پردۂ سیمیں پر اردو زبان، لب و لہجے اور تہذیب کی نہ صرف عکاسی کی بلکہ بھرپور نمائندگی بھی کی۔

بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ فلمی پردے پر ایکشن ہیرو کی شبیہ میں نظر آنے والے دھرمیندر نہ صرف اردو نواز تھے بلکہ ایک حساس شاعر بھی تھے۔ دھرمیندر کئی موقعوں پر اردو زبان کی احسان مندی کا برجستہ اظہار کر چکے ہیں۔ ان کے مزاج میں شگفتگی اور لہجے میں نرمی اردو زبان و ادب کی مرہونِ منت تھی، ایسا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

دھرمیندر اردو زبان کے عاشق تھے۔ پنجابی ان کی مادری زبان ضرور تھی لیکن اردو سے انھیں والہانہ عشق تھا۔ وہ اردو کو اپنی مادری زبان تصور کرتے تھے۔ عام بول چال اور میڈیا سے گفتگو کے دوران اردو زبان اور اشعار کا جا بجا استعمال ان کی شخصیت کا حصہ تھا۔

دھرمیندر کی اردو دوستی اور اردو شناسی کے قصے ہم نے اخبارات، رسائل اور سوشل میڈیا کے توسط سے تو سن رکھے تھے۔ لیکن ہم چاہتے تھے کہ کیوں نہ ایسے افراد سے گفتگو کی جائے اور حقائق دریافت کیے جائیں، جنہوں نے نہ صرف دھرمیندر کے ساتھ کام کیا ہے بلکہ اس عظیم اداکار کے ساتھ وقت بھی گذارا ہے۔ تا کہ دھرمیندر کی شاعری اور اردو زبان سے بے پناہ محبت کے ان پہلوؤں سے بھی پردہ اٹھے جن سے عام لوگ ناواقف ہیں۔

معروف فلم صحافی راجیو وجے کر نے دھرمیندر کی سوانح حیات 'دھرمیندر: ناٹ جسٹ اے ہی مین' میں اداکار کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ دھرمیندر کی سوانح عمری پر کام کرتے وقت راجیو کئی مرتبہ دھرمیندر سے ملے اور ان کی زندگی و حالات پر گفتگو کی، سوانحی کتاب کے مختلف ابواب میں انھوں نے ایکٹر کی زندگی کے مختلف گوشوں کو آشکار کیا ہے۔

دھرمیندر کی سوانح حیات بروقت ہمارے ہاتھ تو نہیں لگ پائی مگر ہم نے تنگیٔ وقت کو غنیمت جانتے ہوئے اور سیدھے راجیو وجے کر سے ممبئی میں رابطہ کیا۔ انھوں نے بتایا کہ دھرمیندر کو اردو زبان اور شاعری سے بڑی محبت تھی۔ بائیوگرافی میں انھوں نے تقریباً پندرہ صفحات پر مشتمل ایک خصوصی باب باندھا ہے، جس میں انھوں نے دھرمیندر کی اردو شاعری سے محبت کا ذکر کرتے ہوئے ان کی اردو شاعری کو رومن میں نقل کیا ہے۔

راجیو وجے کر نے ہمیں بتایا کہ 2007 میں امریکہ میں علاج کے دوران انھیں اردو شاعری کا جنون پیدا ہوا۔ انھوں نے اپنی شاعری کو تحریری شکل میں آشکار کرنا شروع کر دیا تھا۔ بقول راجیو وجے کر' دھرمیندر نے انھیں ان کے کئی اردو کلام یہ کہتے ہوئے سونپا کہ ان میں سے کلام منتخب کر لیجیے۔ راجیو نے دھرمیندر کی سوانح عمری میں ان کے منتخب کلام کو نقل کیا ہے۔

اب ذرائع ابلاغ میں یہ اطلاع گشت کر رہی ہے کہ اداکار کی وفات کے بعد اہل خانہ ان کے شاعرانہ کلام کو یکجا کر کے کتابی شکل دینے کے لیے کوشاں ہیں۔ اس کے متعلق کوشش بھی شروع ہو چکی ہے۔ تا کہ اداکار کی شاعرانہ انسیت کے ساتھ ان کے شعری جذبات کو بھی عوام کی نذر کیا جائے۔

معروف فلمی مکالمہ نگار اور ڈائرکٹر جاوید دانش سے جب میں نے ان کی اردو نوازی اور شاعری سے متعلق مزید تفصیلات جاننی چاہی تو انھوں نے بتایا کہ دھرمیندر نے انھیں خود اپنا کلام سنایا ہے۔ جاوید دانش نے کہا کہ وہ ان کے ساتھ ایک فلم پر کام کر رہے تھے لیکن چند وجوہات کی بنا پر وہ فلم پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ پائی۔

جاوید دانش جو اسکرین رائٹر ایسوسی ایشن کے اہم ترین رکن اور خزانچی ہیں۔ انھوں نے دھرمیندر کی اردو زبان سے دل لگی کے متعلق بتایا کہ دھرمیندر کی مادری زبان پنجابی کے بعد کوئی تھی تو وہ اردو زبان تھی۔ وہ ہندی کی بجائے اردو میں لکھنے پڑھنے اور گفتگو کو ترجیح دیتے تھے۔ انھیں اردو کے کئی اشعار زبانی یاد تھے۔ اداکارہ مینا کماری کے کئی اشعار انھیں زبان زد تھے۔ دھرمیندر مینا کماری کا نام بڑے احترام سے لیتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ عمر کے آخری حصے تک دھرمیندر جی نے اظہار کے لیے اردو زبان کو ہی ترجیح دی۔

بالی ووڈ کی کئی مشہور و معروف فلموں کے مکالمہ نگار، 'روشن دان' اور 'لنگر خانہ' جیسے سوانحی خاکوں پر مشتمل

کتابوں کے تخلیق کار جاوید صدیقی سے ہم نے دھرمیندر کی اردو سے محبت کے متعلق دریافت کیا تو انھوں برجستہ کہا 'دھرمیندر اردو کے مداح نہیں تھے بلکہ وہ اردو والے ہی تھے۔' وہ نہ صرف اردو زبان بولتے تھے بلکہ اردو میں ہی لکھتے پڑھتے تھے اور ان کے لیے فلموں کے ڈائیلاگ صرف اردو میں ہی لکھے جاتے تھے۔

جاوید صدیقی نے دھرمیندر کی فلم 'علی بابا اور چالیس چور' اور 'میں بلوان' کے مکالمے تحریر کیے ہیں۔ جاوید صدیقی ان دونوں کو یاد کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ باقی اداکاروں کے مکالمے دیوناگری یا رومن میں تحریر ہوتے تھے لیکن دھرمیندر کے مکالمے صرف اردو زبان میں تحریر کیے جاتے تھے۔ انھیں اردو میں مہارت حاصل تھی جبکہ انھیں ہندی اتنی روانی کے ساتھ نہیں آتی تھی۔ دھرمیندر کو اردو کے کئی اشعار منہ زبانی یاد تھے اور وہ خود اردو میں شاعری بھی کرتے تھے۔ اردو کتابوں کا مطالعہ ان کا شوق تھا۔ ان کے پاس ہمیشہ اردو کتابیں موجود رہا کرتی تھیں۔

جاوید صدیقی نے 1980 میں ریلیز ہونے والی فلم 'علی بابا اور چالیس چور' کی شوٹنگ کے وقت تاشقند میں دھرمیندر کے ساتھ گذارے ہوئے وقت کا ذکر کرتے ہوئے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ اس فلم کے ڈائیلاگ لکھ رہے تھے۔ یہ ایک انڈو رشین فلم تھی۔ اس دوران ایک روسی مترجم ان کے ساتھ ہوا کرتا تھا جو روسی گفتگو کو انگریزی میں ٹرانسلیٹ کیا کرتا تھا اور انگریزی والا مترجم اسے ہندی میں ترجمہ کر کے پیش کرتا تھا۔ دھرمیندر کو یہ بات ناگوار گذری انھوں نے درخواست کی کہ ایسے مترجم کا انتظام کیا جائے جسے روسی زبان کے ساتھ ساتھ اردو بھی آتی ہو۔ دھرمیندر کی خواہش پر روسی زبان سے اردو میں ترجمہ کرنے والے مترجم کا انتظام کیا گیا۔ جس پر دھرمیندر نے نہایت ہی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا 'اس دیار غیر میں اپنی زبان بولنے والا شخص بھی موجود ہے۔'

میوزک ڈائیرکٹر اور غزل کمپوزر ذوالفقار علی جو فی الحال بھوپال میں مقیم ہیں اور زیل انٹرٹینمنٹ کے بانی ہیں۔ وہ لمبے عرصے تک دھرمیندر کے چھوٹے بھائی، اداکار و فلم پروڈیوسر، اجیت سنگھ دیول کے ساتھ منسلک رہے، اس نزدیکی کے سبب انہیں دیول پریوار کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

ذوالفقار علی کا کہنا ہے کہ دھرمیندر اور اجیت سنگھ دیول دونوں بھائی اردو کے دلدادہ تھے۔ دونوں بھائی اردو میں شاعری بھی کرتے تھے۔ دونوں کا پڑھنا لکھنا اردو میں ہی ہوتا تھا۔ اجیت دیول بھی فلموں کی اسکرپٹ اپنے لیے اردو میں ہی تحریر کرواتے تھے۔ ان کے پاس اردو کتابوں کا بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ ان دنوں اجیت سنگھ دیول کا مجموعہ کلام ''بھول میں'' ترتیب دیا جا چکا تھا۔ لیکن چند وجوہات کی بنا پر شائع نہیں ہو پایا تھا۔

ذوالفقار علی 1992 کا ایک واقعہ یاد کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ایک روز ان کی ملاقات دھرمیندر سے ہوئی۔ انھوں نے ذوالفقار علی کو ایک ڈائری دی۔ اس ڈائری کے آخری صفحے پر دھرمیندر نے معروف شاعر قتیل شفائی کے نام ایک خط تحریر کیا تھا۔ ذوالفقار علی نے مزید بتایا کہ قتیل شفائی اور دھرمیندر کے درمیان خط و کتابت ہوا کرتی تھی۔ ان کے مراسم فیض احمد فیض سے بھی تھے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ دھرمیندر ان دنوں نہ صرف اردو ادب کو زیر مطالعہ رکھتے تھے بلکہ ان کے ہم عصر شعرا سے بھی اچھے مراسم تھے۔

ذوالفقار علی کے مطابق معروف شاعر جاں نثار اختر آخری ایام میں شدید علیل تھے، ہسپتال میں داخل تھے، ان کو ہسپتال سے ڈسچارج کروانے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ صابر دت نے جب پورا ماجرا دھرمیندر کے گوش گذار کیا تو انھوں نے جاں نثار اختر کا ہسپتال کا بل ادا کر دیا۔

ذوالفقار علی دھرمیندر کی اردو دوستی پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے ایک اور دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ پرتھوی تھیٹر میں نیشنل اسکول آف ڈرامہ (این ایس ڈی) ریپرٹری کا ایک اردو پلے 'قید حیات' ہونا تھا۔ لیکن غالباً دسہرے کے تہوار کی مناسبت سے شو کے ٹکٹ فروخت نہیں ہو رہے تھے۔ جب دھرمیندر کو اس متعلق پتہ چلا تو انھوں نے فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شو کے تمام ٹکٹ خرید لیے اور یہ کہتے ہوئے انھیں اردو والوں میں تقسیم کروا دیا ''اردو زبان کا پلے خالی نہیں جانا چاہیے۔'' ذوالفقار علی نے بتایا کہ 'قید حیات' کے ٹکٹ کو انھوں نے خود اردو والوں تک پہنچایا تھا۔

اداکار دھرمیندر کی اردو زبان اور اردو والوں کے تئیں محبت کی داستانیں یہیں ختم نہیں ہوتیں۔ زبان و ادب سے اداکار کی محبت کے ایسے کئی قصے ہیں جو شاید ابھی بیان ہونا باقی ہیں۔

معروف فلم رائٹر اور ڈائرکٹر رومی جعفری نے 7 دسمبر کے 'دینک بھاسکر' اخبار میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں دھرمیندر کی اردو سے محبت اور اس زبان کے متعلق دردمندی کو قلم بند کیا ہے۔ رومی لکھتے ہیں کہ جب دھرمیندر جی اپنی شعری تخلیقات کو سناتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کے اندر ایک اداکار ہی نہیں بلکہ ایک حساس شاعر بھی موجود ہے۔

انھیں اس بات کا شدید رنج تھا کہ ان کے بیٹے اردو زبان نہیں سیکھ سکے۔ انھیں اس بات کا بھی غم تھا کہ اردو زبان آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی ہے۔ وہ ہمیشہ رومی جعفری سے کہا کرتے تھے 'یار رومی! اردو ختم ہوتی جا رہی ہے، مجھے کچھ کرنا ہے اردو کے لیے، کیا کروں؟ مجھے کچھ بتا۔ دیکھ میرے بچے ہی اردو نہیں پڑھتے۔'

رومی جعفری نے دینک بھاسکر میں تحریر کیا ہے کہ دھرمیندر جی کے انتقال کے دوسرے دن جب وہ اہل خانہ سے ملاقات کی غرض سے ان کے گھر گئے تو بابی دیول نے بڑے جذباتی انداز میں انھیں بتایا 'پاپا نے میرے لیے اردو ٹیچر رکھے تھے۔ میں ایک سال تک ان کے گھر اردو پڑھنے جایا کرتا تھا۔ میں کافی حد تک اردو سیکھ بھی گیا تھا۔ مگر کام شروع ہوا اور اردو سیکھنے کا سلسلہ بند ہو گیا۔' بابی دیول نے رومی جعفری کو بتایا 'کاش میں نے اردو ٹھیک سے سیکھی ہوتی تو پاپا کی لکھی ہوئی شعر و شاعری اور ڈائری سب پڑھتا، مگر اب میں نے سوچا ہے، میں اردو سیکھوں گا۔ تاکہ پاپا کی روح بھی خوش ہوگی اور ان کی لکھی ہوئی چیزوں کو میں پڑھ سکوں گا۔'

بابی دیول کا اردو نہ سیکھ پانے کے متعلق اظہار رنج دھرمیندر کی اردو سے بے پناہ محبت اور انسیت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ وہ خود چاہتے تھے کہ ان کی اولادیں اردو زبان سیکھے وہ اردو کے مستقبل کو لے کر بھی فکرمند تھے۔ جاوید صدیقی نے دھرمیندر کے متعلق بالکل صحیح کہا ہے 'دھرمیندر اردو کے مداح نہیں تھے بلکہ وہ خود اردو والے ہی تھے۔'

■

Mohiyuddin Abdul Lateef
80, Lane No:02, Old Azad nagar
Malegaon, Dist. Nasik, Maharashtra
Mob: 9167446964
Email:mohiuddinjourno@gmail.com

قانونی صحافت میں روشن مستقبل کے امکانات

خواجہ عبدالمنتقم

سنسنی خیز صحافت یا زرد صحافت (Yellow Journalism) سے وہ صحافت مراد ہے جس میں خبروں کو بڑھا چڑھا کر یا جذباتی انداز میں پیش کیا جاتا ہے اور سنسنی خیز خبروں، اشتعال انگیز سرخیوں، غیر مصدقہ معلومات اور عوامی جذبات سے کھیلنے کے ذریعے زیادہ سے زیادہ توجہ حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس طرز صحافت میں تحقیق، حقیقت پسندی اور اخلاقی اصولوں کی کم اہمیت ہوتی ہے، جبکہ سنسنی، افواہوں یا جذباتی مواد کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا بنیادی مقصد بن جاتا ہے۔ صرف یہی نہیں ہمارے بھولے بھالے عوام بھی جذبات کو بھڑکانے والے صحافیوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور مختلف فورم پر مدعو کیے جانے والے صحافیوں میں بھی سنجیدہ صحافیوں کے مقابلے میں ان کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔

زرد صحافت کے سب سے نمایاں امریکی محقق جوزف کمبل (Joseph Campbell) کے مطابق زرد صحافت ایک بامقصد سنسنی خیزی پر مبنی میڈیا ماڈل ہے۔ جس کی جڑیں 19ویں صدی کے امریکی اخبارات میں گہری ہیں۔ ان کے مطابق زرد صحافت کی جو مختلف شکلیں ہمارے سامنے آتی ہیں ان میں سنسیشنل ہیڈلائنز، مبالغہ آرائی، فیک نیوز کی ابتدائی شکلیں، شخصیاتی حملے، جرائم اور جنسی خبروں کا غیر متناسب استعمال شامل ہے۔ کمبل کا دعویٰ ہے کہ زرد صحافت نے میڈیا میں ایسی "خبری ثقافت" کی بنیاد ڈالی جس میں سچائی کی حیثیت ثانوی ہوگئی اور جذبات ہی بنیادی محرک بن گئے۔ کمبل کا Neo-Yellow Journalism نظریہ ڈیجیٹل دور میں زرد صحافت کی نئی شکلوں میں زندہ ہے جیسے کلک بیٹ، وائرل sensationalism، سوشل میڈیا، آن لائن ٹرول فیکٹریز، یادداشت سے زیادہ تاثر پر زور۔ ان کے مطابق موجودہ میڈیا ماحول میں زرد صحافت پہلے سے زیادہ طاقتور ہے کیونکہ آج کا ڈیجیٹل ڈھانچہ وائرل جذباتی مواد کو زیادہ ترجیح دیتا ہے۔

زرد صحافت کی کلاسیکی تعریف کے مصنف و امریکی دانشور اور تاریخ داں فرینک لوتھر موٹ (Luther FrankMott) نے زرد صحافت کی تاریخی و تحقیقی بنیاد رکھی۔ ان کے مطابق زرد صحافت کی پانچ بنیادی پہچان ہیں یعنی دل دہلا دینے والی سرخیاں، جعلی یا مبالغہ آمیز انٹرویوز، جھوٹ یا نیم جھوٹ پر مبنی خبریں، سنسنی خیز تصاویر یا خاکے جرائم، جنس اور اسکینڈل پر غیر متناسب زور۔ موٹ کے مطابق، زرد صحافت کا مقصد عوام کو معلومات فراہم کرنا نہیں بلکہ انہیں جھنجھوڑنا اور ان کے جذبات برانگیختہ کرنا ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ زرد صحافت نے خبر کو پروڈکٹ بنا دیا ہے، اخلاقیات کو کمزور کر دیا ہے، صحافتی پیشے کی سنجیدگی کو کم کر دیا ہے اور عوامی سوچ میں تبدیلی لانے کا عمل کیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ مختلف جنگوں کے درمیان عوامی جذبات کو بھڑکانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ڈیوڈ آر اسپنسر (David R.Spencer) کا کہنا ہے کہ زرد صحافت ایک سماجی مسئلہ ہے۔ ان کے مطابق زرد صحافت صرف صحافتی پالیسی نہیں بلکہ سماجی قوت کا اظہار ہے۔ جذباتی صحافت (Emotional journalism) کے نظریے کی بنیاد انسانی نفسیات کے تین محرکات یعنی خوف، غصے اور حسد یا تجسس پر ہے۔ اسپینسر کے مطابق میڈیا جب ان جذبات کو سودے بازی کے لیے استعمال کرتا ہے تو وہ اخلاقی صحافت سے دوری اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح کی صحافت سے دیگر افراد سے دشمنی پیدا ہونے کا امکان رہتا ہے۔ Claire Warden کے مطابق سوشل میڈیا زرد صحافت کی تین نئی شکلوں کی صورت میں رونما ہوا یعنی غلط معلومات، گمراہ کن معلومات اور جھوٹی معلومات۔ یہ ماڈل پرنٹ دور کی زرد صحافت سے زیادہ خطرناک ہے۔ انگریز پروفیسر ہیلن سیسن (Helen Sisson) کے مطابق زرد صحافت ایک طرح کی "emotionally staged narrative" ہوتی ہے۔ ان کے مطابق زرد صحافت کی خصوصیات میں خبر میں ڈرامہ پیدا کرنا، اسے جذباتی زاویہ دینا، معلومات کو فسانے کی شکل دینا اور عوامی غصے یا خوف کو ہوا دینا۔ ان کا کہنا ہے کہ جب میڈیا ''قابل فروخت جذبات'' پر زور دیتا ہے تو جمہوریت discourse کی سطح پر کمزور ہو جاتی ہے۔

آسٹریلیائی صحافی فرینکلن بوب (Franklin Bob) کی Market driven policy کی تھیوری زرد صحافت کے معاشی پہلو پر مبنی ہے۔ اسی لیے انہوں نے اسے بازار میں چلنے والی صحافت کا نام دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ میڈیا ادارے خبر کو ''مارکیٹ پروڈکٹ'' سمجھتے ہیں۔ ناظرین کی پسند کو آزادانہ صحافت پر ترجیح دی جاتی ہے۔ سنسنی خیزی viewership بڑھاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے فروغ دیا جاتا ہے۔

یہ رجحان صرف جدید دور تک محدود نہیں، بلکہ تاریخ میں بھی ایسے ادوار گزرے ہیں جب چند اخبارات نے غیر مصدقہ یا بڑھا چڑھا کر پیش کی گئی خبروں کی بنیاد پر عوامی جذبات کو متاثر کیا، جس کے سنگین نتائج برآمد ہوئے۔ زرد صحافت کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ یہ عوام کے جذبات سے کھیلتی ہے۔ اشتعال انگیز سرخیاں، بڑھا چڑھا کر بیان شدہ واقعات اور جذباتی بیانات لوگوں میں غصہ، خوف، نفرت یا بے چینی پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ رجحان لسانی،

مذہبی، سیاسی یا سماجی بنیادوں پر غلط فہمیاں بھی بڑھا سکتا ہے، جس کے نتیجے میں معاشرتی ہم آہنگی متاثر ہوتی ہے۔ جب عوام روزانہ سنسنی خیز اور غیر مصدقہ مواد کا سامنا کرتے ہیں تو سماجی اعتماد کم ہوتا ہے۔ افواہوں اور غلط بیانیوں، غلط پروپیگنڈے یا مبالغہ آرائی، واقعات کو اصل شکل سے زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کرنے اور سنسنی سرخیاں لگانے اور انہیں جذباتی یا یک طرفہ انداز میں پیش کرنے کی وجہ سے گروہی ٹکراؤ اور غیر ضروری کشیدگی بھی جنم لے سکتی ہے۔

مشہور شخصیات، سیاست دانوں یا سماجی شخصیات کی نجی زندگی کے بارے میں غیر ضروری یا غیر اخلاقی رپورٹنگ سے بھی ان شخصیات کی ساکھ پر منفی اثر پڑتا ہے اور عوام کی نظر میں ان کی وقعت میں بھی کمی آجاتی ہے۔ سنجیدہ صحافت سے انحراف، تحقیق، معتبر ذرائع اور متوازن رپورٹنگ کو پس پشت ڈال کر صرف ایسا مواد پیش کرنا جو ''بکتا'' ہو یقینی طور پر کسی بھی مہذب معاشرے میں مسلمہ صحافتی اصولوں کی خلاف ورزی ہے۔

سنجیدہ صحافت کو نظر انداز کرنے اور زرد صحافت کی راہ اختیار کرنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ یہ سنجیدہ، تحقیقی اور معیاری صحافت کو پس پشت ڈال دیتی ہے۔ اہم قومی مسائل جیسے معاشی صورتحال، صحت، تعلیم، پالیسی سازی، ماحولیاتی چیلنجز کو عوامی توجہ سے دور رکھا جاتا ہے، جبکہ معمولی نوعیت کی خبروں پر غیر ضروری زور دیا جاتا ہے۔ جب میڈیا انسانی ضروریات، سماجی مسائل اور اہم پالیسی جیسے مباحث کی جگہ سنسنی کو اہمیت دینے لگے تو معاشرے کا علمی و فکری معیار گرنے لگتا ہے اور عوام ٹھوس معلومات کے بجائے جذباتی اور سطحی مواد پر انحصار کرنے لگتے ہیں جس کے نتیجے میں صحافیوں کی ساکھ بھی مجروح ہوتی ہے۔ زرد صحافت کی وجہ سے پوری صحافتی برادری پر سوال اٹھنے لگتے ہیں۔ سنجیدہ اور بااصول صحافیوں کی محنت، اعتبار اور تحقیق پر بھی شک ظاہر کیا جانے لگتا ہے، حالانکہ اُن کا زرد صحافت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

جمہوری معاشرے میں میڈیا کا کردار معلومات فراہم کرنا، احتساب کو ممکن بنانا اور عوامی بحث کو صحت مند رخ دینا ہوتا ہے لیکن زرد صحافت اس کردار کو کمزور کرتی ہے کیونکہ یہ حقائق کے بجائے جذباتی اور سطحی معلومات کو فروغ دیتی ہے جبکہ سنجیدہ صحافت عوام میں شعور پیدا کرتی ہے، حکومت اور اداروں کا احتساب کرتی ہے، تحقیق کے ذریعے حقائق تک رسائی فراہم کرتی ہے اور معاشرتی ہم آہنگی کو مضبوط بناتی ہے کیونکہ یہ سچائی، دیانت داری اور ذمہ داری پر مبنی ہوتی ہے۔ زرد صحافت بظاہر تو لوگوں کی توجہ جلد حاصل کر لیتی ہے، لیکن اس کے نتائج نہایت خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ جذبات بھڑکانے، افواہیں پھیلانے، معاشرتی عدم استحکام پیدا کرنے اور سنجیدہ صحافت کو دبانے جیسے اثرات معاشرے کی فکری بنیادوں کو کمزور کرتے ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ میڈیا، صحافی اور قارئین تینوں خبر کو پرکھنے، تحقیق کرنے اور معیاری صحافت کو ترجیح دینے کی طرف قدم بڑھائیں، تاکہ معاشرے میں سچائی، تحقیق اور ذمہ دارانہ اظہار رائے کو فروغ مل سکے۔

دریں صورت ہمارے صحافیوں کو چاہیے کہ وہ ہر صورت حال میں صحافت ومیڈیا سے متعلق قواعد، ضوابط، احکام، اور رہنما اصولوں کی پابندی کریں خواہ ان کا میدان صحافت کوئی بھی ہو جیسے تجزیاتی صحافت، تفتیشی صحافت، خبری صحافت، غیر منافع بخش یا سائنٹفک (دانشورانہ) صحافت، اجتماعی صحافت، پس منظری اجتماعی صحافت، معاشرتی صحافت، عام شہریوں سے متعلق صحافت، نامور شخصیات سے متعلق صحافت، تجارتی و مالیاتی امور سے متعلق صحافت، حساب کاری صحافت، شماریاتی صحافت، انفرادی وتنظیمی صحافت، ماحولیاتی صحافت، فری لانس صحافت، بصارتی صحافت، نشریاتی صحافت، مزاحیہ وظرافتی صحافت، کامکس (قہقہہ آمیز وتمسخر آمیز) صحافت، کھیل کود سے متعلق صحافت، ٹیبلائڈ صحافت، یہاں تک کہ سنسنی خیز صحافت تک میں بھی لکشمن ریکھا کا احترام ضروری ہے۔

قانونی صحافت میں سنسنی خیزی صحافیوں کے لیے بہتر مستقبل کی ضمانت نہیں

قانونی صحافت میں کسی بھی طرح مبالغہ آرائی کی گنجائش نہیں۔ اقسام صحافت میں قانونی صحافت اور صحافیوں کو دیسی زبانوں میں وہ اہمیت نہیں ملی جو ملنی چاہئے تھی جبکہ قانونی صحافت کی اہمیت کا اندازہ درج ذیل حقائق سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

قانون اور صحافت کا باہمی تعلق

قانون اور صحافت ایک دوسرے سے نہایت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ کوئی بھی شخص، خواہ وہ عمومی صحافت سے وابستہ ہو یا قانونی صحافت سے، اُس وقت تک مکمل پیشہ ور صحافی نہیں بن سکتا جب تک کہ اسے قانون، بین الاقوامی معاہدات، کنونشنز، میثاق اور اسی نوعیت کے دیگر قانونی دستاویزات کا عملی علم نہ ہو۔ قانونی صحافیوں کی خدمات کو خاص طور پر مختلف صورتوں میں استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً:

فیچر رائٹر کے طور پر قانونی موضوعات پر مضامین لکھنے کے لیے ویب رائٹرز اور بلاگرز کے طور پر آن لائن پلیٹ فارمز کے لیے تحقیقی اور معلوماتی مواد تیار کرنے کے لیے قانونی رپورٹرز، تجزیہ کار اور نمائندوں کے طور پر، کارپوریٹ رائٹرز کے طور پر، بریف میمورنڈم، کاروباری مواد، پریس ریلیز، بروشرز، لیف لیٹس، نیوز لیٹر، پروفائلز اور مختلف قانونی دستاویزات تیار کرنے کے لیے اور تجارتی و قانونی معاملات کا تجزیہ کر کے آن لائن قانونی معلومات فراہم کرنے کے لیے۔

ایک زمانے میں قانونی صحافت کو صحافت کا ایک غیر دریافت شدہ یا ثانوی شعبہ سمجھا جاتا تھا، لیکن عمومی شرح خواندگی، قانونی آگاہی، حقوق کے شعور اور سول سوسائٹی کی بڑھتی ہوئی شمولیت نے اس شعبے کو نئی رفتار بخشی ہے۔ اب یہ شعبہ ترقی یافتہ ہی نہیں بلکہ ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک میں بھی عالمی روابط، لبرلائزیشن اور گلوبلائزیشن کے سبب مضبوط ہو چکا ہے۔ آج نجی اور سرکاری دونوں شعبوں میں قانونی صحافیوں کے لیے وسیع مواقع موجود ہیں۔

ملازمت کے مواقع

قانونی ایڈیٹرز

قانونی اہلیت رکھنے والے اور زبان پر مضبوط گرفت رکھنے والے افراد، مختلف ہندوستانی و بین الاقوامی جرائد، اخبارات اور میڈیا اداروں میں ابتدا میں جونیئر سطح پر شامل ہو سکتے ہیں۔ قانونی ایڈیٹرز کے لیے زبان پر عبور، سادہ اور مختصر طرز بیان اور دباؤ میں کام کرنے کی صلاحیت ضروری خصوصیات ہیں۔

قانونی صحافیوں کو ہمیشہ باخبر، چوکس اور حالات پر نظر رکھنی چاہیے۔ تنہائی پسند مزاج اس شعبے میں کارگر و کامیاب نہیں ہوتا۔ جونیئر سطح سے آغاز کر کے بڑے میڈیا اداروں میں چیف ایڈیٹر تک پہنچنا ممکن ہے۔

ہندوستان میں اہم قانونی جرائد / رپورٹس

* الہ آباد لا جرنل * کلکتہ لا جرنل * دہلی لا ٹائمز *

کشمیر لا جرنل* کیرالہ لا جرنل* مدراس لا جرنل* مدھیہ پردیش لا جرنل* پٹنہ لا جرنل،* آربیٹریشن جرنل* کمپنی لا جرنل* سول اینڈ ملٹری لا جرنل* انکم ٹیکس جرنل* ایکسائز اینڈ لا ٹائمز* سروس لا رپورٹر* سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ جرائد* سپریم کورٹ جرنل

* آل انڈیا رپورٹر سپریم کورٹ ویکلی اور مختلف ہائی کورٹس کے جرائد* آل انڈیا رپورٹر (A.I.R) *ججمنٹ ٹوڈے،*انڈین لا رپورٹر* (ILR) سپریم کورٹ کیسز* (S.C.C) اسکیل* سپریم کورٹ رپورٹس (S.C.R)، وچیہ نیایالیہ پتریکا، اچتر نیایالیہ پتریکا۔

مرکزی وریاستی حکومتوں، یونیورسٹیوں اور دیگر اداروں میں مواقع

مرکزی وزارتِ قانون و انصاف مختلف قوانین، قواعد اور قانونی کتب کی طباعت کے لیے ایڈیٹنگ اور پبلشنگ اسٹاف رکھتی ہے۔ اس میں پروف ریڈرز، ایڈیٹنگ اسسٹنٹس، سب ایڈیٹرز، اسسٹنٹ ایڈیٹرز، ایڈیٹرز اور چیف ایڈیٹرز شامل ہیں۔ ریاستی حکومتوں کے قانونی محکمے اور تمام سرکاری ادارے بھی قانونی دستاویزات کی تیاری کے لیے ایسے ماہرین کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ وزارتِ خارجہ میں بھی معاہدوں اور بین الاقوامی دستاویزات کے ترجمے اور ایڈیٹنگ کے لیے ماہرین درکار ہوتے ہیں۔

قانونی رپورٹنگ / سپریم کورٹ میں ایکریڈیشن

اخبارات، نیوز ایجنسیوں، کارپوریٹ پبلشرز وغیرہ کو قانونی رپورٹرز کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ایک منافع بخش شعبہ ہے لیکن اس میں فوری ردِعمل، مستعدی اور ہمیشہ دستیاب رہنے کی صلاحیت لازم ہے۔ معمولی تاخیر بھی ادارے کی ساکھ کو متاثر کرسکتی ہے۔ سپریم کورٹ آف انڈیا نے قانونی نامہ نگاروں کی منظوری کے لیے کچھ ضوابط مقرر کیے ہیں جیسے قانون کی ڈگری، کسی قومی یا بین الاقوامی ادارے میں عدالتوں کی رپورٹنگ کا کم ازکم سات سالہ تجربہ۔ الیکٹرانک میڈیا کے لیے بھی یہی معیار لاگو ہوتا ہے۔ تاہم چند شرائط کے ساتھ عارضی ایکریڈیشن بھی دی جاسکتی ہے۔

فری لانس صحافی

ہندوستانی اور بین الاقوامی ادارے فری لانس قانونی صحافیوں کی خدمات بھی لیتے ہیں۔ بعض قانونی ایڈیٹرز چھوٹے میڈیا اداروں سے آگے بڑھ کر نہ صرف بڑی عالمی تنظیموں میں پہنچے بلکہ اقوامِ متحدہ کے اہم شعبوں میں بھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے اداروں میں اعلانات، معاہدات، کنونشنز اور بین الاقوامی دستاویزات کی تیاری کے دوران قانونی ایڈیٹنگ ایک بنیادی حصہ ہوتی ہے۔

آؤٹ سورسڈ لیگل ایڈیٹنگ اور پروف ریڈنگ

بین الاقوامی ایجنسیاں قانونی مواد کی درستگی، معیار، زبان اور عالمی تقاضوں سے مطابقت کے لیے ماہر قانونی ایڈیٹرز کی خدمات حاصل کرتی ہیں۔ ایسے ماہرین کمپنی کی دستاویزات، معاہدات، پیٹنٹس، ٹریڈ مارکس، کاپی رائٹ وغیرہ کی ایڈیٹنگ کرتے ہیں۔

پروف ریڈنگ چیک لسٹ

ٹائپ یا کمپوزنگ کی غلطیاں، رموزِ اوقاف اور گرامر، طویل جملے،

کوٹیشن مارکس کی درستی، متن میں قواعد کی غلطیاں، جملوں کی ساخت، املا تحریر کا اسٹرکچر اور موضوع، پیشکش اور اندازِ بیان

میڈیا میں قانونی صحافیوں کی ضرورت

پرنٹ، الیکٹرانک اور دیگر تمام میڈیا پلیٹ فارمز کو قانونی ماہرین کی ضرورت ہوتی ہے۔ صرف ایڈیٹر ہی نہیں بلکہ میزبان، اینکر، رپورٹر اور انٹرویو لینے والے بھی قانونی پس منظر کے بغیر اپنا کام مؤثر طور پر انجام نہیں دے سکتے۔ صحیح قانونی فہم کے بغیر کوئی بھی شخص مکمل پیشہ ور قانونی صحافی نہیں بن سکتا۔

کورسز

بھارت میں کئی سرکاری و نجی ادارے صحافت، ماس کمیونیکیشن، میڈیا اسکرپٹنگ اور متعلقہ شعبوں میں ڈگری و تحقیقاتی پروگرام چلا رہے ہیں۔ تاہم ہماری معلومات کے مطابق قانونی صحافت کا کوئی مخصوص کورس ابھی تک موجود نہیں ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ قانون کی تعلیم میں قانونی زبان پڑھائی جاتی ہے اور صحافت کے بڑے اداروں میں قانونی رپورٹنگ کے بنیادی اصولوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔

چند معروف صحافت کی تعلیم دینے والے ادارے

* تمام UGC سے منظور شدہ یونیورسٹیاں اور سرکاری و نجی ادارے
* انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونیکیشن (IIMC)، نئی دہلی
* اے جے کے ماس کمیونیکیشن ریسرچ سینٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ
* سمبیوسس انسٹی ٹیوٹ آف میڈیا اینڈ کمیونیکیشن، پونے
* بھارتیہ ودیا بھون میڈیا انسٹی ٹیوٹس
* ٹائمز اسکول آف جرنلزم، نئی دہلی وغیرہ۔

قانونی صحافیوں کے لیے مشاہرہ/تنخواہ

مشاہرہ/تنخواہ اس بات پر منحصر ہے کہ قانونی صحافی کس شعبے و ادارے کا انتخاب کرتا ہے۔ اگر ملازمت سرکاری ادارے میں ہو تو تنخواہ سرکاری قواعد کے تحت ہوتی ہے، اور وہ چالیس ہزار روپے سے لے کر ایک لاکھ روپے یا اس سے زیادہ تک ہوسکتی ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں اور کیمپس سلیکشن کے ذریعے سالانہ تین سے چار لاکھ تک کے پیکج بھی دیتی ہیں۔ فری لانس صحافیوں کو ابتدا میں محنت کرنی ہوتی ہے، لیکن وقت کے ساتھ آمدنی کے وسیع مواقع پیدا ہوتے ہیں۔

اہم انتباہ

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ صحافی صرف سچ جاننے کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ انہیں پیشہ ورانہ اخلاقیات کے ضابطوں کی پابندی بھی کرنی پڑتی ہے۔ ہندوستان میں صحافیوں پر پریس کونسل آف انڈیا اور دیگر اداروں کے مقررہ ضابطے لاگو ہوتے ہیں۔ دیانت داری، پیشہ ورانہ ساکھ اور ایمانداری ہی ایک صحافی کی اصل پونجی ہے۔ لہٰذا قانونی صحافت میں صرف وہی شخص قدم رکھے جو اس شعبے کے لیے حقیقی جذبہ رکھتا ہو۔

■

Khwaja Abdul Muntaqim
H-3 Dharma Aptt. 2-1. P.Extn.
Delhi-110092

معصوم مرادآبادی

پروفیسر دیوان حنان خاں کی یاد میں

پروفیسر دیوان حنان خاں نے جس خاموشی اور گوشہ نشینی کے ساتھ زندگی بسر کی، وہ اسی خاموشی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوگئے۔ یہ خاموشی اتنی مہیب تھی کہ ان کے انتقال کی ایک سطری خبر بھی کسی اخبار میں جگہ نہ پاسکی۔ ان کے شناساؤں کو یہ اندوہناک خبر سوشل میڈیا سے ملی اور وہیں دفن بھی ہوگئی۔ دیوان حنان خاں کووڈ کے زمانے سے صاحب فراش تھے اور بیرونی دنیا سے ان کا رابطہ منقطع تھا۔ کچھ خاص لوگ ہی ان کی خبر گیری کرتے تھے۔ یوں بھی وہ محفلوں سے دور اپنے کام دھام میں مگن رہنے والے انسان تھے اور انھیں دنیاوی چکا چوند سے کوئی دلچسپی اور لگاؤ نہیں تھا۔ جو لوگ صحیح معنوں میں علم کے دلدادہ ہوتے ہیں ان کی زندگی کا سفر یوں ہی تمام ہوتا ہے۔ علم وادب کی خدمت کے بعد دیوان حنان خاں کا دوسرا شوق اپنے دوستوں اور شناساؤں کے کام آنا تھا۔ سچ پوچھیے تو وہ اسی شوق میں زندگی کی جنگ ہار گئے۔ مگر اس کا ذکر ذرا بعد میں آئے گا، پہلے دیوان حنان خاں کی خوبیوں اور کارناموں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

دیوان حنان خاں این سی ای آر ٹی کے شعبہ لسانیات میں ایک ہردلعزیز پروفیسر تھے۔ ان کی پہچان جہاں ان کی علمی لیاقت اور بردباری کی وجہ سے تھی، وہیں لوگ انھیں ان کی انسانی خوبیوں کی وجہ سے بھی یاد رکھیں گے۔ وہ ایک فرض شناس، بااخلاق، ملنسار اور وقت کے پابند انسان تھے۔ ان میں انسان دوستی اور خلوص کا جذبہ سب سے بڑھ کر تھا۔ دیوان حنان خاں کی پیدائش ریاست بہار کے ضلع کیمور (بھبھوا) کے ایک گاؤں بیور میں ہوئی تھی اور وہیں 27/نومبر 2025 کو انھیں سپرد خاک بھی کیا گیا۔ انھوں نے اپنے فیس بک پیج پر اپنی تاریخ پیدائش یکم جنوری 1965 درج کی ہے۔ این سی ای آر ٹی کی ویب سائٹ پر جہاں وہ بطور پروفیسر برسرکار تھے، ان کے ریٹائرمنٹ کی تاریخ 31/ دسمبر 2029 درج ہے۔ یعنی ابھی ان کی سبکدوشی کو چار سال باقی تھے، مگر وہ اس سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہوگئے۔ بلاشبہ یہ دنیا سرائے فانی ہے اور ہم سب کو اسی جگہ چلے جانا ہے جہاں دیوان حنان خاں گئے ہیں۔ اپنے گاؤں

> ”دیوان حنان خاں این سی ای آرٹی کے شعبہ لسانیات میں ایک ہردلعزیز پروفیسر تھے۔ ان کی پہچان جہاں ان کی علمی لیاقت اور بردباری کی وجہ سے تھی، وہیں لوگ انھیں ان کی انسانی خوبیوں کی وجہ سے بھی یاد رکھیں گے۔“

میں ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد انھوں نے یوپی کا رخ کیا اور یہاں کے بنارس اور غازی پور اضلاع میں کئی برس بسلسلہ تعلیم قیام کیا۔ عام طور پر لوگ انھیں اترپردیش ہی کا باشندہ تصور کرتے تھے، کیونکہ ان کی گفتگو میں بہار کا رنگ نہیں تھا۔ دیوان حنان خاں کا تعلیمی کیریئر نہایت شاندار رہا۔ انھوں نے ایم اے، ایم فل، بی ایڈ اور پی ایچ ڈی کے علاوہ ماس میڈیا میں ڈپلومہ بھی کیا تھا۔

دیوان حنان خاں نے پی ایچ ڈی جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر نصیر احمد خاں کی نگرانی میں کی تھی اور ان کی پی ایچ ڈی کا موضوع ''نیرنگ خیال کا موضوعاتی اشاریہ'' تیار کرنا تھا۔ انھوں نے بیسویں صدی کے ایک اہم جریدے کا اشاریہ بڑی محنت اور لگن کے ساتھ مرتب کیا۔ دراصل یہی وہ اشاریہ تھا جس کے توسط سے علمی اور ادبی حلقوں میں ان کا تعارف ہوا۔ میں بھی اسی اشاریہ کے ذریعہ ان سے متعارف ہوا، جو ان کی زندگی کے آخری دنوں میں مجھ تک پہنچا۔ یہ میری لاعلمی تھی کہ میں ایسے مخلص اور بے لوث انسان کو اس کی زندگی میں نہیں جان سکا۔ ''نیرنگ خیال کا موضوعاتی اشاریہ'' تیار کرنے کے علاوہ انھوں نے پروفیسر عبدالقوی دسنوی کا مونوگراف بھی لکھا تھا، جسے 2017 میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا۔ قومی اردو کونسل کے ماہنامہ جریدے ''اردو دنیا'' میں بھی ان کے کئی مضامین شائع ہوئے۔ دیوان حنان خاں کا خاص میدان لسانیات تھا اور انھوں نے اس میں کئی اہم کام کیے۔ ان کی پانچ کتابیں شائع ہوکر

منظر عام پر آئیں جبکہ دو غیر مطبوعہ ہیں۔ این سی ای آر ٹی کے رکن اور رابطہ کار کے طور پر انھوں نے جو کام کیے ان میں 'اردو کی پانچویں کتاب' برائے درجہ پنجم کے علاوہ درجہ چھ، سات اور آٹھ کے لیے 'باغ اردو' اور ابتدائی درجات کے لیے 'ابتدائی اردو' شامل ہیں ۔اس کے علاوہ درجہ آٹھ کے لیے 'دور پاس' اور درجہ نہم کے لیے 'سب رنگ' شامل ہیں۔ انھوں نے اردو اساتذہ کے لیے 'رہنما کتاب'، ''اردو قواعد اور انشاء''، ''اردو زبان وادب کی تاریخ'' کے علاوہ مختلف ذیلی اور اعلیٰ درجات کے لیے جو کتابیں مرتب کیں ان میں 'بڑھتے قدم'، ''اردو تدریسیات''، ''تخلیقی جوہر''، 'ہمارے تمہارے افسانے'، ''شمولیاتی تعلیم'' اور 'ریاضی کی تدریسیات' شامل ہیں۔ان کے کاموں میں ''نیرنگ خیال کا موضوعاتی اشاریہ' تیار کرنا ہی سب سے اہم ہے۔مگر اس کا تعارف اور ان تک میری رسائی کی داستان ذرا آگے چل کر آئے گی ۔ پہلے ''عبدالقوی دسنوی'' پر ان کے مونوگراف کا ذکر کرتے ہیں ۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی طویل اور اہم علمی، ادبی وتدریسی خدمات محتاج تعارف نہیں ہیں ۔ ان کا شمار ایک اچھے انسان، کامیاب استاد، نامور محقق، ناقد، اشاریہ ساز، ادیب اور اردو کے عاشقوں میں ہوتا ہے ۔انھوں نے غالبیات، اقبالیات، بھوپالیات، اشاریہ سازی اور مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق کئی وقیع تحقیقی وتنقیدی مقالات اور تصانیف یادگار چھوڑی ہیں ۔ دیوان حنان خاں نے اس مونوگراف میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی شخصیت اور سوانح ، ان کے ادبی وتخلیقی سفر اور تصانیف کا جائزہ لینے کے علاوہ تنقیدی محاکمہ اور ان کی تحریروں کا جامع انتخاب شامل اشاعت کیا ہے۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی شخصیت اور علمی وادبی خدمات سے متعلق یہ مونوگراف قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے خصوصی منصوبے کے تحت شائع کیا گیا، جس میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی شخصیت اور سوانحی حالات، ان کی تصنیفات اور تالیفات کا تنقیدی جائزہ، ان کی علمی، ادبی، تدریسی خدمات کا محاکمہ اور ان کی تحریروں کا جامع انتخاب شامل ہے۔

اب آیئے دیوان حنان خاں کے سب سے اہم کام کی طرف چلتے ہیں جس کا ذکر شروع میں کیا گیا ہے۔یعنی ''نیرنگ خیال کا موضوعاتی اشاریہ'' کی تیاری کی طرف۔

اس اشاریہ تک راقم الحروف کے پہنچنے کی داستان بھی کم دلچسپ نہیں ہے۔اس سے پہلے دیوان حنان خاں سے میری کوئی شناسائی نہیں تھی ۔ نہ ہی میں ان کے نام اور کام سے واقف تھا۔ایک روز میرے کرم فرما اور 'علم وکتاب' چینل کے روح رواں عبدالمتین منیری صاحب کا دبئی سے فون آیا۔انھیں کہیں سے یہ اطلاع ملی تھی کہ آزادی سے قبل لاہور سے شائع ہونے والے مجلّہ 'نیرنگ خیال' کا اشاریہ ہندوستان کے ایک محقق نے تیار کیا ہے۔

بڑی کوششوں کے بعد آخرکار ''نیرنگ خیال کے موضوعاتی اشاریہ'' تک میری رسائی ہوئی۔ میں نے اسے منگوایا اور دو کتابیں منیری صاحب کو پوسٹ کردیں۔ ابھی دو روز بھی نہیں ہوئے تھے کہ دیوان حنان خاں کے انتقال پر ملال کی خبر ملی اور میں دھک سے رہ گیا۔ بلاشبہ وہ ایک مخلص اور خداترس انسان تھے ۔ بیماروں اور ضرورت مندوں کی مدد کرنا ان کا شوق تھا۔ ماہر جمالیات پروفیسر شکیل الرحمٰن کا گڑگاؤں میں انتقال ہوا تو ان کی تجہیز وتکفین بھی دیوان صاحب نے ہی کروائی تھی۔

دیوان حنان خاں نے پروفیسر عبدالقوی دسنوی پر اپنے مونوگراف میں اُن کی شخصیت اور سوانح، ان کے ادبی وتخلیقی سفر اور تصانیف کا جائزہ لینے کے علاوہ تنقیدی محاکمہ اور ان کی تحریروں کا جامع انتخاب شامل اشاعت کیا ہے۔

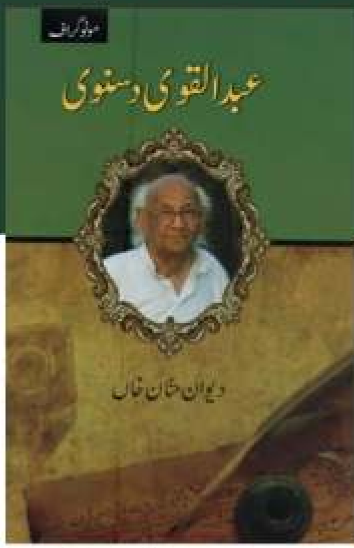

بلاشبہ دیوان حنان خاں کا سب سے اہم کارنامہ ''نیرنگ خیال کا موضوعاتی اشاریہ'' ہے۔''نیرنگ خیال'' کی اشاعت جولائی 1924 میں لاہور سے شروع ہوئی تھی ۔ یہ مجلّہ اپنے مضامین ، مواد اور حسن طباعت کی وجہ سے اس دور کے دیگر مجلّات میں بہت ممتاز تھا ۔ اس کے خاص نمبر خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ عام طور پر لوگ ''نقوش'' کے خاص نمبروں کا ذکر کرتے ہیں، لیکن مطالعہ کے شوقین حضرات کے لیے ''نیرنگ خیال'' خاصے کی چیز ہے۔ بہرحال میں ان دونوں جرائد کا مداح ہوں جنھوں نے اردو کی ادبی صحافت میں کئی سنگ میل قائم کیے۔''نیرنگ خیال'' کا اجرا حکیم محمد یوسف حسن نے کیا تھا ۔ یہ جریدہ اپنے موضوعات اور مشمولات کی وجہ سے بہت مقبول ہوا ۔ اس میں سوانح، شخصیات کے علاوہ دیگر شعری اور نثری تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ اس کی جن خصوصی اشاعتوں سے قارئین کو نئی جہتوں اور زاویوں کا علم ہوا، ان میں 'مختصر افسانہ نمبر'، 'چینی افسانہ نمبر'، 'ماہیا نمبر' اور 'ایڈیٹر نمبر' شامل ہیں ۔ نیرنگ خیال کا ایک شمارہ جون 1932 میں 'نگارش لطیف' کے نام سے شائع ہوا تھا، جو خواتین قلم کاروں پر مشتمل تھا۔ یہ واحد رسالہ تھا جس نے علامہ اقبال کی زندگی میں ہی 1932 میں 'اقبال نمبر' شائع کیا تھا، جسے بعد میں ''نقوش'' نے جوں کا توں شائع کیا۔دیوان حنان خاں نے بڑی محنت سے ''نیرنگ خیال کا موضوعاتی اشاریہ'' کے عنوان سے کتاب مرتب کی جو 2007 میں شائع ہوئی تھی۔

یہ اشاریہ 1924 تا 1947 کے شماروں پر مشتمل ہے۔عبدالمتین منیری صاحب کا خیال ہے کہ ''اگر نیرنگ خیال کے شمارے اکٹھے کیے جائیں تو دیوان حنان خاں کا یہ اکلوتا علمی کارنامہ تادیر انھیں یاد رکھنے کا باعث بنے گا۔دیوان حنان خاں نے 26 نومبر 2025 بروز بدھ کو دہلی سے متصل نوئیڈا کے میٹرو اسپتال میں صبح گیارہ بجے وفات پائی اور اگلے روز بہار میں ضلع کیمور (بھبھوا) کے بیور نامی مقام پر ان کی تدفین عمل میں آئی۔

■

Masoom Moradabadi
Editor-Jadid khabar Daily
Z-103, Taj Enclave,Geeta Colony,
Delhi-110031
Mob. 9810780563
masoom.moradabadi@gmail.com

محمد ارشاد عالم

مظہر الزماں خاں سے انٹرویو

مظہر الزماں خاں اردو کہانی کا ایک اہم نام ہے۔ وہ جدیدیت سے متاثر رہے اور انہوں نے کہانیوں میں کچھ ایسے تجربے کیے جو انہیں سے مخصوص ہیں۔ خاص طور پر انہوں نے جن علامات اور اشارات کو اپنی کہانیوں میں برتا ہے ان کی تفہیم بہتوں کے لیے مشکل ہے۔ ان کی کہانیوں کے عنوانات بھی الگ ہوتے ہیں۔ جیسے 'دستکوں کا ہتھیلیوں سے نکل جانا'، شوریدہ زمین پر دم بخود شجر'۔ ان کی کہانیاں دراصل صدیوں کے وقوعات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہوتی ہیں۔ وہ تلمیحی انداز میں ان تمام واردات کو کہانیوں میں پیش کرتے ہیں جو انسانی وجود سے جڑی ہوئی ہیں۔ مظہرالزماں خاں نے اس انٹرویو میں اپنی زندگی اور ادب کے مسائل و متعلقات کے حوالے سے گفتگو کی ہے اور جدیدیت و جدید افسانے میں کیے گئے تجربوں کے حوالے سے معنی خیز اشارے کیے ہیں۔ پیش ہے ان سے ایک انٹرویو۔

محمد ارشاد عالم: جیسے ہر کسی کے انٹرویو میں ہمیشہ ایک عام اور تقریباً پہلا سوال یہی ہوتا ہے کہ آپ پیدا کب ہوئے۔ چنانچہ میرا بھی پہلا سوال آپ سے یہی ہے، چونکہ میں نے آپ کے ہند و پاک میں لیے گئے کچھ انٹرویوز پڑھے ہیں جس میں آپ نے دوسروں سے ہٹ کر جواب دیے ہیں۔ لہٰذا میں بھی اس جدت پسندی کو جیسے کہ آپ کی تقریباً ہر کہانی میں ایک انفرادیت نظر آتی ہے جو کسی اور افسانہ نگار، کہانی نگار یا پھر ڈرامہ نگار میں مجھے نظر نہیں آتی ہے یا پھر یوں کہوں کہ اس معاملہ میں آپ بالکل منفرد ہیں جس کا تذکرہ اکثر ناقدین نے بھی کیا ہے، اس معاملے میں آپ کے اظہار کا میں متمنی ہوں؟

محمد مظہرالزماں خاں: اب میں اس تعلق سے کیا عرض کروں کہ کئی موسم لد چکے ہیں، کئی کیلینڈر پھٹ چکے ہیں، دنیا کئی الٹی سیدھی کروٹیں لے چکی ہے، کئی پھل اور موسم اپنی اپنی لذت کھو چکے ہیں، آدمی گم ہو گئے، یادیں پیلی پڑ چکی ہیں، آدمی اجنبی ہو چکے ہیں، خود سے ناواقف بن گئے ہیں، خود کی پہچان کھو چکے ہیں۔ حافظے چھن چکے ہیں، علم اٹھا لیا گیا ہے، وقت ریس کے گھوڑوں کی دوڑ دوڑ رہا ہے۔ علم کے اٹھا لینے سے مراد یہاں میری یہ ہے کہ چونکہ میں نے اس پر ایک مختصر نظم بھی لکھی ہے وہ یوں ہے کہ...... قیامت کے قریب...... علم اٹھا لیا جائے گا اور علم اٹھا لیا گیا ہے...... اور سب کے سب اپنے اپنے گھروں سے نکال کر کتابوں (علم سے مراد) کو...... اور ہاتھوں میں اپنے تھام کر موبائل کو... صم بکم... بیٹھ گئے ہیں۔ تمام خوشبودار تہذیبیں جل کر راکھ ہو چکی ہیں۔ اپنے قائدین اور رہنما کو چننے کی صلاحیتیں ختم ہو چکی ہیں کہ سبھوں کے حافظے جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے کہ چھین لیے گئے ہیں اور ان کا چھن جانا آدمیوں کی نیتوں پر منحصر کرتا ہے اور نیتوں کو جاننے اور دیکھنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے کیونکہ دنیا میں کوئی ایسا 'آلہ' یا پھر 'عدسہ' بن ہی سکا اور نہ کبھی بن سکے گا جو آدمی کی نیت اور ارادے کو دیکھ سکے۔ یہاں مجھے پھر اپنی ایک نظم (نثری) یاد آ رہی ہے۔ بہر حال اس دور بلا خیز میں چھوٹی چھوٹی کنکریں اوپر جا رہی ہیں اور پہاڑ پر سے بڑے بڑے پتھر لڑھک لڑھک کر نیچے آ رہے ہیں۔ جانور میک اپ کرنے لگے ہیں...... آگے کیا کہوں۔ اب رہا وہی گھسا پٹا سوال کہ پیدائش کیا ہے؟ تو عرض کرتا چلوں۔ آج کی مسخ شدہ تاریخ اور ٹکڑے ٹکڑے جغرافیے سے پہلے 17 اپریل 1950 کو پیدا ہو گیا ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ میری پیدائش کے وقت آفتاب نکل گیا تھا...... ہوائیں ٹھنڈی ٹھنڈی تھیں۔ ہلکی ہلکی جھم جھم بارش کے ساتھ دھوپ بھی نکلی ہوئی تھی...... اس رات کو پورا چاند تھا۔ اب یہ کہاں تک درست ہے مجھے معلوم نہیں کہ افسانے ہر طرح کے لکھے جا سکتے ہیں۔ بہر حال آج اور کل میں بہت بڑا فرق ہے۔ آج کا کوئی چہرہ ہی نہیں ہے۔ کل کا کم از کم کچھ تو چہرہ تھا، کچھ لباس تھا، غذاؤں میں کچھ لذت تھی، زبانیں ذائقوں کو پہچانتی تھیں۔

م ا ع: سنا ہے کہ آپ نے بہت سے لکھنے والوں کی کہانیوں کو بھی ٹھیک کیا ہے؟

م ز خ: آپ کے اس سوال کا جواب میں کیا دوں۔ یہ تو وہی لوگ جانتے ہیں جو اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے سوٹ بوٹ پہن کر پیش آتے یا ہوتے تھے۔ لیکن اب ایسا نہیں ہے کہ میں اب کہیں جانے آنے کے قابل نہیں ہوں۔ البتہ زبان سے فون پر یعنی موبائل پر جو جمشید کا پیالہ بن کر رہ گیا ہے، کہہ دیتا ہوں، بیان

کرتا ہوں۔ اب بینائی بھی کمزور ہوگئی ہے۔ آپ کے اس سوال کا جواب بھی تفصیل سے دیا جاسکتا تھا۔ لیکن اس کی وجہ سے بہت سے چہرے جو اب ہنوز نقاب پہنے ہوئے ہیں، بے نقاب ہوجائیں گے۔ ویسے اب باقی نہیں رہا۔ بے کار ہے کچھ کہنا۔ علامہ اقبال کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔

یہ تو نے کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کردیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینہ کائنات میں

م ا ع : اب تک آپ کی کتنی کہانیاں چھپ چکی ہیں اور کتنی کتابیں؟ کیا ان میں ایسی کہانیاں بھی ہیں جو آپ کی شائع شدہ کتابوں میں شائع یا شامل نہ ہوسکیں؟

م ز خ: جی۔ بہت سی کہانیاں... کچھ ٹھیک بھی... اور بہت کچھ خراب بھی، ان کے جو نام اس وقت مجھے یاد آرہے ہیں میں بتادیتا ہوں:

گم شدہ دستک (مطبوعہ اوراق پاکستان)
خوف زادے (مطبوعہ شاعر ممبئی)
رولر کے نیچے (مطبوعہ پاکستان)
میں اور وہ (تحریک دہلی)
روشنائی کا دریا (فلمی تصویر حیدرآباد)

م ا ع : آپ نے کہاں تک تعلیم حاصل کی؟

م ز خ: حلف... ایک ادارہ تھا۔ مجھے ممبر بناتے وقت یہ سوال کیا گیا تھا۔ میں نے جواب دیا تھا۔ غالب کی طرح بے سند یافتہ ہوں۔ اور یہی جواب ایک انٹرویو میں بھی موجود ہے۔

م ا ع : میں نے محترمہ ہاجرہ کی کتاب 'مظہر الزماں خاں جدیدیت کا امام' پڑھا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے۔ حیدرآباد کے ایک جدید افسانہ نگار کے افسانوں کو آپ ٹھیک کرتے تھے۔ ان کی خواہش جدیدیت کے مشہور پرچہ میں چھپنے کی تھی، کہاں تک سچ ہے؟

م ز خ: اب ان باتوں سے کیا فائدہ؟ جو لوگ جانتے، وہ جانتے ہیں یا تھے کہ جب ان کی کہانی اس جدید ادب کے جدید ترین پرچہ میں چھپ گئی تو اس کے مدیر محترم ادیب...... کے وہ کیسے قریب ہوگئے تھے۔ خیر چھوڑیئے۔ آپ ایسے سوال مت کیجیے، مہربانی ہوگی۔ فلم ختم ہوچکی ہے۔ دی اینڈ پر کیا کہا جاسکتا ہے۔

م ا ع : آپ پر کیے گئے پی ایچ ڈی کے کتنے مقالہ نگاروں کا آپ نے تعاون کیا؟ کیونکہ آپ کی کہانیاں بہت سے لوگوں کی سمجھ سے باہر ہیں۔

م ز خ: پھر وہی بات پیدا ہوتی ہے۔ ان سوالات سے خواہ مخواہ.. کیا کہیں۔ اور کوئی بات کہیے، عرض کروں کہ کئی لوگ ہیں۔ کیونکہ ضروری نہیں ہے کہ ہر کوئی لکھنے والے کی تحریر سے پوری طرح یا اس کی کہانی اور علامتوں سے واقف ہوجائے یا اس کے اشاروں کو سمجھ جائے یہ مشکل بات ہے۔ کہانی نگار یا شاعر اگر کوئی علامت یا اشارہ اگر اپنی شاعری یا کہانی میں بیان کرتا ہے تو من و عن دوسرا آدمی یا پڑھنے والا اس تک پہنچ جائے۔ یہ ناممکن ہے۔ بہر حال خوابوں کی تعبیریں ہر ایک کی الگ الگ ہوتی ہے۔ اس لیے ہر شخص کو اپنے تعبیر کا حق ہے۔ اس لحاظ سے سب اپنی اپنی سوچ کے مطابق بیان کرتے ہیں۔

م ا ع : آپ نے شاعری بھی کی ہے۔ ڈائری کے اوراق بھی لکھے ہیں۔ کیا ان کو بھی کتابی شکل دینے کا ارادہ ہے۔ کیونکہ اس سے آپ کی فکر الگ الگ طرح سے آپ کے قارئین پر ظاہر ہوگی۔

م ز خ: شاعری کے اعتبار سے بالکل نہیں۔ کیونکہ میں نے چند ایک نثری نظمیں لکھی ہیں۔ لہٰذا ڈائری کے اوراق بہت سے معلم اردو لکھنو کے پرچہ میں چھپ چکے ہیں۔ دوسروں نے پسند بھی کیا، لیکن اس میں مخبتیں ابھی پیدا ہورہی تھیں۔ لہٰذا میں نے سب ضائع کردیں۔ البتہ اب مذہبی قسم کی چیزیں لکھنے کی کوشش کررہا ہوں دیکھیں۔ اللہ مالک ہے۔

م ا ع : میں نے سنا ہے آپ نے کچھ لوگوں کو یوں ہی قسم کے افسانے بھی لکھ کردیے ہیں؟

م ز خ: ہوں کہوں یا پھر ہاں کہوں، کیا کہوں۔ موسم خراب ہوگئے ہیں۔ بارشوں کے بجائے دھوپ اور سردیوں میں گرمیاں ہورہی ہیں۔

م ا ع : آپ کی تقریباً کہانیوں میں اقوال زرین موجود ہیں بقول پروفیسر غفور شاہ قاسم، کیا آپ کچھ پیش کرسکتے ہیں۔ تاکہ قارئین لطف کے ساتھ ذہنی طور پر بھی روشنی حاصل کرسکیں۔

م ز خ: خوابوں کے / گہرے سمندر میں
صدف صدیوں سے تھا غلطاں
کہ معاً/ایک بوند ٹپکے
ابرنسیاں کی

(شوریدہ زمین پر دم بخود شجر، ص 90)

م ا ع : اس عہد کے بارے میں کچھ فرمائیں:

م ز خ: میں اپنی تقریباً سبھی کہانیوں میں اپنی اقدار، اپنے عہد، انسان، آدمی، جانور، درخت، پرندے چرندے سب کے بارے میں میں بیان کرچکا ہوں۔ تاہم میری ایک مختصر نظم جو میرے کسی ناول میں موجود ہے۔ جس پر بہت سے ناقدین نے ناول کے ساتھ اس نظم کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ نظم ملاحظہ فرمائیں۔

نہ فاختانہ ہدہد/نہ ہما اور نہ شاہین
بس جھڑ جھڑاتی جھڑاتی ہے
اور کولتار کی اندھی مینا/دانہ دانہ کہتی ہے

بلکہ یہ ایک مربوط نظم ہے۔ اس میں ملوکیت کے دور کے خاتمہ کا اشارہ بھی ہے اور کئی امکانات اس کے اندر پوشیدہ ہیں۔ اس نظم پر ڈاکٹر یوسف شیرازی نے طویل تجزیاتی مضمون لکھا ہے۔

م ا ع : آپ آج کے لکھنے والوں کو کس طرح دیکھ رہے ہیں؟

م ز خ: اب میری آنکھیں خراب ہوگئی ہیں۔ کوئی نظر نہیں آرہا ہے۔ دھندلا دھندلا دکھائی دے رہا ہے۔ ہر منظر آج کل کہر میں ڈوب گیا ہے۔

م ا ع : کہانیوں کے عنوانات:

م ز خ: پانی دریا/رولر کے نیچے
شوریدہ پشتوں کی آماجگاہ
اداس نسل کا آخری سفر
شوریدہ زمین پر دم بخود شجر/خوف زادے

م ا ع : آج کل کی شاعری کے تعلق سے عرض فرمائیں اور کچھ قارئین کے بارے میں؟

م ز خ: پہلے شاعری کے تعلق سے عرض کروں، ملاحظہ فرمائیں۔

آؤ کرکٹ کا لگائیں ایک چوا
ماں ہوا اور باپ......کوا

اب سامعین کا حال، بول جمورے، بجا کر تالیوں کے ساتھ ہلا ہلا کر۔ واہ۔۔ واہ۔۔ واہ

م ا ع: آپ نے اچھے خاصے مزاحیہ مضامین بھی لکھے ہیں، جو چھپ چکے ہیں، ان کے کچھ عنوانات اگر یاد آئیں تو بتادیجیے۔

م ز خ:

پروفیسر پورے صفت (مطبوعہ شگوفہ)
شیم... شیم... شیم (مطبوعہ شگوفہ)
مزاحیہ مضامین (مطبوعہ شگوفہ)

بھگوان کا مشورہ (مطبوعہ شگوفہ)
ایک شام شیطان کے نام (مطبوعہ شگوفہ)
آدم علیہ السلام سے ایک انٹرویو (مطبوعہ شگوفہ)
حکم کے غلام (مطبوعہ شگوفہ)
بڑی خوشی ہے اس ملاپ میں (مطبوعہ شگوفہ)
جھوٹ پھر جھوٹ (واقعات دہلی)
اور بھی کئی ہیں جو ابھی مجھے یاد نہیں آرہے ہیں۔

م ا ع: آپ کے افسانوں میں جو علامتیں اور اشارے ہوتے ہیں، وہ بالکل مختلف اور عام قاری کی سوچ و فکر سے الگ بلکہ بہت زیادہ ہی سوچنے کے باوجود ان کی تعبیرات ہر قاری کے ہر خیال اور نظریے سے الگ معلوم ہوتے ہیں۔ اس تعلق سے آپ قارئین کے لیے اگر رہبری فرمائیں تو بہتر ہوگا؟ مثلاً آپ کی ایک کہانی 'ڈارک روم' جو کتاب 'دستکوں کا ہتھیلیوں سے نکل جانا' میں شامل ہے۔ ایک کہانی 'ایک دن پرندوں کے ساتھ' اس طرح کہانی 'شوریدہ زمین پر دم بخود شجر' وغیرہ وغیرہ؟

م ز خ: کچھ دیر کی خاموشی کے بعد مظہر الزماں خاں نے دھیری آواز میں فرمانا شروع کیا۔ ویسے میری تقریباً سبھی کہانیوں میں بہت سے راز اور بھید پوشیدہ ہیں۔

بہر حال ملاحظہ فرمائیں کہانی 'ڈارک روم' میں کا خیال کچھ یوں ہے کہ یہ دنیا ایک ڈارک روم ہے۔ اس کہانی میں چند دوست جو حاجت کے لیے جاتا ہے، اس کے دوسرے دوست اس کو بھول کر فوٹو اسٹوڈیو بند کر کے چلے جاتے ہیں چنانچہ وہ دوست جسے بھول گئے تھے، پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ بھی فوٹوگرافی سے واقف تھا۔ چپ چاپ مختلف خیالات میں گم ہو جاتا۔ اور پھر ڈارک میں جا کر نیگیٹیو کو پازیٹیو بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن وہ سوائے چند ایک کے کسی کو بھی پازیٹیو بنا نہیں سکتا۔ میں نے اس کہانی میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا میں بہت کم لوگ ہی پازیٹیو ہوتے ہیں۔ یعنی جو اللہ تعالیٰ کے قرب اور اللہ کے حبیب کی چاہت اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور احکام کے پابند ہوتے ہیں وہی پازیٹیو ہوتے ہیں وہی پازیٹیو ہونے یعنی یہ پیغمبروں، اللہ والوں کی طرف اشارہ ہے۔

بہر حال کہانی کا اختتام کچھ یوں ہے اس کئی گھنٹوں میں جو میں اس اسٹوڈیو کے اندر بند تھا، میرے ہاتھ میلے ہوئے، نہ میرے پاؤں میلے ہوئے، نہ میری سوچ میلی ہوئی اور نہ میرا خیال اور نہ زبان میلی ہوئی۔ اور اس عرصہ میں میں نے خود کو دیکھ لیا خود کو حاصل کرلیا اور جب وہ اسٹوڈیو سے نکلتا ہے تو دیکھتا ہے کہ کچھ ایک بڑا سا کیا تولیس خاں ہے اٹھا کر لے جارہے ہیں۔ یعنی یہ دنیا جب بنی تھی، تب بھی خالی تھی اور جب ختم ہو جائے گی، تب بھی خالی ہو جائے گی۔ اس کہانی میں بہت کچھ راز ہیں۔ اس کہانی میں یہ بتانے کی بھی میں نے کوشش کی ہے کہ دنیا میں لوگ روشنی سے ڈرتے ہیں جو ایک اصل اور اٹل حقیقت ہے یعنی رب کائنات۔ اور جو اصل کی طرف حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہی پازیٹیو ہوتے ہیں۔ باقی سب نیگیٹیو یعنی شیطانی قوت کے اسیر۔ اب دوسری کہانی 'پرندوں کے ساتھ' بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ یعنی آدمی گھروں، بازاروں اور منافقین سے چھٹکارا پانے کے لیے ایک باغ میں سارے دن جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور وہ دن وہ رات پرندوں کے ساتھ گزار کر اپنے آپ کو شفاف محسوس کرنے لگتا ہے۔ یعنی دنیا حالات سے مختلف خیالات و افکار سے نجات حاصل کرتا ہے۔ بہت سی باتیں اس کہانی میں بھی پوشیدہ ہیں، لیکن ہمارے خود ساختہ دانشور اور ناقدین جو اتراہٹ کا شکار ہیں اور خود کو بڑے علم والے اور مفکر ظاہر کرتے ہیں، ان کو میری کہانیاں بڑی مشکل نظر آتی ہیں۔ ان کے سر پر سے گزر جاتی ہیں تاہم زعم میں جھومتے رہتے ہیں۔

کہانی 'سفر' تصوف پر لکھی ہوئی ہے۔ اس کی شروعات کچھ اس طرح ہے کہ ایک شخص نیند سے بیدار ہوتا یعنی نیند غفلت کا استعارہ ہے، اور جب وہ بیدار ہوتا ہے تو اس کو اپنے اعمال اپنے بستر کی شکنوں کی شکل میں نظر آتے ہیں یعنی وہ اپنی زندگی میں اپنے اعمال سے غافل رہا۔ اچانک اسے اپنا ہر عمل یاد آتا ہے چنانچہ وہ گھر سے نکل جاتا ہے اس رات کی تلاش میں جسے شب قدر کہا جاتا ہے۔ پھر اس کی ملاقات ایک بزرگ سے ہوتی ہے ان سے وہ کہتا ہے کہ میں شب قدر کی تلاش میں نکلا ہوں تب وہ اسے اپنے اعمال درست کرنے کی ترغیب دیتے ہیں چنانچہ اپنی درستگی کے لیے نکل پڑتا ہے۔ اور پھر وہ بزرگ سے ملنے کے لیے نکل جاتا ہے۔

م ا ع: آپ نے کبھی شاعری بھی کی ہے۔ کیونکہ آپ کی بعض کہانیوں میں کچھ نظمیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔؟

م ز خ: جی کبھی کبھی یہ کوشش کی ہے۔ دوسروں کے لیے زیادہ، اپنے لیے نہیں کے برابر۔ اور پھر شاعری بہت نزاکت چاہتی ہے۔ نئے نئے خیلات کی متحمل ہوتی ہے۔ لیکن آج کل بہت سی شعری محفلوں میں چند ایک کو چھوڑ کر کائیں کائیں کرتے نظر آتے ہیں۔ شاعری میں ہر لفظ کو بہت احتساب اور سوچ سمجھ کر استعمال کرنا چاہئے۔ اب دیکھیے شمس الرحمان فاروقی جیسے معروف نقاد نے بھی شاعری کی ہے۔ انھوں نے مجھے اپنی کتاب "آسمان محراب" دی تھی۔ بہت اچھی شاعری تھی۔ ویسے مجھے شاعری کا ادراک نہیں ہے تاہم بہت پڑھتا ہوں۔ ان کی اس کتاب کا ایک شعر مجھے اس وقت یاد آرہا ہے۔

سوارِ ابلق لیل و نہار دیکھوں گا
میں آنکھیں چیر کے پردے کے پار دیکھوں گا

اگر اس شعر میں آنکھیں چیر کر کہنے کے بجائے آنکھیں موند کر کہتے تو کتنی صوفیانہ بات ہوتی۔ اور یہی شاعری کا کمال ہے۔ نزاکت ہے کہ ایک ایک لفظ کائنات بن جائے اور دیر تک دور تک باقی رہے۔ اس لیے میں کبھی شاعری کی کوشش نہیں کرتا اور کرنا بھی نہیں چاہتا کہ مجھے اس کا علم نہیں ہے اور نہ میں ایسی شاعری کر سکتا ہوں جیسی غالب، اقبال، بیدل وغیرہ نے کی ہے۔ چند ایک نظمیں یوں ہی لکھی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

ہوائیں مشتعل / آدمی پاگل
سارے موسم / الٹے پاؤں
دھوپ ہے نہ چھاؤں / نہ شہر ہے نہ گاؤں
ہر طرف بس جانور ہی جانور
چلو مظہر / چل کر کسی
گنبد میں بیٹھتے ہیں۔

م ا ع: آپ کیسے ماحول میں کہانی لکھتے ہیں یعنی کیسا ماحول آپ کے کہانی لکھنے کی 'آمد' کے لیے سازگار رہتا ہے؟

م ز خ: میں کسی بھی ماحول میں کہانی لکھ لیتا ہوں۔ جب موڈ آتا ہے نزول ہونے لگتا ہے، طبیعت لکھنے کے لیے بے چین ہو جاتی ہے تب لکھنے لگتا ہوں۔ پھر بعد میں اسے ہر طرح سے دیکھتا ہوں کہ پوری ہوئی ہے یا کہیں سے اس میں جھول آیا ہے۔ یہ میرا خیال ہے۔

■

Md. Irshad Alam
Research Scholar
Telangana University
Nizamabad- 503322 (Telangana)
Mob.:8978630112
mdirshadalam1199@gmail.com

مریم صبا

'لالہ رام نرائن لال اگروال'
اور
'رائے صاحب رام دیال اگروالا'
کی خدمات

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہوتی ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم وفنون کا سر چشمہ بھی۔ دیگر زبانوں کی طرح اردو زبان و ادب کے فروغ کا بھی اہم ترین ذریعہ اخبارات ورسائل اور کتب ہی رہی ہیں۔ ناشرین اور ان کے مطابع کو ان کی نشر و اشاعت میں بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے لیکن ان ذرائع کی اہمیت و افادیت کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ محققین عموماً شعرا و ادبا، ادبی و سیاسی تحریکات و رجحانات اور مسائل و تجربات کو اپنا موضوع بناتے رہے ہیں لیکن شعرا و ادبا اور دانشوروں کے تجربات سے ہم کو روشناس کرانے والے ناشرین اور مطابع کو اس قدر اہمیت نہیں دی گئی جس کے وہ حق دار ہیں۔

لالہ رام نرائن لال اگروال اپنے عہد کے ایک معروف پبلشر اور کتب فروش تھے۔ 'رام نرائن لال بک سیلز' کے نام سے کٹرہ روڈ الہ آباد میں واقع ان کی دکان کا قیام منشی نول کشور پریس 1858 کے قیام کے تقریباً 26 برس بعد 1884 میں عمل میں آیا۔ یہاں سے ہندی، اردو، سنسکرت، انگریزی، عربی، فارسی، بنگالی اور نیپالی زبانوں میں کتابیں شائع ہوتی تھیں۔ شائع شدہ کتابوں پر ان کے نام دو مختلف طریقوں سے لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ کہیں پر 'لالہ رام نرائن لعل' اور کہیں پر 'لالہ رام نرائن لال'۔

لالہ رام نرائن لال اگروال سے پہلے ان کے والد دوارکا پرشاد نے کتب فروشی کا کام شروع کیا تھا۔ دوارکا پرشاد اصلاً اٹاوہ کے رہنے والے تھے لیکن 1883 میں ملازمت کی غرض سے اٹاوہ سے الہ آباد منتقل ہو گئے۔ دوارکا پرشاد ایک معلم تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت مدن موہن مالویہ جیسی ہستیوں کو ان سے تلمذ کا شرف حاصل تھا۔ دوارکا پرشاد معلمی کے ساتھ ساتھ کتب فروشی بھی کرتے تھے۔ پروفیسر بھوانی دت اُپریتی اس بابت لکھتے ہیں:

"دوارکا پرشاد کا جنم 1844 میں اٹاوہ میں ہوا تھا۔ وہاں کے ہیوُنس ہائی اسکول میں انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ وہ ایک ذہین طالب علم تھے۔ ہائی اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد 1866 میں معلم کے عہدے پر ان کی تقرری ہوگئی۔ 1883 میں وہ اٹاوہ سے الہٰ آباد منتقل ہو گئے۔ راجکیہ ہائی اسکول الہٰ آباد میں ان کا ٹرانسفر ہوا۔ الہٰ آباد آنے کے بعد یہیں انھوں نے اپنی مستقل رہائش گاہ بنائی۔ وہ 1900 تک درس و تدریس کا کام کرتے رہے اور مدن موہن مالویہ، پنڈت موتی لال نہرو (والد پنڈت جواہر لال نہرو) وغیرہ کو تعلیم دی .... الہٰ آباد آنے کے بعد ان کی توجہ کتاب کے کاروبار کی طرف گئی اور اپنی زندگی میں ہی وہ اس کاروبار کو ترقی کی منزل تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔"[1]

اس طرح لالہ رام نرائن لال اگروال کو کتب فروشی کا کاروبار وراثت میں ملا تھا جسے انھوں نے مزید ترقی اور وسعت دی۔ لالہ رام نرائن لال اگروال نے کتب فروشی کے ساتھ اشاعت وطباعت کا کام بھی شروع کیا۔ اس خاندان کے ایک فرد پیوش اگروال کے مطابق 1888 میں 'رام نرائن لعل پبلشر' کا قیام عمل میں آیا اور پہلی بار اس پبلشنگ نام سے کتابیں شائع ہوئیں۔ لالہ رام نرائن لال اگروال کتب فروشی کے عام کاروبار سے ترقی کر کے ہندوستان کے معروف اور اہم تاجر کتب بن گئے۔ لالہ رام نرائن لال اگروال کی شہرت اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے انتقال کے بعد الہ آباد کی ایک اہم سڑک بینک روڈ کا نام تبدیل کر کے 'لالہ رام نرائن لال روڈ' کر دیا گیا تھا۔

رام نرائن لال کے چھوٹے بھائی رائے صاحب رام دیال اگروالا بھی آگے چل کر اس کاروبار سے وابستہ ہو گئے۔ رائے صاحب رام دیال اگروالا کے پوتے پیوش اگروال کے مطابق 1895 میں رام دیال اگروالا اس کاروبار سے وابستہ ہوئے۔ 1910-1920 کے دوران انھوں نے ایک پریس (شانتی پریس) کے نام سے قائم کیا۔ اس پریس سے متعدد علمی و ادبی کتابوں کی طباعت عمل میں آئی۔ اس پریس کو سنہ 2000 میں فروخت کر دیا گیا۔ لیکن رائے صاحب رام دیال اگروالا جب تک باحیات رہے انھوں نے طباعت و اشاعت کے اس کام کو جاری رکھا۔

لالہ رام نرائن لال اور رائے صاحب رام دیال

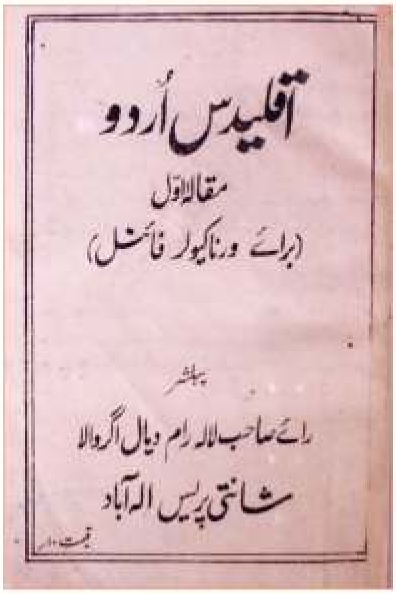
اقلیدس اُردو
مقالہ اول
(برائے ورناکیولر فائنل)
پبلشر
رائے صاحب لالہ رام دیال اگروالا
شانتی پریس الہ آباد

اگروالا پبلشر کی تاریخ تقریباً سوا صدی سے زائد عرصے پر پھیلی ہوئی ہے جہاں سے علوم وفنون کی متنوع کتابیں شائع ہوئیں۔ یہ کتابیں ہندوستان کے مختلف حصوں میں فروخت کی جاتی تھیں۔ اس پبلشر کے پرانے بہی کھاتوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے شائع ہونے والی کتابیں ہندوستان کے 65 سے زائد شہروں میں بھیجی جاتی تھیں۔ ہندوستان کے علاوہ کچھ بیرون ممالک میں بھی ان کتابوں کو ایکسپورٹ کیا جاتا تھا۔ ان میں نیپال، ماریشس، فیجی، برما، پاکستان، شری لنکا، بنگلہ دیش وغیرہ ممالک کے نام اہم ہیں۔ بعد میں لالہ رام نرائن لال اگروال کے بیٹوں اور پوتوں نے الگ الگ زبان کی کتابوں کو الگ الگ فرم کے نام سے شائع کرنا شروع کیا۔ جس سے 'لالہ رام نرائن لعل پبلشر' کی کئی شاخیں قائم ہوگئیں جن کے نام تھوڑی تبدیلی کے باوجود یکساں نظر آتے ہیں۔ جیسے 'رام نرائن لعل بینی مادھو'، 'رام نرائن لعل ارن کمار' وغیرہ۔

لالہ رام نرائن لعل اگروال کے بعد ان کے بیٹے بنی مادھو اردو، عربی اور فارسی زبانوں کا سیکشن سنبھالتے تھے۔ بنی مادھو کے بعد پروشوتم داس اور پروشوتم داس کے بعد ارن کمار اس سیکشن کو سنبھالتے رہے۔ فی الحال ارن کمار کے بعد ان کے بیٹے انج کمار اس سلسلے میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ رائے صاحب رام دیال اگروالا کی فرم کو ان کے پوتے پیوش اگروال 'رائے صاحب رام دیال اگروالا پبلشر' کے نام سے ہی چلا رہے ہیں۔ اب طباعت و اشاعت کام تو موقوف ہے مگر کتب فروشی کا کام جاری ہے۔ ینجے کمار اپنے مضمون میں رقمطراز ہیں:

''الہ آباد میں انج کمار اس وقت اردو کتابوں کا سیکشن دیکھتے ہیں۔ انج کمار سے پہلے ان کے والد ارن کمار اس کاروبار کو دیکھتے تھے۔ پھر ان کے والد پرشوتم داس، پھر ان کے والد بنی مادھو، پھر رام نرائن لعل، پھر دوارکا پرشاد یعنی انج کمار ابن ارن کمار ابن پرشوتم داس ابن بنی مادھو ابن رام نرائن لعل ابن دوارکا پرشاد۔ یہاں میں نے صرف اردو، عربی اور فارسی کتب کے کاروبار کے تعلق سے یہ شجرہ لکھا ہے ورنہ ان کے خاندان کی دوسری شاخ کی پشتیں بھی اس کاروبار میں لگی ہوئی ہیں۔''[2]

اس پبلشر کے ذریعے تیار کی جانے والی اور شائع کی جانے والی کتابوں کی تعداد 300 سے زیادہ ہے۔ جن میں اردو، عربی، فارسی، ہندی اور دیگر زبانوں کی کتابیں شامل ہیں۔ نصاب سے متعلق انھوں نے نہ صرف کتابیں شائع کیں بلکہ اتر پردیش، بہار اور دیگر ریاستوں کے نظام تعلیم سے متعلق بعض ایسی کتابیں تیار کرائیں جو ایک زمانے تک تدریسی نصاب کا حصہ رہیں۔ چند اہم درسی کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

> لالہ رام نرائن لال اور رائے صاحب رام دیال اگروالا پبلشر کی تاریخ تقریباً سوا صدی سے زائد عرصے پر پھیلی ہوئی ہے جہاں سے علوم و فنون کی متنوع کتابیں شائع ہوئیں۔ یہ کتابیں ہندوستان کے مختلف حصوں میں فروخت کی جاتی تھیں۔ اس پبلشر کے پرانے بہی کھاتوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے شائع ہونے والی کتابیں ہندوستان کے 65 سے زائد شہروں میں بھیجی جاتی تھیں۔

انتخابات نثر: سید ظہیر الدین احمد علوی
انشائے خطوط نویسی: ناظر کاکوروی
اشعار ذوق (مرتبہ): عبدالمنان بیدل
اشعار مومن (مرتبہ): عبدالمنان بیدل
اشعار غالب (مرتبہ): عبدالمنان بیدل

اس پبلشر نے مختلف شعرا کے کلام کے انتخابات مع تحقیقی وتنقیدی نوٹ یا تبصرے بھی شائع کیے۔ یہ تبصرے یا نوٹ درسی ضرورت کے ساتھ ساتھ عام قاری کے ذوق کی بھی تسکین کرتے تھے۔ کچھ انتخاب میں یہ نوٹ بہت طویل ہیں تو کچھ میں مختصر۔ ان تبصروں میں متعلقہ شاعر کے مختصر حالات زندگی، ان کے کلام کے امتیازات، مختلف شعرا کے کلام کے ساتھ ان کے کلام کا موازنہ، ان کے کلام پر مخالفین و مداحین کی رائے، متعلقہ شاعر کے شاگردوں کا ذکر وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے:

انتخاب مراثی میر ضمیر: نامعلوم
انتخاب کلام میر و غالب: مولوی رفیع صاحب
انتخاب تاریخ فرشتہ: حکیم محمد قاسم
انتخاب قصائد ذوق: نامعلوم
انتخاب قصائد سودا: نامعلوم
انتخاب کلیات سودا: سید مطلب حسین عالی لکھنوی
انتخاب مراثی انیس: نامعلوم
انتخاب مراثی دبیر: نامعلوم

اس ادارے سے بہت سے شعرا کے دیوان اور کلیات بھی شائع ہوئے جن میں دیوان غالب، دیوان ذوق، دیوان حالی، دیوان مومن، دیوان داغ اور کلیات سودا، کلیات مومن، کلیات میر وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

شاعری کے علاوہ نثر بالخصوص فکشن کی اشاعت میں انھوں نے بہت دلچسپی لی۔ ڈپٹی نذیر احمد کا ناول توبۃ النصوح اور فسانۂ عجائب کے علاوہ قواعد، لغات اور تحقیق وتنقید سے متعلق متعدد کتابیں شائع کیں۔ اس عہد میں لکھی گئیں بیشتر اہم کتابوں کو انھوں نے قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ اس ادارے سے شائع ہونے والی اردو نثر کی چند کتابوں کے نام ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں:

آب حیات: محمد حسین آزاد

آگ اور پتھر: شکیلہ اختر

ابن الوقت: ڈاکٹر نذیر احمد

ادبی نمونے: محمد مطیع الرحمٰن

اردو داستان کی نشو نما: رفیق حسین

اردو غزل کی نشو ونما: رفیق حسین

اردو ناول کی نشو نما: رفیق حسین

اردوئے معلّی: مرزا اسد اللہ خاں غالب

اقبال: ڈاکٹر سید اختر احمد اختر اورینوی

امراؤ جان ادا: مرزا ہادی رسوا

افسانوی اصول اور فسانہ عجائب: رفیق حسین

مرزا غالب کی تینوں اردو کتابوں کو انھوں نے بہت اہتمام سے شائع کیا۔عود ہندی اور اردوئے معلّی کا وہی ایڈیشن آج کل بازاروں میں دستیاب ہے جسے لالہ رام نرائن لال یا رائے صاحب رام دیال اگروالا نے شائع کیا ہے۔

اسی طرح بچوں کے لیے انھوں نے ابر رحمت اور نور ہدایت جیسی بہت سی کتابیں تیار کرائیں اور ان کی اشاعت کا بندوبست کیا۔دینیات سے متعلق ان کی شائع کردہ کتابیں اسکولی نصاب میں آج بھی شامل ہیں انھیں دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے کس عرق ریزی سے یہ کتابیں تیار کرائی ہوں گی۔

اس زمانے میں عالمی ادب سے جوڑتے ہوئے انھیں بھی اس ادارے نے شائع کرانے کی کوشش کی۔ساتھ ہی فارسی ادب کی کتب کی اشاعت خصوصاً رباعیات خیام، اکبر نامہ، اشعار حافظ وغیرہ کی اشاعت ان کی ترجیحات میں شامل تھیں۔اس ادارے سے شائع ہونے والی چند فارسی کتب کے نام درج ذیل ہیں:

اشعار حافظ: نامعلوم

اشعار خاقانی: نامعلوم

اکبر نامہ: ابوالفضل

انتخاب اشعار حافظ: حافظ محمود شیرانی

ادبی کتب کے علاوہ دیگر علمی کتابیں بھی اس ادارے سے شائع ہوئیں۔یہ کتابیں ادب کے علاوہ علم معاشیات اور امور خانہ داری وغیرہ موضوعات سے متعلق ہوتی تھیں۔عموماً یہ کتابیں اس وقت کے تدریسی نصاب کا حصہ ہوتی تھیں۔اس لحاظ سے ان کتابوں کے ابواب کے آخر میں مشق وغیرہ کے سوالات کا انتظام بھی کیا جاتا تھا۔چند علمی کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

آسان علم معاشیات: پنڈت دیا شنکر دوبے و بھگوان داس کیلا

امور خانہ داری: سی۔ بی۔ اگروال

ایجادات وانکشافات: منشی پیارے لال شاکر

یہ ادارہ طباعت و اشاعت کے لحاظ سے اپنے زمانے کا ایک اہم ادارہ ہے۔ یہاں سے صرف اردو، عربی یا فارسی کی ہی نہیں بلکہ دیگر زبانوں جیسے ہندی، سنسکرت، بنگالی، نیپالی وغیرہ کی کتابیں بھی شائع ہوئیں، جو معیار کے لحاظ سے کافی اہم ہیں۔اس ادارے کی اہمیت کا اندازہ نجے کمار کے درج ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

''اس اشاعتی گھر کی تاریخی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ مرزا محمد ہادی رسوا کا ناول امراؤ جان ادا پہلی بار یہیں سے شائع ہوا تھا۔اور رسوا صاحب یہاں خود آیا کرتے تھے۔ یہ بات مجھے (نجے کمار کو) انج کمار صاحب سے معلوم ہوئی اور اس بات کی تصدیق استاد محترم پروفیسر سید محمد عقیل صاحب نے بھی کی ہے۔عقیل صاحب کی ملاقات رسوا صاحب کے صاحبزادے سے بھی ہوئی ہے جو یہاں Royalty

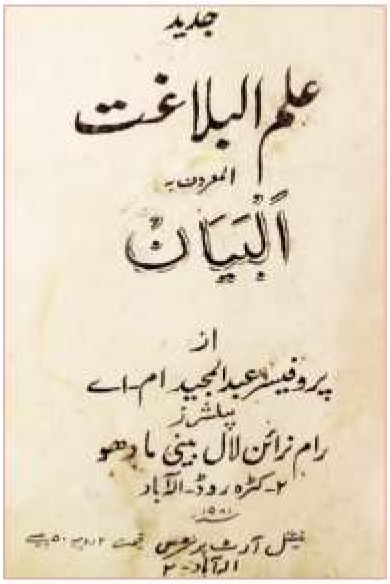

لینے آتے تھے۔انج کمار صاحب کے مطابق کبھی کبھی Royalty رسوا صاحب کی دونوں بیویوں کو بھیجوا دی جاتی تھی۔....فراق گورکھپوری اور ہربونش رائے بچن بھی یہاں آتے تھے۔''[3]

بحیثیت مجموعی یہ کہا جاسکتا ہے کہ تقریباً سوا صدی پر مشتمل لالہ رام نرائن لال اور رائے صاحب رام دیال اگروالا پبلشر کی یہ ادبی اور لسانی خدمات ہمارے تہذیبی سرمائے میں گراں قدر اضافے کا باعث ہیں اور یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ لالہ رام نرائن لال اگروال اور رائے صاحب رام دیال اگروالا نے دیگر زبانوں اور علم وادب کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے بھی ورثے کو محفوظ رکھنے اور ان کی طباعت و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

حواشی

1. ماسٹر دوارکا پرشاد جی کا پریوار ایوم پریچے از بھوانی دت اپریتی، رائے صاحب رام دیال اگروالا، الٰہ آباد، 2009، ص 21

2. لالہ رام نرائن لعل از نجے کمار، بشمولہ اردو دنیا، جون 2016، ص 51

3. ایضاً، ص 52

Mariyam Saba
Research Scholar
Department of Urdu
Banaras Hindu University
Mob: 8005090403
Email: mariyampdm13518@gmail.com

ادبی کتب کے علاوہ دیگر علمی کتابیں بھی اس ادارے سے شائع ہوئیں۔ یہ کتابیں ادب کے علاوہ علم معاشیات اور امور خانہ داری وغیرہ موضوعات سے متعلق ہوتی تھیں۔عموماً یہ کتابیں اس وقت کے تدریسی نصاب کا حصہ ہوتی تھیں۔ اس لحاظ سے ان کتابوں کے ابواب کے آخر میں مشق وغیرہ کے سوالات کا انتظام بھی کیا جاتا تھا۔

تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

ہندوستانی مسلمان: اتحاد کی بنیاد حب الوطنی

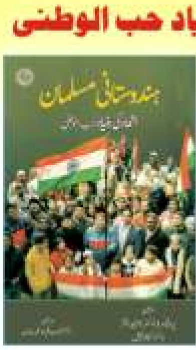

مرتبین: پروفیسر (ڈاکٹر) شاہد اختر/ ڈاکٹر کیشو پٹیل

مترجمین: ڈاکٹر نصیب علی/ محمد عارف

صفحات: 259، قیمت: 150 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: محمد یوسف

ریسرچ اسکالر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے حال ہی میں شائع ہوئی کتاب ''ہندوستانی مسلمان: اتحاد کی بنیاد حب الوطنی'' پروفیسر (ڈاکٹر) شاہد اختر اور ڈاکٹر کیشو پٹیل کی مرتب کردہ کتاب ''بھارتیہ مسلمان: ایکتا کا آدھار حب الوطنی'' کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کے مترجمین ڈاکٹر نصیب علی اسسٹنٹ پروفیسر جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی اور نوجوان اسکالر محمد عارف ہیں۔ ترجمے میں سلاست وروانی اور سادہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

ہندی کی اصل کتاب بنام ''بھارتیہ مسلمان: ایکتا کا آدھار حب الوطنی'' کا یہ اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کا اصل مقصد ہندوستانی مسلمانوں کے کردار، قومی یکجہتی میں ان کی شراکت، حب الوطنی کے تصور اور اجتماعی زندگی میں ان کے سماجی، تہذیبی، مذہبی اور سیاسی رویوں کو علمی بنیادوں پر واضح کرنا ہے۔ سرورق ہندوستانی عوام کی تصویر اس بات کی علامت ہے کہ یہ کتاب ہندوستانی مسلمان کو ہندوستان کے سماجی تناظر سے الگ نہیں کرتی، بلکہ اسے ملک کا ایک مجموعی حصہ ثابت کرتی ہے۔ عنوان سے یہ بات بھی عیاں ہوجاتی ہے کہ اس کا بنیادی نقطۂ نظر اتحاد واشتراک اور ہندوستانی معاشرت میں مسلمانوں کی مثبت اور تعمیری حیثیت کو اجاگر کرنا ہے۔ یہ کتاب مختلف مفکرین، اسکالرز اور مسلم راشٹریہ منچ سے وابستہ افراد کے تقریباً 20 سے زائد مضامین اور تقاریر پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا سب سے اہم پہلو 'حب الوطنی' ہے۔

مسلم راشٹریہ منچ کے زیر اہتمام شائع کتاب ''دی میٹنگ آف مائنڈز'' کے اجرا کے موقعے پر کی گئی ''راشٹریہ سویم سیوک سنگھ'' کے سربراہ موہن بھاگوت صاحب کی تقریر شامل ہے۔ اس تقریر میں انہوں نے بتایا ہے کہ سنگھ کیا ہے؟ اور اس کا وژن کیا ہے؟ کہ وہ اقلیتوں کو اپنے سماج کا حصہ سمجھتے ہیں۔ ان کا مقصد کسی پر بالادستی قائم کرنا نہیں، بلکہ بھارت کی بالادستی اور اس کی فلاح و بہبود ہے۔ ان کے نزدیک اتحاد کی بنیادیں مادر وطن، روایت، تہذیب و ثقافت اور مشترکہ آباواجداد ہیں۔

امرت کال ابھیاس ورگ میں ڈاکٹر اندریش کمار صاحب کی افتتاحی اور اختتامی تقریر حب الوطنی اور ہندوستانی مسلمانوں میں اتحاد و قومی تشخص کو فروغ دینے پر مرکوز ہے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں وضاحت کی ہے کہ ہمارے آباواجداد غیر ملکی نہیں بلکہ ہندوستانی تھے، ملک سے محبت کرنا اور اس کی حفاظت کرنا ہمیں جنت کا راستہ دکھاتا ہے۔

''راشٹریہ سویم سیوک سنگھ'' (آر ایس ایس) کے اکھل بھارتیہ سمپرک سربراہ رام لال جی نے بھوپال میں خطاب کیا جس میں انھوں نے آر ایس ایس اور مسلم راشٹریہ منچ کی تشکیل پر بات کی۔ انھوں نے کہا کہ مسلم راشٹریہ منچ ایک منفرد تنظیم ہے جو قومی مفاد اور انسانی فلاح کا تحفظ کرتی ہے۔ کتاب میں شامل مضامین کی نوعیت علمی، معلوماتی اور قومی اشتراک سے متعلق ہیں جن کی تفصیلات کچھ یوں ہے:

’’مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا‘‘ پروفیسر ماہ رخ مرزا کا یہ مضمون مذہبی ہم آہنگی اور بقائے باہمی پر زور دیتا ہے۔اس مضمون میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ سارے مذاہب کے لوگ ایک چھتری کی تیلیوں کی طرح ہیں، کوئی بڑا یا چھوٹا نہیں۔ہمیں ایک دوسرے کو کمتر سمجھے بغیر اپنے کردار کو بہتر بنا کر ملک کی ترقی میں حصہ لینا چاہیے۔’’ہندوستانی مسلمان اور یونیفارم سول کوڈ‘‘، ڈاکٹر کے ایم بہار الاسلام کا یہ مضمون ملک کے آئینی نظام اور مسلمانوں کے نجی قوانین کے درمیان تعلق کی وضاحت کرتا ہے۔’’شریعت، ایک ملک اور ایک قانون‘‘ ڈاکٹر مظہر آصف کا یہ مضمون ایک قومی قانون کے تحت اسلامی شریعت کے اطلاق اور مفہوم کی وضاحت کرتا ہے کہ ہندوستان کی تہذیب و ثقافت آفاقی ہے۔ڈاکٹر شالینی علی کا مضمون ’’ہندوستانی مسلمان: کل، آج اور کل‘‘ ہندوستانی مسلمانوں کی ثقافتی اور مذہبی جڑوں کا پر مغز تجزیہ پیش کرتا ہے۔یہ مضمون اس بات پر بھی روشنی ڈالتا ہے کہ مذہب تبدیل کرنے کے باوجود زیادہ تر ہندوستانی مسلمانوں نے ہندو عقائد، رسم و رواج، ذات پات کے نظام اور ثقافتی اقدار کو کسی نہ کسی شکل میں برقرار رکھا ہے جو ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد کو تقویت دیتا ہے۔’’جڑو اپنی جڑوں سے‘‘ کے عنوان سے پروفیسر ایم۔رضوان خان اپنے مضمون میں ہندوستانیت کی قدیم جڑوں پر روشنی ڈالتے ہوئے دلیل پیش کرتے ہیں کہ ہماری بنیادی شناخت مذہب یا ذات سے بالاتر ہو کر جنوبی ایشیائی ہندوستانی ہونے سے وابستہ ہے۔یہ مسلمانوں اور ہندوؤں سمیت تمام ہندوستانیوں کو وادی سندھ کی تہذیب کے ورثے سے جوڑتی ہے۔ وراگ پاچ پور کا مضمون ’’راشٹریہ سویم سیوک سنگھ اور ہندوستانی مسلمان‘‘ قومی سطح پر RSS اور مسلم کمیونٹی کے تعلقات میں خوشگوار تبدیلی کی عکاسی کرتا ہے، جس کی بنیاد حب الوطنی اور سماجی اتحاد پر رکھی گئی ہے۔گریش جویال کا مضمون ’’قومی ماحول میں ہندوستانی مسلمان‘‘ مسلم راشٹریہ منچ کے نقطہ نظر کو پیش کرنے کے ساتھ حب الوطنی اور ہندوستانی ثقافتی اقدار پر زور دیتا ہے۔’’ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی بین الاقوامی تناظر میں‘‘ پروین گلنانی کی یہ تحریر ہندوستانی مسلمانوں کے قومی تناظر اور بین الاقوامی پس منظر میں ان کی آبادی کے رجحانات کا جائزہ پیش کرتی ہے۔بلال الرحمٰن کا مضمون ’’اسلام اور قرآن میں ریحان (تلسی)‘‘ ماحولیات اور ہندو مسلم کے ثقافتی تعلق کو واضح کرتا ہے۔اس میں تلسی کی اہمیت کو اسلام اور قرآن کے تناظر میں اجاگر کر کے اس بات کی دلیل پیش کی گئی ہے کہ تلسی کو نہ صرف مذہب اسلام میں اہمیت دی گئی ہے بلکہ ہندو مذہب میں بھی اسے خاص مقام دیا گیا ہے۔ مضمون ’’مذہب سے پرے یوگ‘‘ میں رفیعہ ناز نے یوگ کو ایک علم اور سائنس کے طور پر پیش کیا ہے جس سے جسم، دماغ، عقل اور روح کو مضبوطی حاصل ہوتی ہے۔ یہ کسی بھی مذہب، ذات یا طبقے سے بالاتر ہو کر ہر نسل انسانی کے لیے ایک مفت علاج ہے جو ہندوستانی ثقافت کا خاص ورثہ ہے۔اسی طرح محمد فیض خان کا مضمون ’’گائے اور اسلام‘‘ ایک حساس ثقافتی مسئلے کی مذہبی تشریح کرتا ہے کہ گائے کی اہمیت تمام مذاہب میں بتائی گئی ہے۔

’’امرت کال میں نوجوانوں کا کردار‘‘ پروفیسر ایم مہتاب عالم رضوی کا یہ مضمون مستقبل کے حوالے سے مسلم نوجوانوں کی ذمہ داریوں اور چیلنجز پر روشنی ڈالتا ہے جس میں اختراعی (Innovation) سماجی تبدیلی، سیاسی شرکت اور تکنیکی خواندگی شامل ہے۔’’قرآن پاک کی روشنی میں مسلم خواتین‘‘ کے عنوان سے تسنیم پٹیل کا مضمون شامل ہے، جس میں انھوں نے قرآن وحدیث کی روشنی میں عورتوں کے سماجی، ثقافتی، تعلیمی، معاشی اور سیاسی حقوق کو اجاگر کیا ہے۔ڈاکٹر شاہد اختر کا مضمون ’’ہندوستانی مسلمان تحریک آزادی سے امرت کال تک‘‘ ایک طویل تاریخی سفر کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔اس تحریر میں تحریک آزادی میں ہندوستانی مسلمانوں کے اہم کردار اور آزادی کے بعد ملک کی ترقی میں ان کی خدمات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ڈاکٹر نصیب علی کا مضمون ’’جموں وکشمیر: 370 کے پہلے اور بعد‘‘ یہ بتاتا ہے کہ جموں وکشمیر ثقافتی اور تاریخی طور پر ہندوستان کا اہم حصہ رہا ہے جہاں 5/اگست 2019 کے بعد ہندوستانی آئین کو مکمل طور پر نافذ کیا گیا، جس سے والمیکی سماج، مغربی پاکستانی مہاجرین، خواتین اور دیگر پسماندہ طبقات کو ان کے حقوق اور ریزرویشن ملے۔ جناب شاہد سعید نے ’’حب الوطنی کے راستے پر ہندوستانی مسلمان: 2014 سے اب تک‘‘ کے عنوان سے حالیہ سیاسی دور میں مسلمانوں کے قومی رجحانات کا تجزیہ پیش کیا ہے۔کتاب کے آخر میں ڈاکٹر کیشو پٹیل نے ’’راشٹریہ امرت کال اکھل بھارتیہ ابھیاس ورگ‘‘ جو بھوپال میں 8 سے 11 جون 2023 کو منعقد ہوا تھا۔اس میں مسلم راشٹریہ منچ (MRM) کے کارکنوں کی خوبی، ترقی، طریقہ کار اور طرز عمل پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا ہے کہ ایم آر ایم کا مقصد مسلم معاشرے کو مجموعی طور پر منظم کرنا ہے اور اس میں قوم پرستی کو اتحاد کی بنیاد بنانا ہے۔

یہ کتاب تاریخی، سماجی اور فکری دستاویز ہے، جو ایک خاص نقطہ نظر سے ہندوستانی مسلمانوں کے کردار کا تجزیہ کرتی ہے۔ یہ نہ صرف ایک فکری کاوش کا نتیجہ ہے، بلکہ مسلم راشٹریہ منچ کے سیاسی اور سماجی مشن کی عکاسی بھی کرتی ہے۔ بلاشبہ اس کتاب کا مطالعہ تمام قارئین کی معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ حب الوطنی ہی ایسی بنیاد ہے جس کے ذریعے ہم مسلکی اور طبقاتی تفریق کے بغیر پُر امن طریقے سے ترقی کے راستے پر گامزن ہو سکتے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

عبدالرزاق قریشی احوال و آثار

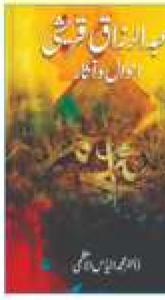

مصنف: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

صفحات: 240، قیمت: 450 روپے

ناشر: ادبی دائرہ اعظم گڑھ

مبصر: عبدالعلیم الاعظمی

کاشانہ رفیق سرائے میر، اعظم گڑھ

عبدالرزاق قریشی اتر پردیش کے مردم خیز خطہ اعظم گڑھ کے ممتاز فرزند تھے۔ 1931ء میں بسہم اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے، بچپن میں ہی والدین کے سایہ عاطفت سے محروم ہوگئے تھے، آپ کی دادی نے آپ کی پرورش کی اور بہت ہی کم عمری میں اپنے چچا سخاوت علی کے ساتھ ممبئی چلے گئے وہیں آپ کی تعلیم وتربیت ہوئی۔ ثانوی تعلیم کے بعد باوجود خواہش کے حالات نے اعلیٰ تعلیم کی اجازت نہیں دی، چنانچہ ملازمت اختیار کرلی اور پھر تمام زندگی درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور تحقیق وتدوین میں بسر کی۔

عبدالرزاق قریشی نے 1958 تک ممبئی کے مختلف اسکولوں میں اردو اور فارسی کے استاذ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ 1958 میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی سے وابستہ ہوئے اور 1977ء تک نہایت دلجمعی سے علمی، ادبی اور تحقیقی کارنامے انجام دیتے رہے۔ 1968ء میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے انتقال کے بعد مجلہ نوائے ادب ممبئی کے مدیر منتخب ہوئے۔ عبدالرزاق قریشی متعدد علمی وتحقیقی کتابوں کے مصنف ہیں، ان میں سے بعض کتابیں اپنے موضوع پر اولین کتابوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کتابوں کی بڑی اہمیت اور قدر ومنزلت ہے۔ عبدالرزاق قریشی کی علمی یادگار میں نوائے آزادی، میرزا مظہر جان جاناں اور ان کا اردو کلام، دیوان عزلت، مکاتیب میرزا مظہر، مبادیات تحقیق اور راگ مالا وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ 1977 میں ممبئی سے اعظم گڑھ تشریف لائے، آپ کی خواہش کے مطابق دارالمصنفین شبلی اکیڈمی نے رفیق منتخب کیا، لیکن دارالمصنفین سے وابستہ ہونے سے قبل ہی محض چند دنوں کی بیماری کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔

واقعہ یہ ہے کہ عبدالرزاق قریشی نے جس طرح کی خدمات انجام دی ہیں اور اردو زبان وادب کے میدان میں جس طرح کے لازوال کارنامے انجام دیے ہیں، اس کو دیکھتے ہوئے اہل علم اور تذکرہ نگاروں نے ان کو وہ مقام ومرتبہ نہیں دیا، جس کے وہ حقدار تھے، بلکہ ان کا تذکرہ خال خال ہی ملتا ہے۔ بلاشبہ پروفیسر خورشید نعمانی نے قریشی صاحب کے متعلق بالکل درست لکھا ہے کہ ''ادب میں ہمیں دو قسم کے ادیب ملتے ہیں، پہلی قسم ان ادیبوں کی ہے جنھوں نے اپنی تصانیف کے ذریعہ شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کی اور دوسری قسم ان ادیبوں کی ہے جنھوں نے اپنے پیچھے اعلیٰ درجے کی تصانیف چھوڑیں، لیکن ان کو وہ شہرت عام حاصل نہ ہوسکی جو ان کا حق تھا۔ دوسری قسم کے ان ادیبوں میں ایک شخصیت عبدالرزاق قریشی کی بھی تھی جو کہ زندگی بھر علم کی خاطر شمع کی طرح جلتے اور پگھلتے رہے۔'' (صفحہ: 15)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی عصر حاضر میں دیار شرق خاص طور سے اعظم گڑھ کی علمی تاریخ کے بڑے علمبردار ہیں، انہوں نے نہ صرف اعظم گڑھ کی تاریخ کے مختلف گوشوں پر کتابیں اور مضامین ومقالات لکھے ہیں، بلکہ اعظم گڑھ کی بہت سی شخصیات کے سوانح اور تذکرے لکھ کر ان کے کارناموں کو زندہ و جاوید کردیا۔ زیر نظر کتاب ''عبدالرزاق قریشی احوال و آثار'' اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ یہ بھی جاننا دلچسپ ہوگا کہ اس کتاب کی تالیف کا سبب کیا بنا، فاضل مصنف لکھتے ہیں:

''مرحوم عبدالرزاق قریشی پر لکھنے کے لیے کسی اعتذار کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اس پایے اور رتبے کے ادیب وانشاپرداز اور محقق ومدون ہیں کہ انہیں اردو کی تحقیق و تدوین کی تاریخ میں کوئی شخص نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اردو میں مبادیات تحقیق ان کی اولین اور بڑی وقیع کاوش قرار دی جاتی ہے، چنانچہ اس موضوع کی مختلف تحریروں میں ان کا ذکر مختصر ہی سہی مگر اولیت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ البتہ گذشتہ دنوں پاکستان سے ایک ضخیم کتاب ''اردو ادب کے نامور محققین'' شائع ہوئی تو اس میں ان کا نام سرے سے شامل نہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا اور یہ بھی احساس ہوا کہ اب اسی نوع کے مقالے لکھے جاتے ہیں اور تحقیق وتدوین یا موضوع کا حق ادا نہیں کیا جاتا ہے۔ یہ عمل اردو زبان کے لئے نیک فال نہیں ہے۔ اہل قلم کی اسی کم ظرفی کی وجہ سے اس کتاب کے لکھنے اور ترتیب دینے کا خیال ذہن میں آیا۔ گو میں خود کو بھی اس لائق نہیں سمجھتا کہ مرحوم کی بلند رتبہ شخصیت کا حق ادا کرسکتا ہوں، تاہم کچھ نہ ہونے سے بہتر ہے کہ جو کچھ ہوسکے کیا جائے۔ بہرحال مجھ ناچیز سے خرابی صحت کے باوجود جو کچھ ہوسکا وہ اب آپ کی نذر ہے۔'' (صفحہ: 13)

زیر نظر کتاب 240 صفحات اور پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں قریشی صاحب کے سوانحی کوائف اور ان کے علمی، ادبی اور تحقیقی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے باب میں ان کی وفیاتی تحریروں کو جمع کیا گیا ہے۔ یہ کل 42 تحریریں ہیں، تیسرے باب میں قریشی صاحب کے دستیاب مکتوبات کو جگہ دی گئی ہے۔ اس باب میں کل 21 مکاتیب ہیں، جن میں سے 15 ڈاکٹر خلیق انجم، 3 ڈاکٹر تنویر احمد علوی اور ایک ایک سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ڈاکٹر نظام الدین گوریکر اور گوپی چند نارنگ کے نام ہیں۔ اکثر مکاتیب نوائے ادب کے مضامین ومقالات کے سلسلے میں لکھے گئے ہیں، البتہ ان مکاتیب سے قریشی صاحب کے ذوق کا بھی پتہ چلتا ہے، چنانچہ جن مکاتیب میں انھوں نے مضامین کی درخواست کی ہے وہاں 'اچھا سا تحقیقی مضمون' جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ چوتھا باب ''منتخب ادبی مقالات'' ہے، اس باب میں 9 مضامین ہیں۔ یوں تو قریشی صاحب نے کثرت سے علمی، ادبی اور تحقیقی مضامین لکھے ہیں، لیکن اس کتاب میں ان کے چند مضامین کو جگہ دی گئی ہے، اس سلسلے میں فاضل مصنف لکھتے ہیں کہ ''قریشی صاحب کے مقالات کی کثرت اور طوالت کی وجہ سے انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ چند منتخب ادبی مقالات زیر نظر کتاب کے آخر میں شامل ہیں۔ بقیہ چند علمی، ادبی اور تاریخی مقالات ''مقالات عبدالرزاق قریشی'' میں آئندہ شائع ہوں گے۔ ان شاء اللہ'' (صفحہ: 11)

قریشی صاحب کی شعر وشاعری پر بھی گہری نظر تھی، اس کتاب میں شامل مضامین میں حالی کی غزل گوئی، اردو شاعری اور مسائل حیات، غزلیات اکبر، اردو کی تمثیلی شاعری، ساقی نامہ، اردو کے چند ابتدائی ساقی نامے اور سودا کا ایک قطعہ وغیرہ

وہ مضامین و مقالات ہیں جن سے ان کا بلند شعری ذوق عیاں ہوتا ہے۔ ان مقالات میں ایک مقالہ ''رشید احمد صدیقی'' پر بھی ہے، جس میں ان کی طنز نگاری پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کا آخری باب ''عبدالرزاق قریشی: مشاہیر و معاصرین کی نظر میں'' ہے، اس میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، سید شہاب الدین دسنوی، اور پروفیسر خورشید نعمانی کے تاثرات نقل کیے گئے ہیں۔

یہ کتاب ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کا ایک اہم کارنامہ ہے، جہاں اس کتاب کے ذریعہ انھوں نے ایک قدرے گم نام یا کم نام شخصیت کی زندگی اور کارناموں سے اہل علم کو روشناس کرایا، وہیں ان کے وفیاتی، ادبی مضامین اور مکتوبات کو جمع کر کے ان کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔

جہان جذبی (جلد اول)

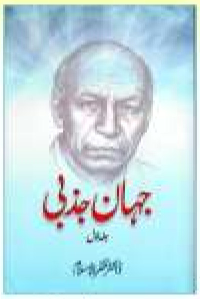

مرتب و ناشر: ڈاکٹر ظفر الاسلام

صفحات: 665، قیمت: 650 روپے، سن اشاعت 2025

مبصر: ڈاکٹر ثنا غزل

N13/14-3K، نئی بستی سرائے سرجن بجرڈیہہ وارانسی

ڈاکٹر ظفر الاسلام ادبی ذوق متین شخصیت کے مالک ہیں، تنقید کے ساتھ تحقیق بھی ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ زیر تبصرہ کتاب 'جہان جذبیؔ' سے قبل ان کی تین کتابیں 'ڈاکٹر شکیل اعظمی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ'، 'مضامین جذبیؔ' اور 'اشاریہ سہ ماہی رسالہ نئی کتاب' منظر عام پر آچکی ہیں۔ 'مضامین جذبیؔ' میں جذبی کے مضامین شائع کیے گئے ہیں جو اب تک لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ تھے، اور رسالوں کی گرد آلود فائلوں میں دبے ہوئے تھے۔ انھوں نے اس کو تلاش کیا اور اپنے مقدمے کے ساتھ انھیں اشاعت سے آراستہ کیا۔ اشاریہ سازی ایک مشکل فن تصور کیا جاتا ہے، اس کے باوجود انھوں نے 'نئی کتاب' کا اشاریہ بڑی محنت کے ساتھ تیار کیا ہے۔ زیر نظر کتاب بھی موصوف کی تحقیقی جستجو اور محنت کا ثمرہ ہے۔ کتاب 'جہان جذبیؔ' میں معین احسن جذبیؔ پر لکھے گئے ان اہم مضامین کو شامل کیا گیا ہے جو 2005 یعنی جذبی کے انتقال سے قبل تحریر کیے گئے ہیں۔ کتاب کی دوسری جلد پر وہ کام کر رہے ہیں۔ مذکورہ کتاب 665 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

اس کتاب کی پشت پر مولانا ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی کے ذریعے لکھی گئی ایک مختصر تحریر درج ہے۔ جس میں انھوں نے مارکسی انقلاب اور اس سے متاثر ترقی پسند تحریک کا ذکر کیا ہے، چونکہ جذبی خود بھی اسی تحریک سے وابستہ تھے لیکن اس کے باوجود ان کی شاعری میں توازن اور اعتدال پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اس کتاب کو ''جذبی شناسی کے سلسلے کی ایک اہم پیش کش'' قرار دیا ہے۔ چند سطور ملاحظہ کیجیے:

''عزیزی ڈاکٹر ظفر الاسلام نے جذبی پر اپنے تحقیقی مقالے کی تکمیل کے بعد بھی جذبی شناسی کے سفر کو جاری رکھا۔ پہلے 'مضامین جذبیؔ' کی اشاعت کی پھر جذبی پر اہل قلم ارباب نقد و نظر کے ان مضامین و مقالات کی تلاش و تحقیق میں سرگرداں رہے جو جذبی کی شخصیت، شاعری، نظریۂ فکر و فن پر ماضی میں لکھے گئے تھے اور وہ رسائل کی فائلوں میں دبے ہوئے تھے یا کتابوں کے اوراق پراگندہ تھے، اپنی مساعی جمیلہ سے ان کی بازیافت کی اور جذبی پر ایک ضخیم مقالات کا مجموعہ 'جہانِ جذبیؔ' کے نام سے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ جو جذبی شناسی کے سلسلے کی اہم پیش کش ہے۔''

کتاب کے مقدمے میں ڈاکٹر ظفر الاسلام نے جذبی کی شاعری کے موضوعات کا بیان بڑی خوبصورتی مگر قدرے اختصار کے ساتھ کیا ہے۔ اس میں کتاب کا مکمل احاطہ بھی کیا گیا ہے اور اکثر مضامین کا مختصر خلاصہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لہٰذا مقدمے کو اگر کتاب کی روح کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ انھوں نے جذبی کی شخصیت، ادبی اور پیشہ ورانہ زندگی کو مختصر طور پر بیان کیا ہے، ساتھ ہی اس عہد کے سماجی، سیاسی اور معاشی حالات پر بھی عمدہ گفتگو کی گئی ہے۔ مقدمے میں جذبی کی زندگی کن کن آزمائش و مسائل سے دوچار ہوئی ان کا ذکر بھی کیا گیا ہے، بلکہ جذبی کی مکمل زندگی کو اس مقدمے میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ابتدائی زندگی سے متعلق وہ لکھتے ہیں:

''جذبی کو اپنی ابتدائی زندگی میں بڑے صدمے اٹھانے پڑے۔ وہ بچہ جو ساڑھے تین سال کی عمر میں ماں کو کھو بیٹھا، جس کی تعلیمی زندگی میں برابر ٹھوکریں لگتی رہیں، جس کے باپ نے کم عمری ہی میں اپنا ہاتھ اس کے سر سے اٹھا لیا، جس نے مختلف ملازمتیں کیں اور ہر جگہ حکام سے ٹکر ہوئی، جسے فلمی دنیا میں ضمیر اور آزادی کے خیال نے کچھ کرنے نہ دیا۔ جس نے صبحِ نشاط سے شامِ غم تک کی منزلیں بہ یک قدم طے کیں، محبت کی ہلکی خلش بھی جس کے لیے ناکامی کا زہر بن گئی۔ اس آدمی کے لیے مختلف لمحات میں افسردہ ہو جانا کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ جب بھی ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو ان کی زندگی کی پوری کہانی سلسلہ وار اور آئینہ در آئینہ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اسی لیے جب بہت سے دوسرے شاعروں کے مقابلے میں جذبی پر نظر کی جاتی ہے تو ان کی ذات ان کی روح اور ان کی شاعری ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آگے بڑھتی ہوئی دیکھی جاتی ہے۔ ذاتی زندگی اور شاعری کا اتنا رچا ہوا اور خوبصورت آہنگ بہت کم فن کاروں میں دکھائی دیتا ہے۔''

زیر نظر کتاب کو مرتب نے کل چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (1) حیات و شاعری (2) نظم نگاری (3) حالی کا سیاسی شعور اور (4) انٹرویو۔ کتاب کے آخر میں کتابیات پیش کی گئی ہے۔

مذکورہ کتاب میں جذبی کی شخصیت، شاعری اور ان کی کتاب 'حالی کا سیاسی شعور' پر لکھے گئے 66 مضامین اور چار انٹرویوز شامل ہیں۔ یہ مضامین 1942 سے 2005 تک کے عرصے میں تحریر کیے گئے ہیں۔ مضامین کو سال اشاعت کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ مرتب نے ان مضامین کو جذبی پر پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھنے کے دوران جمع کیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب جذبی شناسی کے ضمن میں اہمیت کی حامل محسوس ہوتی ہے جس سے جذبی کے تعلق سے بہت سے نئے گوشے وا ہو سکتے ہیں۔

مجنوں گورکھپوری کے افسانوں کا تنقیدی مطالعہ

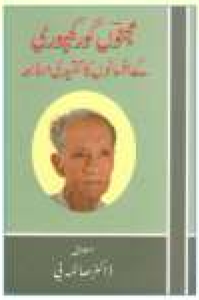

مصنفہ: ڈاکٹر صائمہ بی
صفحات: 271، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2025
ناشر: ایس کے پرنٹ ہاؤس، نئی دہلی
مبصر: محمد اکرام
89-6A، گلی نمبر 9، غفار منزل، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

مجنوں گورکھپوری (احمد صدیق) ادبی دنیا میں ترقی پسند نقاد کے حوالے سے جانے جاتے ہیں اور بہ حیثیت شاعر، مترجم اور افسانہ نگار بھی وہ اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ترقی پسند ادب کو تنقیدی سطح پر نظریاتی بنیادیں فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ تنقید کے حوالے سے ان کی کتاب 'ادب اور زندگی' بہت اہم ہے۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے دوش وفردا، نکات مجنوں، شعر وغزل، غزل سرا، غالب شخص اور شاعر، تنقیدی حاشیے، تاریخ جمالیات اور نقوش و افکار جیسی کتابیں تحریر کی ہیں۔ وہ ایک اچھے افسانہ نگار بھی تھے۔ خواب و خیال، مجنوں کے افسانے، سوگوار شباب، سمن پوش اور دوسرے افسانے کے نام سے ان کے افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ سرنوشت (ناول) اور گردش (ناولٹ) کو بھی ہم اسی زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔ انگریزی زبان وادب پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ شیکسپیئر، ٹالسٹائی، بائرن، برنارڈ شا، آسکر وائلڈ اور جان ملٹن جیسے تخلیق کاروں کی کچھ تخلیقات کو انھوں نے اردو کے قالب میں ڈھالا تھا، جنھیں تین مغربی ڈرامے، آغاز ہستی، مریم مجدلانی، سالومی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان کی خدمات کا خاطر خواہ اعتراف بھی کیا گیا مگر تنقید کے علاوہ دیگر اصناف پر ناقدین کی نظر عنایت کم ہی رہی، ایسے میں ڈاکٹر صائمہ بی کی کتاب 'مجنوں گورکھپوری کے افسانوں کا تنقیدی مطالعہ' غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے کہ انھوں نے مجنوں گورکھپوری کے افسانوں کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا جس پر انھیں روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل ہوئی ہے۔ بات مجنوں گورکھپوری کی افسانوی خدمات کے تعلق سے ہو رہی ہے تو ڈاکٹر شاہین فردوس کی کتاب 'مجنوں گورکھپوری: حیات اور ادبی خدمات' کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس کتاب کا دوسرا باب مجنوں گورکھپوری کی افسانہ نگاری کے حوالے سے ہے، جس میں مختلف عناوین کے تحت مجنوں کی افسانوی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب 2001 میں ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ سے شائع ہوئی ہے۔

ڈاکٹر صائمہ بی کی کتاب 'مجنوں گورکھپوری کے افسانوں کا تنقیدی مطالعہ' تاثرات، پیش لفظ اور کتابیات کے علاوہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ 'تاثرات' کے تحت پروفیسر شہزاد انجم، ڈاکٹر جاوید نسیمی، ڈاکٹر الف ناظم، مکرم رضا خاں عنایتی، حمیدہ صالحاتی اور ڈاکٹر زرنگار کی تحریریں شامل ہیں۔ 'پیش لفظ میں' مجنوں گورکھپوری کا تعارف اور اس کتاب کو منظر عام پر لانے کے مقاصد کا ذکر ہے۔

پہلا باب 'مجنوں گورکھپوری: مختصر سوانحی خاکہ' ہے جسے انھوں نے تعارف: شخصیت کی تعمیل وتشکیل، ایک ہمہ گیر شخصیت، مجنوں بحیثیت افسانہ نگار، مجنوں بحیثیت معلم، تصانیف کا مختصر تعارف جیسے عناوین کے تحت مجنوں کی پیدائش، جائے پیدائش، تعلیم و تربیت، خاندانی احوال اور ادبی خدمات کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش پر مرکوز رکھا ہے۔

دوسرا باب 'مجنوں گورکھپوری اور رومانویت' ہے۔ اس باب کو انھوں نے رومانویت کا مفہوم، مغربی اور مشرقی ادبیات میں رومانویت کا میلان، مجنوں کے افسانوں اور دیگر نثری تخلیقات میں رومانویت کا رجحان جیسے عناوین میں منقسم کیا ہے۔ چونکہ مجنوں گورکھپوری رومانوی ادب کے حوالے سے اپنی مستحکم شناخت رکھتے ہیں اور افسانوں میں انھوں نے اسے خوب برتا بھی ہے۔ اس لیے انھوں نے افسانوں پر بحث سے پہلے رومانوی ادب پر گفتگو کی ہے۔ مجنوں گورکھپوری کو مشرقی ادب کے ساتھ مغربی ادب سے بھی حد درجہ انسیت تھی، اس لیے مصنفہ نے مغرب اور مشرق دونوں ادبیات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک موازنے کی صورت بھی نکالی ہے کہ رومانویت کا میلان مشرقی اور مغربی ادب میں کس حد تک پایا جاتا ہے اور اس کی کتنی ضرورت ہے۔ اسی باب میں مجنوں کے افسانوں کے علاوہ دیگر نثری تخلیقات میں رومانویت کا کس حد تک رجحان پایا جاتا ہے، بہت ہی خوش سلیقگی کے ساتھ اس کا بھی تجزیہ کیا ہے۔

تیسرا باب 'مجنوں گورکھپوری کے افسانوں کا تنقیدی مطالعہ' ہے۔ یہی اس کتاب کا نام بھی ہے اور پوری کتاب کا ماحصل بھی۔ اس باب میں انھوں نے افسانہ نگاری کے ادوار، موضوعات، طربیہ عناصر، حزنیہ عناصر، کردار نگاری، تکنیک، اسلوب جیسے عناوین کے تحت گفتگو کی ہے۔ چونکہ افسانہ نگاری کے بعض اصول ایسے ہیں جن کا پاس ولحاظ کیے بغیر افسانہ نہیں لکھا جا سکتا۔ اس لیے مصنفہ نے بالخصوص ان چیزوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے ان نکات پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے مجنوں گورکھپوری کے افسانوں کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے تاکہ قاری کو ان کی خصوصیات سمجھنے میں آسانی ہو۔ پہلے دور میں ان کے 1925-1931 تک کے افسانے کو شامل کیا ہے۔ دوسرے دور میں 1932-1935 کے درمیان لکھے گئے افسانوں کو رکھا ہے۔ تیسرا اور آخری دور 1935 کا ہے جب ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا، وہاں سے لے کر آخری عمر تک لکھے گئے ان کے افسانوں کو بھی اس باب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ ادوار کے حساب سے ان کے افسانوں کے موضوع، کردار تکنیک اور اسلوب کے جائزے کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔

جب مجنوں گورکھپوری نے افسانہ لکھنا شروع کیا تو اس وقت 'ادب لطیف' کا بول بالا تھا، مجنوں صاحب بھی اس سے متاثر ہوئے اور ڈھیروں افسانے اس پر لکھ ڈالے، بعد میں تہذیبی و معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ ان کے افسانوں کے موضوعات بھی بدلتے گئے۔ موضوعات کے علاوہ مجنوں کے افسانوں میں 'طربیہ عناصر' اور 'حزنیہ عناصر' کے اثرات کس حد تک پائے جاتے ہیں اس پر بھی جامع اور موثر گفتگو کی ہے۔ 'کردار نگاری' کسی افسانے کا بنیادی وصف ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ افسانے کی کامیابی کا انحصار ہی کردار نگاری پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ بڑے افسانہ نگار مثلاً پریم چند، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی وغیرہ نہ جانے ایسے کتنے افسانہ نگار ہیں جو دیگر خوبیوں کے ساتھ اپنے افسانوں کے کردار سے بھی ادبی دنیا میں زندہ ہیں۔ 'تکنیک' اور 'اسلوب' بھی افسانے کے بنیادی جز ہیں۔ 'تکنیک' موضوع کی ادائیگی کے طریقہ کار کو کہتے ہیں۔ یہ موضوع اور اسلوب میں ذہنی ربط بھی پیدا کرتا ہے۔ تکنیک کے استعمال کا طریقہ بہت پیچیدہ سمجھا جاتا ہے۔ کسی افسانہ نگار کے افسانوں کے

موضوعات مختلف ہیں تو ان مختلف موضوعات میں مختلف تکنیک کا استعمال کیا جاتا ہے، یہ افسانہ نگار کا کمال ہوتا ہے۔ اس حوالے سے صائمہ بی نے مثالوں کے ذریعے مفصل اور جامع گفتگو کی ہے۔'اسلوب' بھی ایک فنکارانہ عمل ہے، جسے ہر کسی کے لیے برتنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کے بیانیہ کا اسلوب اتنا سہل اور عمدہ ہوتا ہے کہ اسے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے، مگر بعض قلم کار ایسے ہیں جن کے اسلوب میں پیچیدگی ہوتی ہے، ایسے قلمکاروں کی تحریر کو سمجھنے میں دقتیں پیش آتی ہیں۔ اس صورت میں متن کو سہل اور عام فہم بنانے میں 'اسلوب' کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔ اس باب میں مصنفہ نے اسلوب کی وضاحت کے ساتھ بالخصوص مجنوں گورکھپوری کے اسلوب پر بالاستیعاب گفتگو کی ہے۔

چوتھا باب 'اختتامیہ' ہے۔ اس باب میں معاصر افسانہ نگاروں سے تقابل، تراجم اور مجموعی قدر و قیمت جیسے عناوین قائم کیے گئے ہیں۔ 'معاصر افسانہ نگاروں سے تقابل' میں مجنوں گورکھپوری ان کے معاصرین کی افسانہ نگاری کا مختصراً تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ 'تراجم' کے حوالے سے بھی مجنوں گورکھپوری کا اپنا ایک مقام ہے۔ اس حوالے سے ان کی مجموعی خدمات کا بہترین محاکمہ پیش کیا گیا ہے۔ 'مجموعی قدر و قیمت' میں مجنوں گورکھپوری کے افسانوں کے حوالے سے جامع گفتگو کی گئی ہے۔ یہ مضمون ان معنوں میں بہت اہم ہے کہ مجنوں کی افسانہ نگاری کی خصوصیات کو چند صفحات میں بہت سلیقے سے پیش کر دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر صائمہ بی نے 'مجنوں گورکھپوری کے افسانوں کا تنقیدی مطالعہ' کے ذریعے ان کی افسانوی خدمات کو جس طرح ادبی دنیا سے متعارف کرایا ہے، اس کی ستائش کی جانی چاہیے، البتہ کتاب میں کچھ ایسے پہلو ہیں جن پر مصنفہ کو نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اول تو کتاب کا نام ہی قابل غور ہے، کیونکہ اس کے اندر جو مباحث قائم کیے گئے ہیں وہ کتاب کے نام سے میل نہیں کھاتے۔ اگر یہ کتاب صرف ان کی افسانوی خدمات کے حوالے سے ہوتی تو یہ نام مناسب ہوتا۔ پہلے باب 'مجنوں بحیثیت افسانہ نگار' کے علاوہ چار عناوین کا اس کتاب سے کوئی ربط نہیں ہے۔ دوسرے باب کی تو قطعی ضرورت نہیں تھی۔ باب چہارم سے بھی تراجم کو حذف کیا جا سکتا تھا کیونکہ ان پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ پھر بھی یہ کتاب مجنوں گورکھپوری کی افسانوی خدمات کے حوالے سے ریسرچ کرنے والے طلبا و طالبات کے لیے بہت مفید اور معاون ثابت ہوگی۔ مجھے قوی امید ہے کہ قارئین اس کتاب سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں گے۔

خاکہ

اجالے یادوں کے

خاکہ نگار: ڈاکٹر حلیمہ فردوس

صفحات: 172، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: ستمبر 2024، بار اول

ناشر: حلیمہ فردوس، 414، A1، گنگا بلاک، این جی وی، کورمنگلا، بنگلور 560047

مبصر: ڈاکٹر جہاں گیر حسن

شاہ صفی اکیڈمی، سید سراواں، کوشامبی (یوپی)

ڈاکٹر حلیمہ فردوس دنیائے اردو ادب میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ علمی و ادبی چمنستان بنگلور سے تعلق رکھتی ہیں۔ متعدد کتابوں کی مصنفہ ہیں۔

اُن کی پیش نظر تصنیف ''اُجالے یادوں کے'' منظرِ عام پر آئی ہے۔ یہ مجموعہ مختلف شخصیات کے کردار، فکر و فن اور اثرات کو مصنفہ کی ذاتی یادوں اور اُن کے گہرے مشاہدات کی روشنی میں پیش کرتا ہے۔ یہ محض خاکے نہیں بلکہ ایک جذباتی، تہذیبی اور ادبی دستاویز ہے جو اُن ہستیوں کی انفرادیت کو اُجاگر کرتی ہے جن سے مصنفہ اور اُن کے حلقۂ احباب کا گہرا تعلق رہا ہے۔ عنوانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنفہ نے باکمال و متنوع شخصیات کو اپنے خاکوں کا موضوع بنایا ہے۔ یہ مجموعہ کل اٹھارہ خاکوں اور چند مضامین پر مشتمل ہے۔ مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ مصنفہ فنِ خاکہ نگاری کے لوازمات سے بخوبی واقف ہیں کہ اُن کا قلم صرف تصویر نہیں کھینچتا بلکہ منتخب شخصیات کے روحانی و باطنی عکس و اثر انگیزی کو بھی نمایاں کرتا ہے۔

کتاب کا آغاز ''میں نے خاکے کیوں لکھے؟'' سے ہوتا ہے جو خاکہ نگار کی غرض و غایت، انتخاب اشخاص اور اُن سے ان کی علمی و فکری اور جذباتی وابستگی کا جواز فراہم کرتا ہے اور اسلوب نگارش کی طرف رہنمائی بھی کرتا ہے۔ بقول خاکہ نگار ''میرے خاکوں کا محور ذی وقار معروف شخصیات ہی نہیں ہم کفو، ہم نفس اور رفتگاں بھی ہیں۔ بیشتر خاکوں کی فضا ماضی کی یادوں سے معطر ہے۔ اُن خاکوں کی ابتدا کبھی زندگی و موت کے فلسفے سے تو کبھی بدلتے اخلاقی اقدار اور کبھی شہروں کی جغرافیائی تبدیلی کے ذکر سے ہوتی ہے۔ تمہید کے بعد چشم دید واقعات، مشاہدات اور تجربات کی بنیاد پر صاحب خاکہ کی مرقع کشی کی گئی ہے... ان خاکوں میں بیانیہ طرز اظہار کے علاوہ مکالماتی انداز اور کہیں خود کلامی بھی ملتی ہے۔'' (ص: 7)

مجموعے کا بڑا حصہ ایسی شخصیات پر مشتمل ہے جنھوں نے علم و آگہی، شعور و ادراک، زبان و ادب اور درس و تدریس میں بے مثال خدمات انجام دی ہیں۔ ''شجر سایہ دار: پروفیسر محمد ہاشم علی''، ''خالد سعید: سادہ لوح پروفیسر'' اور ''ڈاکٹر صغریٰ عالم: پیار و محبت کی امین'' وغیرہ خاکے اساتذہ اور علمائے فن کی نہ صرف قلمی تصویر پیش کرتے ہیں بلکہ اُن کی حیات سے ملنے والے عبرت آموز اسباق سے بھی روشناس کراتے ہیں۔ اُن کی فہم و بصیرت اور اُن کے تجربات و تربیتی پہلوؤں کو بھی اُجاگر کرتے ہیں۔ بالخصوص ''شجر سایہ دار'' کو مربیانہ و معلّمانہ سرپرستی و نگہداشت کا بہترین استعارہ کہا جا سکتا ہے۔ بقول مصنفہ: ''میں نے اُنھیں ہمیشہ ایک مہربان شوہر، شفیق باپ اور فرض شناس استاد کے روپ میں پایا۔''

''میرے شاعر چاچا: حمید الماس'' اور ''مدیرِ اعظم غازی طنز و مزاح: سید مصطفیٰ کمال'' فنی و فکری شخصیات کے نمائندہ خاکے ہیں۔ ''قصہ خوش طبع فقرہ باز سرجن: ڈاکٹر اسلم سعید'' میں ایک طبیب کے ظرافت انگیز مزاج کے دلچسپ پہلو سامنے آتے ہیں۔ بقول مصنفہ: ڈاکٹر اسلم سعید کی کٹیلی گفتگو کے باوجود وہ خوش طبع واقع ہوئے ہیں۔ طنز و مزاح ان کی رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے۔ ایک بار ایک دوست نے پوچھا: ''اسلم صاحب! آج کل آپ نظر نہیں آ رہے، خیریت؟'' جواب دیا گیا: ''جیل کی ہوا کھا رہا ہوں۔'' اُس وقت اُن کی ملازمت سنٹرل جیل گلبرگہ میں تھی۔

کچھ خاکوں میں شدید جذباتی ربط اور محرومی کی کیفیات بھی نمایاں ہیں، جیسے ''کس سے خالی ہوا جہاں آباد'' اور ''ایک روشن دماغ تھا نہ رہا''۔ یہ خاکے ایسی باعظمت مرحوم شخصیات کی یادوں پر مبنی ہیں جن سے مصنفہ کا گہرا تعلق رہا ہے۔ اُن کے چلے جانے کے بعد پیدا ہونے والے خلا اور حزن و ملال کو بڑے خلوص سے قلم

بند کیا گیا ہے کہ 'عظیم ہستیاں مختصری زندگی میں کارہائے نمایاں انجام دے کر عالم بالا کی جانب لوٹ جاتی ہیں۔ اُن کے گزر جانے سے ایک خلا سا پیدا ہوتا ہے' اور' آج خودنمائی کے دور میں عظیم، ماہر اور دانشور جیسے الفاظ کا مفہوم بدلتا جارہا ہے۔ ایسے میں ایک روشن دماغ اور سچے ادیب کا اٹھ جانا ادب، سائنس اور مذہب کا خسارہ ہے۔'

اسی طرح ''عظیم الدین عظیم: ایک آہنی پیکر'' ایک ایسی شخصیت کا خاکہ ہے جو استقامت، مضبوط ارادے اور محنت و مشقت کی علامت کے طور پر سامنے آتے ہے۔ یہ خاکہ ایک مثبت اور انتہائی حوصلہ بخش پیغام دیتا ہے کہ ''عظیم صاحب کی امانت داری، نفاست پسندی اور سلیقہ مندی ان کی شخصیت کی پہچان تھی۔ وقت کے پابند عظیم الدین عظیم نے اردو مجلسوں کی روایت بدل ڈالی تھی۔'' ''بساطِ حیات کا مہرہ: حافظ کلیم اللہ'' ایک فکر انگیز خاکہ ہے جس میں ایک حافظِ قرآن کی مشقت بھری عملی زندگی کا بھرپور احساس و تجزیہ ملتا ہے کہ 'کشمکش حیات نے ایک حافظ قرآن کو کمپیوٹر آپریٹر بنادیا... ایک مشین کی طرح کام کرنے والا شخص کمپیوٹر پر کام کرتے کرتے وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اُس کی انگلیاں ساکت ہوگئیں اور سانس کے تار ٹوٹ گئے۔'

خواتین کے خاکے بھی نہایت ادب و احترام کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ بعض خاکے کچھ ایسے کرداروں پرمبنی ہیں جن کے مختلف رنگ وروپ ہیں اور بڑے ہی پُرکشش ہیں۔ گویا شخصیات کے مختلف پہلوؤں کو فنکارانہ انداز سے اُجاگر کیا گیا ہے۔ مثلاً: ''بشیر النساء: پیکرِ خلوص'' کہ جن کی شخصیت ملکوں ملکوں ڈھونڈنے والی نایاب ہستی تو نہیں، البتہ! شہروں شہروں تلاش کرنے کے باوجود ایسی پُرخلوص شخصیت کا ملنا محال ہے۔ ''اردو ادب کی مہاجرزادی: پروفیسر شمیم علیم'' جو ہجری ادب میں بادِ شمیم کی طرح طراوت بخشنے والی ہستی کا نام ہے۔ ''ڈاکٹر صغریٰ عالم: پیار و محبت کی امین''۔ صغریٰ عالم کی شاعری میں لفظ محبت کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے نزدیک لفظ محبت زندگی کو سمجھنے کا وسیلہ ہے۔ ''فوزیہ چودھری کی کہانی...''، ایک مکالماتی تحریر ہے جو فوزیہ اور حلیمہ دونوں کے سہارے آگے بڑھتی ہے اور ہر دو خواتین کی فکری شخصیت کا نقشہ کھینچتی ہے۔

مزید خاکوں ''نرم دل گفتگو، گرم دم جستجو: پروفیسر لئیق صلاح''، ''خانوں میں بٹی ہوئی پیاری شخصیت: کہکشاں تبسم''، ''ریاض احمد اور قسمت کا کھیل'' اور ''قلمی چہرے'' میں خوش اخلاقی، حمیت اور مروّت کی خوشبو نمایاں محسوس ہوتی ہے اور کچھ ایسی ہستیاں سامنے آتی ہیں جن کی پیشہ ورانہ طرزِ حیات اور سماجی کردار و عمل مختلف ہونے کے باوجود ایک سبق آموز اکائی میں ڈھل جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں مضامین میں ''عکس درعکس''، ''حلیمہ فردوس''، ''کچھ یادیں کچھ باتیں'' اور ''ڈاکٹر حلیمہ فردوس: درس سے درک تک'' مصنفہ کی شخصیت، فکروفن اور علمی مقام کو واضح کرتے ہیں۔

مجموعی طور پر ''اُجالے یادوں کے'' میں موضوعاتی حسن و وسعت کا خوب صورت امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے اور اُس کے پردے میں حیاتِ انسانی کی نوع بہ نوع جہات سے آشنائی ہوتی ہے۔ بالخصوص شاعر، ڈاکٹر، پروفیسر، معلم، ایڈیٹر اور گھریلو خواتین سبھی طبقوں کی نمائندگی اس مجموعے کے دائرۂ اثر کو وسیع تر بنادیتی ہے۔ یہ خاکے محض تعریف و مدح کے الفاظ و جملے نہیں ہیں، بلکہ باکمال و فنکار شخصیات کی روح کی گہرائی میں جھانکنے کی ایک انوکھی کوشش ہیں۔ چند فروگزاشتوں 'جملوں کی طوالت، بعض جگہ غیر ضروری الفاظ اور عقیدت آمیز غلو سے صرفِ نظر کرلیا جائے، تو یہ مجموعہ اردو زبان و ادب میں صنفِ خاکہ نگاری کو مضبوط اور توانا بنانے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے اور قاری کو ایک دل آویز فکری و تخیلاتی سفر پر آمادہ کرنے کا عمدہ ذریعہ ثابت ہوسکتا ہے۔

ترتیب

تابش مہدی: یادیں باتیں

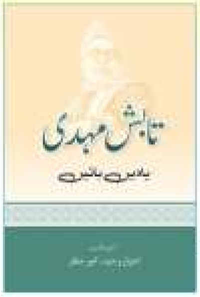

ترتیب وتہذیب: امتیاز وحید، عمیر منظر

صفحات: 456، قیمت: 550 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: مرکزی پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: ڈاکٹر محمد سعید اختر

613/P-18 KH-514، زینب مسجد، ملت نگر، فیض اللہ گنج لکھنؤ۔ 226020 (یوپی)

ڈاکٹر تابش مہدی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب ''تابش مہدی: یادیں باتیں'' ان کی شخصیت کے تنوع کا ایک دلآویز مجموعہ ہے۔ اس کتاب کو ایک دستاویزی مجموعہ کہا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کو تابش مہدی کے ممتاز شاگردوں ڈاکٹر عمیر منظر اور ڈاکٹر امتیاز وحید نے مرتب کیا ہے۔ قلم کاروں نے ان سے وابستہ اپنی یادوں اور تاثرات کو قلم بند کیا ہے۔ یہ کتاب استاد اور شاگرد کے سرگرم رشتے کا اشاریہ بھی ہے۔ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ اکابرین کے علاوہ ایک باب احباب و معاصرین پر مشتمل ہے۔ جن میں مختلف زاویوں سے تابش مہدی کی شخصیت اور ان سے اخذ و استفادے کی مختلف صورتوں کو پیش کیا گیا ہے۔ لکھنے والوں میں ہر عمر کے لوگ موجود ہیں۔ جہاں گھر کے چھوٹے بچوں کی تحریریں ہیں وہیں ملک کے ممتاز مصنفین نے بھی انھیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس کتاب کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ لکھنے والوں میں ہندستان کے بیشتر علاقوں کے لوگ شامل ہیں۔

دیباچے میں مرتبین نے کتاب کے پس منظر، تابش مہدی سے ذاتی تعلق اور اس کتاب کی افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ دیباچہ پڑھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف تاثرات کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک فکری و تحقیقی دستاویز ہے جس کی ترتیب میں ادبی معیار کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

پہلا باب اکابرین کے نام سے ہے جن میں سات مضامین شامل ہیں، ان میں قاری ابوالحسن اعظمی، ڈاکٹر منظور عالم، پروفیسر اختر الواسع، مولانا عبدالعلی فاروقی اور سید سعادت اللہ حسینی جیسے دانشور اور معتبر اہل قلم نے تابش مہدی کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو پیش کیا ہے۔ قاری ابوالحسن اعظمی نے لکھا ہے کہ ''تابش مہدی اپنے خصائل اور دلکش اداؤں کے باعث ہمیشہ محترم ہی رہے۔ ڈاکٹر منظور عالم نے انھیں ذاتی طور پر ایک ذمے دار انسان قرار دیا ہے۔ پروفیسر اختر الواسع کے بقول وہ ایک مرنجاں مرنج قسم کے آدمی تھے اور ان کے فکری افق کو وسیع قرار دیا ہے''۔ محسن عثمانی ندوی نے لکھا ہے کہ ''فن قرأت کے وہ ایک ممتاز عالم کے ساتھ ساتھ زبان و ادب پر ان کو غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔'' سید سعادت اللہ حسینی کا ماننا ہے کہ ''اردو زبان کے بہت

سے ایسے گوشے مجھے ان سے سیکھنے کو ملے جن سے ابھی تک شناسائی نہیں تھی‘‘۔

دوسرا باب ’احباب و معاصرین‘ کے نام سے ہے۔ یہ کتاب کا سب سے وسیع باب ہے، جس میں انتظار نعیم، ڈاکٹر حسن رضا، عبدالمتین منیری، احمد حاطب صدیقی (ابونثر) سہیل انجم، معصوم مرادآبادی، ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی، پروفیسر احمد محفوظ، پروفیسر سراج اجملی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، مولانا ضیاء الحق خیرآبادی، معین شاداب، مولانا بدرالاسلام قاسمی، مفتی رحمت اللہ ندوی، مولانا سعود الحسن صدیقی ندوی، ڈاکٹر نور فاطمہ، محمد اویس سنبھلی وغیرہ پر مشتمل 35 اہل قلم کی تحریریں شامل ہیں۔

ان تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ تابش مہدی ایک علم دوست اور نہایت شفاف طبیعت کے مالک تھے۔ کئی تحریروں میں ان کے علمی تقاضوں کے ساتھ ساتھ ان کی محبت، سادگی اور ملنساری کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ بعض تحریروں میں ان کی علمی تخئی اور تحقیق میں اصول پسندی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ سہیل انجم نے ڈاکٹر تابش مہدی کی شخصیت کو کثیر الجہات قرار دیا ہے۔ جب کہ پروفیسر احمد محفوظ نے تابش مہدی کی زندگی کو حقیقی معنی میں مشرقی تہذیب وروایت کا ایسا نمونہ قرار دیا ہے، جس کی مثال اب بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔

تیسرا باب شاگردان کے نام سے ہے۔ اس باب میں بہت سے معتبر قلم کاروں اور مصنفین کی تحریریں شامل ہیں مگر اس باب میں شامل تمام لوگ ان کے شاگرد ہیں۔ شاگردوں کی تحریریں تابش مہدی کی تدریسی عظمت کی آئینہ دار ہیں۔ اس میں تمیں شاگردوں کے تاثرات شامل ہیں جن میں حافظ محمد اکرم قاسمی، ڈاکٹر منور حسن کمال ، ڈاکٹر محمد ارشد، ڈاکٹر محمد اکرم السلام، ڈاکٹر محمد طارق احسن ، ڈاکٹر امتیاز وحید، ڈاکٹر عمیر منظر، ڈاکٹر نجم السحر ثاقب، نعمان بدر، زبیر سعیدی، سحر محمود، عمران اشرف، نازش نہال، رمیصا رحمن وغیرہ شامل ہیں۔

ان تحریروں میں تابش مہدی کو ایک ایسا استاد بتایا گیا ہے جو محض تعلیم دینے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ تربیت و رہنمائی کو اولین حیثیت دیتے تھے۔ کسی تحریر میں ان کی علمی دیانت کا ذکر ہے تو کسی میں ان کی حوصلہ افزائی کرنے والی شخصیت کا۔ اس باب میں بے شمار واقعات ان کے شاگردوں نے بیان کیے ہیں جو ان سب کے دیکھے اور برتے ہوئے ہیں اس سے تابش مہدی کی علم دوستی، شاگردوں کے تئیں بے پناہ فکرمندی اور علم وادب کی ترویج و اشاعت کے تئیں ان کے شوق و جستجو کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ جس طرح کے استاد تھے ان کے شاگردوں نے صرف ان سے علم وادب نہیں سیکھا بلکہ اخلاق و تربیت کے وہ زریں اصول جو ڈاکٹر تابش مہدی کا زندگی نامہ ہے وہ بھی حاصل کیا۔ اس کا اندازہ اس کتاب سے ہوتا ہے۔ کیونکہ تابش مہدی کسی تعلیمی ادارے سے وابستہ نہیں تھے بلکہ ایک شاعر اور تجوید کے استاد کے طور پر انھوں نے اپنی خدمات مختلف انداز میں انجام دیں اور یہی خدمات ان کے حق میں صدقہ جاریہ بن گئیں۔

چوتھے باب میں تابش مہدی کے اہل خانہ کے تاثرات اور احساسات مضامین کی شکل میں شامل ہیں۔ ان مضامین میں تابش مہدی کی گھریلو زندگی، ان کی محبت، خاندانی روابط اور انسان دوستی کا ذکر ہے۔ یہ حصہ قاری کو تابش مہدی کے باطن کی جانب لے جاتا ہے۔ اہلیہ کے علاوہ بیٹے اور بیٹیوں اور دیگر اعزا کے مضامین شامل ہیں جن میں بہت سے بچے بھی شامل ہیں۔ یہ باب 16 افراد پر مشتمل ہے۔ ان میں رضیہ عثانی، ڈاکٹر ثمینہ تابش، دانش فاروق شاہ اجمل، سید محسن عثانی وغیرہ کے مضامین ہیں۔ ان میں تابش مہدی کی عام گھریلو زندگی، معمولات اور بیماری کے ایام کو بہت سلیقے سے قلم بند کیا گیا ہے۔ ان کو پڑھ کر ایک اچھے گھر کا نقشہ اور عمدہ تربیت کے بہت سے نمونے اکٹھے کیے جا سکتے ہیں۔ غم واندوہ اور لطف وانبساط کے بہت سے پہلوؤں پر یہ باب قاری کو ہنساتا ہے اور غم واندوہ کی کیفیت سے دوچار بھی کرتا ہے۔

پانچواں باب ’منظوم خراج عقیدت‘ کے نام سے ہے۔ اس میں مہدی پرتاپ گڑھی، تنویر پھول، طلحہ تابش، طاہر بلال، امتیاز ماہر، نازش نہال، ریاض قاصد وغیرہ نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

کتاب کا اسلوب تحقیقی کے بجائے تاثراتی ہے۔ ہر باب میں ترتیب کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ زبان سادہ مگر اثر انگیز ہے۔

’’تابش مہدی یادیں باتیں‘‘ شخصیت کو سمجھنے، تعلیمی نظام اور تربیتی نقطہ نظر پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ یہ کتاب تابش مہدی کی فکری و ادبی میراث کا زندہ ثبوت ہے۔ اس طرح کی کتابیں کسی شخصیت کو تاریخ میں محفوظ کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔

تنقید و تبصرے

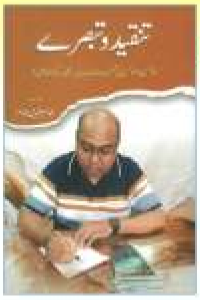

احسن امام احسن کی شخصیت اور خدمات پر لکھے گئے مضامین

مرتب: امام الدین امام

صفحات: 376، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: جواد الاسلام

ریسرچ اسکالر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

امام الدین امام اردو ادب کے اسکالر ہیں، کتاب ’’تنقید و تبصرے‘‘ میں شاعر، ادیب اور تذکرہ نگار احسن امام احسن کی ہر طرح کی تخلیقی اور فکری کاوشوں پر ملک بھر کے معتبر قلم کاروں کے 52 مضامین، تاثرات اور تبصرے شامل ہیں۔

مرتب نے مقدمے میں احسن امام احسن کی شخصیت کو علی گڑھ تحریک، ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے پس منظر میں پرکھا ہے، مگر وہ انھیں کسی مخصوص تحریک کا اسیر ماننے سے گریز کرتے ہیں اور انھیں ’’اپنا زمانہ آپ بنانے والا‘‘ قلم کار قرار دیتے ہیں، جو ایک آزاد اور انفرادی نظریہ رکھتا ہے۔ مقدمے میں احسن امام کی شعری تخلیقات جیسے ’’سمندر شناس‘‘ اور ’’خواب کا سمندر‘‘ اور نثری کاوشوں پر متوازن روشنی ڈالی گئی ہے اور شاعر کی غزلوں میں خود اعتمادی، کرب جہاں اور سائنسی ایجادات کے اثرات کو موضوع بنایا گیا ہے۔

امام الدین امام کی ترتیب میں تحقیقی احتیاط، لسانی ربط، اور فکری دیانت نمایاں ہے۔ وہ نہ صرف مواد کے انتخاب میں سنجیدہ نظر آتے ہیں بلکہ ہر مضمون کی فکری بنیادوں پر نگاہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں ضرورت محسوس کرتے ہیں وہاں علمی اصلاح بھی کرتے ہیں۔

اردو ادب کے اساتذہ پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، پروفیسر انور پاشا،

پروفیسر کوثر مظہری، پروفیسر ظہیر رحمتی اور پروفیسر ابوبکر عباد نے امام الدین امام کی صلاحیت کے ساتھ احسن امام احسن کی خدمات کو صفحۂ قرطاس پر محفوظ کرنے کی کاوش کو لائق تحسین قرار دیتے ہوئے اسے اردو کی تنقیدی روایت میں اضافہ گردانا ہے۔ جس سے اس کتاب کی اہمیت وضرورت کا پتہ چلتا ہے۔

کتاب ''تنقید و تبصرے'' کا آغاز ایک شاندار ترتیب کے ساتھ ہوتا ہے۔ سب سے پہلے، کتاب کا انتساب مرتب کے مربی پروفیسر سیّد آل ظفر کے نام، علامہ اقبال کے ایک شعر کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد پروفیسر ظہیر رحمتی کا حرفِ تبریک' شامل ہے۔ مرتب امام الدین امام کا جامع اور وضاحت سے بھر پور 'مقدمہ' ہے۔ مقدمے کے بعد، احسن امام احسن کی شخصیت کے درخشاں پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لیے دواہم چیزیں شامل کی گئی ہیں: ایک ڈاکٹر مظاہر الحق کی احسن امام احسن کی نگارشات پر تحریر، اور دوسرا رئیس اعظم حیدری کا احسن امام احسن سے لیا گیا انٹرویو۔

احسن امام حسن 11/اکتوبر 1968 کو ہزاری باغ میں پیدا ہوئے، والد حسن امام کے انتقال کے بعد آپ نے محکمہ سینٹرل مائن پلاننگ میں ملازمت کی پیشہ ورانہ ذمے داریوں کے ساتھ، ادب کی خدمت کو اپنا روحانی شعار بنایا۔

تمہیدی حصے کے بعد کتاب کو نظم، نثر اور تاثرات وتبصرے جیسے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے تاکہ تمام فکری وادبی جہات کا احاطہ مکمل ہو۔ پوری کتاب میں قلم کاروں کی عمر اور علمی مرتبے کے لحاظ سے باوقار ترتیب کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

کتاب کا پہلا اور سب سے بڑا حصہ 'حصہ نظم' ہے۔ یہ مکمل طور پر احسن امام احسن کی شاعری پر مرکوز ہے، خاص طور پر ان کے مجموعوں ''سمندر شناس'' اور "خواب کا سمندر" پر۔ اس حصے میں 26 تنقیدی، تبصراتی اور تاثراتی مضامین شامل ہیں جو مختلف اہل قلم کی کاوش ہیں، جہاں ناقدین نے احسن امام احسن کی شاعری کے عصری کرب، فکری پختگی اور انسان دوستی جیسے اہم موضوعات کو بہت تفصیل سے اجاگر کیا ہے، ان میں پروفیسر علی احمد فاطمی، سعید رحمانی، ڈاکٹر مظاہر الحق، سیف از ہر اور دیگر معروف اہل قلم کی تحریریں علمی گہرائی رکھتی ہیں، تاہم بعض مضامین عمومی یا تاثراتی نوعیت کے ہیں۔ مرتب نے دیانت داری کے ساتھ نشاندہی کی ہے کہ چند مضامین میں معلومات پرانی ہیں، بعض میں عروضی غلطیاں موجود ہیں، اور کچھ تحریریں زبان کے اعتبار سے کمزور ہیں۔ مثلاً جی۔ ایم۔ جاوید کا مضمون اُس وقت تحریر ہوا جب احسن امام احسن کی صرف دو کتابیں شائع ہوئی تھیں، اس لیے اس کا دائرہ محدود ہے۔ اسی طرح انور بھدرکی نے ''عروضی گہرائی'' میں مبالغے سے کام لیا، اور شاہینہ پروین نے مصرعہ طرح کو قوسین کا غلط مفہوم دیا— یہ تمام نکات مرتب کی باریک بینی اور علمی گرفت کا پتہ دیتے ہیں۔

کتاب کا دوسرا حصہ 'حصہ نثر' سے موسوم ہے، جس میں اکیس (21) مضامین شامل ہیں۔ جو خاص کر ان کی نثری کتب ''مہاراشٹر کے قلم کار''، ''جھارکھنڈ کے قلم کار''، ''بہار، بنگال اور اڑیسہ کے قلم کار'' اور ''اتر پردیش کے قلم کار' پر روشنی ڈالتے ہے جن میں ہندوستان کے مختلف صوبہ جاتی قلم کاروں کا ذکر جمیل آیا ہے۔ اس حصے کا سب سے درخشاں گوہر، پروفیسر ابوذر عثمانی مرحوم کی وہ سیر حاصل تحریریں ہیں، جنھوں نے احسن امام احسن کی تین مختلف کتابوں میں پیش لفظ اور تقریظ لکھی ہے۔ مرتب نے جرأت کے ساتھ ڈاکٹر قسیم اختر کے مضمون میں موجود حوالہ جاتی غلطیوں کی تصحیح کی اور طلعت انجم فخر کے مضمون کے افسانوی طرز آغاز کو تنقید کے لیے نامناسب قرار دیا، جو یہ ثابت کرتا ہے کہ ان کی نظر میں اصولِ تحقیق اور معروضی زبان کی اہمیت، سینئر یا جونیئر کی حیثیت سے بالاتر ہے۔

کتاب کا تیسرا اور اہم حصہ ''تبصرے و تاثرات'' ہے، جو اس پوری علمی کاوش کی اجتماعی فکری توثیق اور مستند علمی سند کا باب ہے۔ مرتب امام الدین امام نے کمال دانشمندی سے اس حصے میں پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، ڈاکٹر محمد انعام برنی کے ساتھ ساتھ نئے قلم کاروں کی تازہ آرا کو بھی شامل کیا ہے۔ یہ امتزاج محض ایک تعریفی مجموعہ نہیں، بلکہ ایک تاریخی گواہی ہے کہ احسن امام احسن کی فکری خدمات کو ادب کے ہر طبقے۔ چاہے وہ قدآور ہو یا نو وارد۔ نے سنجیدگی سے لیا ہے۔ یہ پرخلوص شمولیت مرتب کی جانب سے ایک گمنام قلم کار کی بازیافت کی کوشش کو تحقیقی استناد اور علمی حلقوں کی قوی سند عطا کرتی ہے، جو مجموعے کی وقعت کو دوچند کر دیتی ہے۔

اس مجموعے کے مطالعے کے بعد مجھے یہ گہرا احساس اور اعتراف ہوتا ہے کہ یہ مشاہیر و نو واردانِ قلم کی تحریروں کا ایک علمی نمونہ ہے۔ میری یہ مخلصانہ التجا ہے کہ اگر آئندہ اشاعت میں اغلاطِ طباعت و املائی کوتاہیوں کی اصلاح کر لی جائے، تو یہ کتاب احسن شناسی کے باب میں ایک گراں قدر اضافہ ثابت ہوگی، ہم مرتب امام الدین امام کو اس سلیقہ مند کاوش پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے، یہ آرزو کرتے ہیں کہ امام اور احسن دونوں ہستیاں علمی رفعتوں کی سیڑھیاں مسلسل طے کرتی رہیں۔

ادراک اردو ادب

مرتب: سید ساجد علی ٹونکی
صفحات: 208، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2025
ناشر: علی پبلی کیشنز، نیو علی منزل، رجبن ٹونک (راجستھان)
مبصر: ڈاکٹر تسنیم بانو
شاکر بلڈنگ، سی 2، گلی نمبر 3، وزیر آباد، دہلی۔ 110084

کتاب ''ادراک اردو ادب'' کے مرتب سید ساجد علی ٹونکی ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب مقابلہ جاتی امتحان کے لیے مرتب کی گئی ہے جو بی اے اور ایم اے کی نصابی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے بھی معاون ثابت ہوگی۔ اس کتاب کو اردو کی شعری اور نثری اصناف کے سوال وجواب کے انداز میں قلم بند کیا گیا ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ اب تک کی سترہویں اشاعت ہے۔ اس میں پہلے سوال درج کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد سوال کا مختصر جواب درج ہے۔ کتاب میں پہلے فہرست مضامین کی ترتیب موجود ہے۔ اس کے بعد مختصر 4 صفحے کا عرض مرتب ہے جس میں انھوں نے صاف صاف درج کیا ہے کہ یہ مواد زمانہ طالب علمی کے ایم اے کے نوٹس تھے جس کو نیٹ امتحان کے لیے تیار کیا گیا تھا۔

نثری اور شعری مختلف اصناف کے ساتھ ساتھ ادارے اور کالج پر بھی سوال ہے اس کے بعد جواب دیا گیا ہے۔ جیسے فورٹ ولیم کالج کب اور کیوں بنا؟ فورٹ ولیم

کالج کے معروف اردو مترجم اور مصنفین کے بارے میں بتائیے؟ دلی کالج کا قیام کب اور کہاں عمل میں آیا؟ 1857 کے اثرات دلّی کالج پر کیا مرتب ہوئے؟ وغیرہ سوال موجود ہیں۔ اردو زبان کا آغاز و ارتقا اردو نثر کا جائزہ اور اردو کے افسانوی ادب (مختصر افسانہ، ناول، ڈرامہ اور داستان) کا آغاز، کب، کہاں، کیسے جیسے مختصر سوالات کے جوابات بھی اختصار کے ساتھ قلمبند کیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی نظم اور نثر میں فرق کیا ہے؟ دکن میں اردو نثر کا آغاز کب ہوا؟ ادب اور افسانوی ادب کسے کہتے ہیں؟ مختصر افسانہ کیا ہے؟ مختصر افسانے کے اجزائے ترکیبی بتائیے؟، داستان اور ناول میں کیا فرق ہے؟، ڈرامے کتنی قسم کے ہوتے ہیں جیسے اور بھی سوال دیکھنے کو ملتے ہیں۔ آگے اردو کا غیر افسانوی ادب، (خاکہ نگاری، خودنوشت، سوانح حیات، سفر نامے، ترجمے، اردو صحافت، مضمون، انشائیے، مقالے، رپورتاژ، طنز و مزاح، مقالے اور خطوط) سے متعلق سوالات درج ہیں۔ اردو میں افسانوی اور غیر افسانوی ادب سے کیا مراد ہے؟ خاکہ نگاری کسے کہتے ہیں؟ اردو کی کچھ مشہور خودنوشت اور سوانح حیات کے نام بتائیے؟ مقالہ اور انشائیہ میں فرق کیا ہے؟ رپورتاژ کسے کہتے ہیں؟ وغیرہ۔ سرسید احمد خان اور ان کے رفقا میں سرسید کی تصانیف اور تحریر کا ہی ذکر ملتا ہے۔ رفقا میں صرف رفقاء کے نام کی فہرست دی ہے۔ حالی اور شبلی پر دو سے تین سطر ہے۔ اس حصے میں کمی محسوس ہوتی ہے۔ اگر سرسید کے رفقا کے بارے میں اور درج کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ اردو تنقید، تحقیق اور تذکرہ نگاری میں پہلا سوال بہترین ہے۔ تحقیق، تدوین اور تنقید میں کیا فرق ہے؟، اردو کے دس نامور محقق اور نقاد کی اہم تصانیف کے نام بتائیے؟ جیسے سوال کے جواب بہترین اور مکمل درج ہیں۔ لیکن بعض نقاد، محقق کا سنہ پیدائش اور تصنیف کا سنہ اشاعت غلط درج ہے۔ اس کو درست کرنے کی ضرورت ہے۔

اردو شاعری (غزل، نظم، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی، قطعات، مسمّط، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مسبّع، مثمّن، متسع اور معشر) کے نام سے درج ہے۔ غزل کسے کہتے ہیں؟ غزل کے فنی لوازمات اور اس کی خصوصیات بتائیے؟ نظم کسے کہتے ہیں؟ اس کے اقسام بتائیے؟ قصیدہ کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ مثنوی کی فنی خصوصیات بتائیے؟ اردو مثنوی کا آغاز کب اور کہاں ہوا؟ وغیرہ کے جواب مختصر انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ان کی مثالیں بھی رقم کی گئی ہیں۔ اردو شاعری کی دیگر اصناف (متفرقات) حمد، نعت، منقبت، مناجات، شہر آشوب، واسوخت، تضمین، پیروڈی، ریختی، ماہیے، ہائیکو، توشیحی نظمیں اور دوہے کی تعریف بیان کی گئی ہے نیز ان اصناف کی شعری مثالیں بھی موجود ہیں۔ اردو میں صنعتوں اور تراکیب کا استعمال (تشبیہ، استعارہ، تلمیح، مبالغہ، تضاد، حسن تعلیل، مراعات النظیر، ایہام، تجنیس، لف ونشر، اشتقاق) کے ساتھ تعریف مع مثال لکھی ہے۔

اس کتاب کا سب سے اہم حصہ ادبیات راجستھان ہے۔ ایک سیٹ راجستھان کے شعری اور نثری ادب سے متعلق ہے۔ جس میں راجستھان کے معروف شعرا، ادبا، نقاد اور محقق کے ادبی کارنامے اور ان کی تحریر کردہ تصنیف کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میں تقریباً 55 مصنفین کا مختصراً ذکر کیا ہے۔ پروفیسر محمود خاں شیرانی سے لے کر ڈاکٹر قمر جہاں تک کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ حصہ خاص کر ان طالب علموں کے لیے مخصوص ہے جو راجستھان کے مقابلہ جاتی امتحان میں بیٹھ رہے ہیں یا یونیورسٹی یا کالج کے وہ طلبہ جن کے نصاب میں راجستھان کا اردو ادب شامل ہے۔ ان کے لیے کارگر ثابت ہوگا۔ اس کے بعد سوال و جواب کے کل چار سیٹ شامل کیے گئے ہیں۔ تین ادبی سیٹ ہیں۔ ہر ایک سیٹ میں بیس بیس (20-20) سوال ہیں۔ پھر ہر بیس سوال کے جواب ایک ساتھ موجود ہیں۔ الگ سے سوالات ادبیات راجستھان کے نام سے لکھا گیا ہے۔ ادبیات راجستھان یونیورسٹی سے متعلق ایک سیٹ (یعنی 20 سوال) سوال و جواب کا درج کیا گیا ہے۔ اس طرح کل ۸۰ سوال و جواب ہیں۔

اس کتاب کا ٹائٹل کور اور ڈیزائن دلکش ہے۔ لیکن اس میں بیشتر دو لفظ اور حروف کے درمیان خالی جگہ موجود ہے۔ تصنیف کا سنہ اشاعت اور شعرا و ادبا کی جائے پیدائش درست نہیں ہے۔ سید ساجد علی ٹونکی نے اس کتاب کو چھوٹے سوالات اور جوابات کی طرز پر لکھا ہے۔ اپنے نوٹس کو یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کرا کر ایک بڑا مفید کارنامہ انجام دیا ہے۔ توقع ہے کہ اس طرح کی اور کتابیں لکھ کر دامان اردو کو مالا مال کرتے رہیں گے۔ یہ کتاب نصابی ضرورتوں کی تکمیل کے ساتھ مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے بھی مفید ثابت ہو سکتی ہے اور معروضی سوالات کے لیے ذہن بہتر طور پر تیار ہو سکتا ہے۔

شاعری

دیوان شاہد

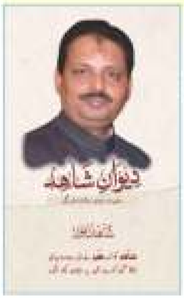

شاعر : شاہد انور

صفحات: 224، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر : ترسیل پبلیشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس۔ نئی دہلی

مبصر : پروفیسر عفت زریں

صدر، شعبۂ اردو۔ ماتا سندری کالج، دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

گلزار دہلوی نے کہا تھا:

گلزار آبروئے سخن اب ہمیں سے ہے
دہلی میں اپنے بعد وہ لطفِ سخن کہاں

مگر شاہد انور کے تیسرے مجموعۂ سخن ''دیوانِ شاہد'' کے بعد مشاہیر بھی یہ مانتے ہیں کہ دہلوی لطفِ سخن ابھی باقی ہے۔ مشہور ادیب، شاعر اور معتدد کتب کے مُرتّب جناب فاروق ارگلی فرماتے ہیں: ''اردو ادب و تہذیب کی جان اور شان بھی وقت کے ناگزیر تغیرات کا شکار ہوئی اور فنِ تخلیق کی عظمت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ شہرِ سخن یعنی میر و غالب کی دلّی خالی خالی سی لگنے لگی پھر بھی اس خاکستر میں دبی کوئی چنگاری بھڑک کر ذہنوں میں اجالا پیدا کر دیتی ہے۔ ایسے وقت میں تازہ تر مثال جواں فکر و جواں سال شاعر شاہد انور نے اپنی علمیت، محنت، ریاضت اور خداداد تخلیقی ریاضت سے تقریباً بے جان ہو چکے دبستانِ دہلی میں جیسے ایک نئی جان ڈال دی ہے۔ اردو شاعری کی خوبصورت روایات اور اقدارِ سخن کو اس خوش بیان شاعر نے روشن کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مجھے قوی یقین ہے کہ انھیں عہد حاضر کی شعری تنقید نظر انداز نہیں کر سکے گی۔''

بہت دن بعد بہت خوبصورت اور ہر لحاظ سے پُرکشش کتاب دیکھنے اور پڑھنے کو ملی۔ کتاب کے بیک کور پر احمد فراز کے تاثرات ان کے دستخط کے ساتھ موجود

ہیں۔ یہ تاثرات صرف چار جملوں پر مشتمل ہیں مگر شاہد انور کا ماضی، حال اور مستقبل سب کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ فلیپ میں دائیں طرف مشہور ناقد جناب حقانی القاسمی کی مختصر مگر جامع تحریر ہے اور بائیں جانب فلیپ پر شاہد انور کے پورٹریٹ کے ساتھ ان کا یہ سگنیچر شعر موجود ہے۔

میر و غالب کا ہے آباد دبستاں مجھ سے
ہلکا ہلکا ہے مگر ہے تو چراغاں مجھ سے

انتساب فاروق ارگلی صاحب اور بیگم شاہد کے نام ہے۔ ابتدا میں مشاہیرِ ادب کے تاثرات ہیں جن میں سرِ فہرست احمد فراز، فاروق ارگلی، ڈاکٹر وحید احمد، سلیم شیرازی، ارشد غازی، یہ خاکسار، یونیورسٹی آف ٹورونٹو کینیڈا سے ڈاکٹر شمیم احمد اور چند سطور بیگم شاہد انور کی شامل ہیں جو سلیم شیرازی صاحب کے اصرار پر لکھی گئی ہیں۔ مضامین میں، جناب فاروق ارگلی، ڈاکٹر وحید احمد، جناب سلیم شیرازی اور من آنم کے عنوان سے اس دیوان کے سلسلے میں مختصر روداد ہے۔ دیوان کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ نقشِ اول۔ حمد و نعت اور نقشِ دوم۔ غزلیات پر مشتمل ہے۔ گو کہ دیوان کے معنی ہی حروفِ تہجی کے اعتبار سے ردیف وار غزلیات کا مجموعہ ہے مگر شاہد نے اس کو واضح بھی کر دیا ہے۔ ''ردیف وار دیوان، باہتمام حروفِ تہجی''۔ ثقیل قوافی کا انوکھی ردیفوں کے ساتھ سادگی سے استعمال اس دیوان کی خصوصیت ہے۔ مجھے یہاں چند اشعار نمونے کے طور پر لکھنے چاہیے، مگر سب اشعار انتخاب کے لائق محسوس ہوئے۔ لہٰذا میں قارئین پر اس کا فیصلہ چھوڑتی ہوں۔

دراصل دیوان کی ترتیب و تدوین کے آثار دکن سے ملتے ہیں۔ جس کا سہرا محمد قلی قطب شاہ کے سر ہے۔ میر تقی میر کے آٹھ دواوین، مصحفی کے سات دواوین اور غالب کا دیوان تو جانِ زبان اور ہمارا ادبی اثاثہ ہے۔ یہ سلسلہ ایک زمانے سے گویا رکا ہوا تھا۔ مجموعہ کلام تو بے شمار نظر آئے ہیں، مگر فی زمانہ شعرا کے دیوان مجھے اپنی عمر میں دیکھنے کو نہیں ملے۔ مگر شاہد انور نے اس سلسلے میں اس دور کے شعرا میں پہل کی ہے۔

میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ آج کے دور میں جب اہلِ فن اور اہلِ سخن روایات کی موت کا تماشا دیکھ رہے ہیں، دیوان مرتب کرنا آسان نہیں، مگر شاہد نے کیا، جس کے لیے میں خوش بھی ہوں اور دعا گو بھی۔

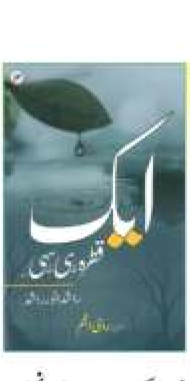

ایک قطرہ ہی سہی

شاعر: راشد انور راشد، مرتبہ: روحی انجم

صفحات: 216، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت:

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دلشاد کالونی، دہلی۔ 95

مبصر: ڈاکٹر منور حسن کمال

N-93، فورتھ فلور، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

''میں غزل اور نظم کو خانوں میں رکھ کر راشد انور راشد کے بارے میں نہیں سوچتا۔ وہ شاعر ہیں اور شاعری کے لیے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ بے حد حساس، بے حد جذباتی ہیں اور شاعری کے ساتھ ان کی وابستگی بے لوث ہے، جسے تشہیر اور ڈگڈگی بجا کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

پروفیسر عتیق اللہ کے یہ الفاظ راشد انور راشد کی شاعری کو پرکھنے کے لیے کافی ہیں۔ راشد انور نے اپنی شاعری سے جہاں نئی نسل کو متاثر کیا ہے، وہیں استاد شعرا نے بھی ان کے کلام کو سراہا ہے۔ راشد بڑے پرگو شاعر تھے۔ رسائل کو اپنی ایک غزل کی فرمائش پر دو تین غزلیں بھیج دیتے تھے۔ ان کے یہاں تجربہ برائے تجربہ نہیں بلکہ عصری تقاضوں کو سمجھنے کی صلاحیت بھی خوب ہے۔ شدت اظہار کے لیے نئی غزل جن کیفیتوں کی متقاضی ہے، وہ ان کے یہاں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ادبی حلقوں میں کوئی شاعر یونہی ممتاز نہیں ہو جاتا۔ اس نے اپنی شاعری کو خونِ جگر پلا کر پروان چڑھایا ہوتا ہے اور پھر عصری آگہی اس کو اپنے ہم عصروں میں وہ تفوق عطا کرتی ہے، جو اس شاعر کا شناخت نامہ بن جاتا ہے، ہر غزل اور نظم میں نئے دستخط نظر آتے ہیں، جس سے پڑھنے کا لطف دوبالا اور جداگانہ ہو جاتا ہے۔

راشد انور راشد نے 'اعتراف' جو 'ایک قطرہ ہی سہی' میں شامل کے تحت لکھا ہے:

''زندگی کی پہیلی اتنی پیچیدہ ہوتی ہے کہ کوئی بھی اس پہیلی کو سلجھا نہیں پاتا۔ زندگی ہر پل رنگ بدلتی ہے اور اس کے نشیب و فراز سے کوئی محفوظ نہیں رہتا۔ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب خاموشی کے ساتھ اس اسٹیج پر زندگی کی شکل میں اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں، لیکن زندگی کی کہانی میں کب، کون سا نیا موڑ آ جائے، اس سے کوئی بھی واقف نہیں ہوتا۔ زندگی میں اتار چڑھاؤ اور نشیب و فراز کا سلسلہ مسلسل جاری رہتا ہے۔ تقدیر کے مطابق وقفے وقفے سے آزمائشوں کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ کبھی کبھی آزمائشیں، سخت اور طویل بھی ہوتی چلی جاتی ہیں، لیکن ایسے نازک مرحلوں پر امید، ہمت اور حوصلے کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ خالقِ کائنات نے اگر آزمائشوں میں مبتلا رکھا ہے تو وہی ان آزمائشوں سے نجات کا راستہ بھی نکالے گا۔ اس کی رحمتوں سے کسی بھی طرح مایوس نہیں ہونا چاہیے۔'' (ایک قطرہ ہی سہی، ص 35-34)

ہو سکتا ہے یہ الفاظ ان کے آخری الفاظ ہوں اور وہ خود سے باتیں کرتے ہوئے، خود کو سمجھاتے ہوئے اللہ کے روبرو عرضِ حال رکھ رہے ہوں۔ اس لیے کہ وہ اس کتاب کی تیاری کے مراحل کے دوران بہت بیمار تھے اور اپنے اہلِ خانہ کو دلاسے اور تسلیاں دینے کے ساتھ ساتھ خود کو بھی تسلیاں دے رہے تھے۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ انھوں نے کس جاں سوزی کے ساتھ یہ تحریر قلم بند کی ہوگی۔

آیئے اس دردانگیز دنیا سے باہر چلتے ہوئے ان کے چند اشعار پڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ انھوں نے کیسے کیسے جاں گسل حالات و واقعات کو اپنی خوب صورت شاعری میں پیش کیا ہے۔

میں کسی اور ہی رستے کا مسافر ٹھہرا
تو مرے واسطے یوں اشک بہاتا کیوں ہے
کریں گے درد کی تفصیل کو بیاں کیسے
سمجھ سکو تو خموشی میں کچھ اشارے ہیں
کانٹے بوتی ہے دنیا تو بونے دو
ہر دم بن کے پھول کھلیں گے ہم دونوں
یہ خوشگوار سی لہریں تمھیں مبارک ہوں
تھپیڑے اپنے ہیں، خفیہ بھنور ہمارا ہے

کسی اور رستے کا مسافر، میرے واسطے اشک بہانا، درد کی تفصیل، خاموش اشارے، کانٹے بوتی دنیا، ہم پھول کی طرح کھلیں گے، خوشگوار لہریں، تھپیڑے اور

خفیہ بھنور شاعر کے اندرون کے درد اس طرح بیان کرتے ہیں کہ راشد انور راشد کی شاعری کا پورا منظر نامہ سامنے آجاتا ہے۔

یہی نہیں انھوں نے تغزل سے بھرپور اشعار بھی پیش کیے ہیں، جو ان کی ذہنی کیفیتوں کی جانب خوبصورت اشارے کرتے ہیں اور یہ گمان پختہ یقین میں بدل جاتا ہے کہ انھوں نے شاعری کے ہر گوشے پر بھرپور توجہ دی ہے۔

جہاں تک راشد انور راشد کی نظموں کا تعلق ہے، ان میں بھی حادثات زمانہ اور سماجی تانے بانے کے تصورات جا بہ جا بکھرے نظر آتے ہیں اور راشد کے انداز نظم نے انھیں تخلیق کرکے نظم نگاروں کی صف میں ایک فرض کفایہ ادا کیا ہے جن میں بے رنگ زندگی، قیمت، بھول، مشکل وقت، ذمہ داری، آنکھ اور خواب اور 'بڑے معصوم تھے تم' وغیرہ بہت اہم نظمیں ہیں اور نظمیہ شاعری کی کسوٹی پر پورا اترنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ایک نظم 'قیمت' ملاحظہ کریں۔

میں نے دستک دی کہ دروازہ محبت کا کھلے
ایک عرصے سے جو طاری ہے خموشی، ٹوٹے
دستکیں دینے سے جب بات نہیں بن پائی
میں نے مجبوری میں دی اپنی زباں کو زحمت
اپنے ہونے کا پھر احساس دلایا اس کو
پھر بھی ناکامی ملی، ذہن پریشان رہا
بند کمرہ مرا منہ تکتا رہا دیر تلک
کوئی آہٹ نہ ہوئی اور نہ کھلا دروازہ
پھر اچانک کوئی آواز سنی کانوں نے
اس نے کچھ بھدے سے الفاظ نکالے منہ سے
میں پلٹ آیا کہ پھر ضبط کی قوت نہ رہی
تھا کبھی مہنگا میں بازار محبت میں مگر
آج معلوم ہوا، اب مری قیمت نہ رہی

اس مجموعے سے قبل ان کے کئی مجموعے شائع ہوکر پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے ہیں، جیسے شام ہوتے ہی، کہرے میں ابھرتی پرچھائیں، گیت سناتی ہے ہوا، دھوپ ایسی تو نہیں تھی پہلے، قریب آؤ (ہندی) اور 'تڑپ اٹھتا ہوں یادوں سے لپٹ کر' سے راشد کی شاعری کے مختلف گوشے سامنے آچکے ہیں۔ ان کی تنقیدی کتابوں کی تعداد بھی پندرہ ہے، چند کتابیں مرتبہ ہیں اور تین کتابوں کا انھوں نے ترجمہ کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بہت کم وقت میں ادبی دنیا کو اپنے گراں قدر خزینوں سے مالا مال کیا ہے۔

پروفیسر کوثر مظہری نے جس اہتمام سے 'ایک قطرہ ہی سہی' کو شائع کیا ہے اس سے اس کتاب کی صوری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔ ان کی اہلیہ روحی انجم جنھوں نے اس کتاب کو اشاعت کے لیے پیش کیا امید ہے اس کی اشاعت ان کے دیرپا غم کا مداوا ثابت ہوگی۔

■

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

240 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................. بتاریخ.................. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/240 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے 'خبر نامہ' میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی و ثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان و ادب کی سمت و رفتار کا بھی۔

یہ خبرنامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہِ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

بچوں کے لیے معیاری اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ادب کی تخلیق ناگزیر: ڈاکٹر شمس اقبال

قومی اردو کونسل کے زیرِ اہتمام پٹنہ کالج میں 'ادبِ اطفال کی تخلیق: چیلنجز و امکانات' کے عنوان سے مذاکرہ اور اہم مطبوعات کا اجرا

پٹنہ: آج پٹنہ کالج، پٹنہ کے سیمینار ہال میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیرِ اہتمام "ادبِ اطفال کی تخلیق: چیلنجز و امکانات" کے عنوان سے ایک اہم ادبی پروگرام منعقد ہوا، جس میں کونسل سے شائع شدہ چند اہم کتابوں کے اجرا اور مذاکرے

کا بھی اہتمام کیا گیا۔ پروگرام کا آغاز قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شمس اقبال کے افتتاحی کلمات سے ہوا۔ انھوں نے اپنی گفتگو میں ادبِ اطفال کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ادب اطفال دراصل نسلِ نو کی فکری تربیت کا اہم وسیلہ ہے اس لیے بچوں کو صحت مند سوچ سے آراستہ کرنے کے لیے معیاری ادبِ اطفال کی تخلیق ناگزیر ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو میں موضوعات کی سطح پر بھی ادبِ اطفال کا دائرہ پھیلانے کی ضرورت ہے تاکہ بچے اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنے ماضی سے جڑے رہیں۔ اپنی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہمیں بچوں کے لیے ایسا ادب تخلیق کرنا ہوگا جو معلوماتی بھی ہو اور تفریحی بھی، تاکہ وہ مطالعے کی طرف راغب ہوں۔ انھوں نے کہا محض نصیحتوں پر مبنی بچوں کی کتابیں انھیں پڑھنے کی ترغیب نہیں دے سکتیں۔ آج کے دور میں بچوں کے لیے ایسی کتابیں لکھنے کی ضرورت ہے جو ان میں اختراعی صلاحیت پیدا کریں، ان کی تخلیقیت کو بیدار کریں اور ان کے اندر تنقیدی سوچ کو پروان چڑھائیں۔ صدارتی تقریر کرتے ہوئے ممتاز شاعر و تخلیق کار جناب مظفر ابدالی نے کہا کہ ادب اطفال محض کہانی نہیں بلکہ بچوں کے ذہنی اور اخلاقی ارتقا کا ذریعہ ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وقت کا تقاضا ہے کہ بچوں کے لیے ایسا ادب تخلیق کیا جائے جو ان کے ذہن میں تخلیقی امنگیں پیدا کرے اور انھیں کتاب سے محبت کرنا سکھائے۔

مہمانِ خصوصی جناب آفاق احمد (ممبر بہار لجسلیٹیو کونسل) نے اپنے خطاب میں کہا کہ ادب کسی بھی قوم کی تہذیبی شناخت ہوتا ہے اس لیے بچوں کے لیے اچھا ادب لکھنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ انھوں نے قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شمس اقبال کی کوششوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ کونسل ادب اطفال کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو کام کر رہی ہے وہ لائق تحسین ہے۔ معروف فکشن نگار محترمہ ذکیہ مشہدی نے اپنے خطاب میں کہا کہ بچوں کی نفسیات کے مطابق کہانی لکھنا ہی اصل فن ہے۔ انھوں نے کہا کہ بچوں کی کتابیں جتنی زیادہ دل کش اور تصویروں سے مزین ہوں گی، بچے اتنے ہی شوق سے پڑھیں گے۔ معروف محقق و ناقد پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کہا کہ ہمیں موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق ادب اطفال کی نئی سمتیں تلاش کرنا ہوں گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو کو زندہ رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم اسے نصاب کے علاوہ بھی گھروں اور معاشرتی زندگی میں جگہ دیں۔ معروف ادیب جناب مشتاق احمد نوری نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ادب اطفال کے فروغ کے لیے مستقل بنیادوں پر لکھنے اور بچوں کے رسائل کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ اگر گھروں میں بچوں کو اردو پڑھائی جائے تو وہ اپنی تہذیبی شناخت اور اخلاقی اقدار سے بہتر طور پر روشناس ہوں گے۔ پروگرام میں ادب اطفال پر کونسل کی چار تازہ مطبوعات ''میں ہی مالک میں ہی نوکر'' (پروفیسر اعجاز علی ارشد)، ''ایک بچ مچ کے راج کمار کی کہانی'' (محترمہ ذکیہ مشہدی)، ''کائیں کائیں'' (جناب مشتاق احمد نوری)، ''انقلاب کی آواز: حسرت موہانی'' (ڈاکٹر قاسم خورشید) کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

پروگرام کی نظامت ڈاکٹر شاداب شمیم نے کی، جبکہ کلماتِ تشکر ڈاکٹر نعمان قیصر (شعبہ اردو، پٹنہ کالج) نے ادا کیے۔ اس موقعے پر ادب نوازوں، اساتذہ، طلبہ اور محبانِ اردو کی بڑی تعداد موجود رہی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 7 دسمبر 2025

قومی اردو کونسل میں 'سائبر ہائجین اور سائبر کرائم اویئرنیس' پر خصوصی لیکچر

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں آج 'سائبر ہائجین اینڈ سائبر کرائم اویئرنیس' پر خصوصی لیکچر کا اہتمام کیا گیا۔ پروفیسر ایم۔ این۔ ہدی نے اپنے لیکچر میں اس اہم موضوع پر نہایت معلوماتی اور مفید گفتگو کی۔ مہمان مقرر کا استقبال کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ سائبر فراڈ سے بچنا آج کے ڈیجیٹل دور میں بے حد ضروری ہے۔ ہم سب چونکہ ڈیجیٹل

دنیا میں زندگی گزار رہے ہیں، اس لیے سائبر کرائم اویئرنیس ہی ہمیں ممکنہ خطرات اور پریشانیوں سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ پروفیسر ایم۔ این۔ ہدی نے اپنے خطاب میں کہا کہ آج ہم ایسے عہد میں جی رہے ہیں، جس میں بعض جرائم ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں اور بعض پوشیدہ طور پر انجام پاتے ہیں، جن میں سائبر فراڈ بھی شامل ہے۔ لیکچر میں انھوں نے ڈیجیٹل دنیا میں محفوظ رہنے کے طریقوں، ٹیکنالوجی کے درست استعمال اور عمومی طور پر کی جانے والی غلطیوں سے بچاؤ پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انھوں نے زور دیا کہ سائبر فراڈ سے بچنے کے لیے ہمیں اپنے طرز زندگی میں تبدیلی لانے اور ڈیجیٹل شعور کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔

پروگرام کے اختتام پر جناب شاہ نواز خرم (ریسرچ آفیسر) نے شکریے کے کلمات ادا کیے۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کا پورا عملہ موجود تھا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 13 نومبر 2025

ترقی یافتہ بھارت بنانے کے لیے قومی ہم آہنگی و بھائی چارے کا استحکام ضروری: پروفیسر نزہت پروین خان

یومِ آئین کے موقعے پر قومی اردو کونسل میں خصوصی لیکچر

نئی دہلی: یوم آئین کے موقعے پر قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں ایک خصوصی لیکچر کا اہتمام کیا گیا۔ یہ لیکچر پروفیسر نزہت پروین خان (سابق ڈین شعبۂ قانونی

مطالعات، جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے دیا۔ انھوں نے اپنی گفتگو میں دستورِ ہند کے اہم نکات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہندوستانی آئین اس ملک کے ثقافتی، مذہبی و سماجی تنوع کو پیش نظر رکھ کر بنایا گیا ہے جس میں ملک بھر کے تمام سماجی طبقات کو انصاف، برابری اور حقوق فراہم کرنے کی وکالت کی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس دستور میں بھائی چارہ اور قومی ہم آہنگی پر بھی خاص زور دیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ تمام شہریوں کی ذمے داری ہے کہ وہ ملک میں بھائی چارہ اور قومی ہم آہنگی کو نہ صرف قائم رکھیں بلکہ اس کے استحکام پر بھی توجہ دیں۔ پروفیسر نزہت نے کہا کہ اس دستور میں سماجی برابری پر بھی خاص توجہ دی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی شہری کے ساتھ ذات برادری، رنگ و نسل اور مذہب و جنس وغیرہ کی بنیاد پر تفریق نہیں کی جاسکتی۔ انھوں نے وکست بھارت میں سماجی، ثقافتی و مذہبی یکجہتی پر خاص زور دیا اور کہا کہ اگر ہم 2047 تک ہندوستان کو حقیقی معنوں میں ترقی یافتہ بنانا چاہتے ہیں تو ثقافتی، سماجی و مذہبی یکجہتی اور ہم آہنگی کو نہ صرف برقرار رکھنا ہوگا بلکہ اس میں درآنے والی کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے بھی اجتماعی کوشش کرنی ہوگی اور جو عناصر قومی ہم آہنگی کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں ان کی حوصلہ شکنی کرنی ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ ترقی یافتہ ہندوستان میں سماج کے تمام طبقات کو مساوی مواقع سے ہم کنار کرنے کے ساتھ اپنی ذمے داریوں کو نبھانے کا عادی بھی بنانا پڑے گا۔ تمام شہریوں میں اخلاقی و انسانی اقدار کی پاسداری، ملکی سطح پر امن و امان کی پختگی اور باہمی احترام کا جذبہ پایا جانا ضروری ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز اور سوشل میڈیا کی وجہ سے قومی ہم آہنگی کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اسے دور کرنے پر بھی ہمیں خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ انھوں نے بتایا کہ حکومت کی طرف سے بھی بھائی چارہ اور قومی یکجہتی کے استحکام پر زور دیا جا رہا ہے اور یوم آئین کے موقعے پر پورے ملک کو اس حوالے سے بیدار کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جو کہ ایک خوش آئند قدم ہے۔ پروفیسر خان نے کہا کہ ہم سب کو آج کے دن دستور ہند کو سمجھنے کے ساتھ اس کی روشنی میں اپنے حقوق و فرائض کو جاننے، سمجھنے اور عمل کرنے کا بھی عہد لینا چاہیے تاکہ ایک ذمے دار شہری کے طور پر اپنے ملک کی خدمت کرسکیں اور اسے ترقی یافتہ بنانے میں اپنے فرائض ایمان داری کے ساتھ انجام دیں۔

ڈاکٹر مسرت (ریسرچ آفیسر) کے اظہارِ تشکر کے ساتھ پروگرام کا اختتام ہوا۔ اس موقعے پر کونسل کا سبھی عملہ موجود رہا اور تمام شرکا نے دستور ہند کے دیباچے کی اجتماعی خوانندگی کے ذریعے اس کے تمام مشمولات پر عمل درآمد کا عہد لیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 26 نومبر 2025

ویجیلینس بیداری ہفتہ کی مناسبت سے قومی اردو کونسل میں لیکچر

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے صدر دفتر میں ویجیلنس بیداری ہفتہ کے تحت 'ویجیلنس: ہماری مشترکہ ذمہ داری' کے موضوع پر ایک تربیتی پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں ڈائرکٹر جناب رویندر کمار نے خطبہ پیش کیا۔ ادارہ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے ویجیلنس کے اہم نکات کی جانب اشارہ کیا اور دفاتر میں اس نوعیت کے خطبے کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ آج کے فاضل مقرر نے موضوع پر تفصیلی اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہم سب کا یہ معمول ہوگیا ہے کہ اپنے فائدے کے پیش نظر دنیا کو پہنچنے والے نقصانات کا خیال نہیں کرتے۔ جس سے بھاری نقصان ہوتا ہے۔ حالیہ دنوں میں ایک کمی یہ بھی دیکھی گئی ہے کہ ہم دھیرے دھیرے اپنی ذات تک ہی محدود ہوکر رہ گئے ہیں۔ لہٰذا جب تک ہم اپنی ذات سے باہر نکل کر نہیں سوچیں گے، حقائق کا علم نہیں ہوگا۔ انھوں نے مزید اظہار خیال کرتے ہوئے اتھکس پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور اسے جانچنے کے طریقے بتائے۔ نیز اس کا شعور و ادراک کتنا ضروری ہے، اس کے متعلق مثالیں بھی پیش کیں۔ کوڈ آف کنڈکٹ کو اہم قرار دیتے ہوئے بہتر طور پر فرائض انجام دینے کے لیے ہر سرکاری ملازم کے لیے اس کے مطالعہ کو اہم قرار دیا۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کا عملہ بھی موجود رہا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 17 نومبر 2025

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

اردو دنیا کی سب سے خوبصورت زبان ہے: کرن رجیجو

نئی دھلی: اقلیتی امور کے وزیر کرن رجیجو نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے 105ویں یوم تاسیس کے موقعے پر اظہار

خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو دنیا کی سب سے خوبصورت زبان ہے۔ انھوں نے ہندوستان کی ثقافت اور جمہوری جذبے کی عکاسی کرنے پر یونیورسٹی کی تعریف کی۔ انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ میں آپ کو یاد دلانا چاہوں گا کہ مہاتما گاندھی اور سروجنی نائیڈو جیسی عظیم ہستیوں نے اس یونیورسٹی کے قیام کے وقت اس کی حمایت کی تھی۔ یونیورسٹی میں قومی تعلیمی پالیسی (این ای پی) کے نفاذ کی تعریف کرتے ہوئے کرن رجیجو نے کہا کہ وہ اس کے تعلیمی ریکارڈ اور قومی درجہ بندی سے بہت متاثر ہیں۔ مرکزی وزیر نے ہندوستان کی آئینی طاقت اور تنوع پر بھی زور دیا۔ کرن رجیجو نے کہا کہ سماجی ہم آہنگی کو برقرار رکھنا سب کی اجتماعی ذمے داری ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 30 اکتوبر 2025

فخرالدین علی احمد یادگاری خطبہ

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیراہتمام فخرالدین علی احمد یادگاری خطبے کا انعقاد ہوا، جس میں ملک کی معروف علمی و ادبی شخصیات نے شرکت کی۔ اس موقعے پر کلیدی خطبے میں سپریم کورٹ کے سابق جسٹس سدھانشو دھولیا نے زبان، تاریخ اور معاشرتی

ہم آہنگی کے حوالے سے نہایت اہم گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ زبان صرف اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ تہذیب، یادداشت اور مشترکہ ورثے کا حصہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ اردو اور ہندی دونوں ایک ہی زبان کی شکلیں ہیں، صرف رسم الخط کا فرق ہے اور یہی زبان ہندوستان کی گلیوں، بازاروں، مشاعروں، فلموں اور روزمرہ بول چال میں زندہ ہے۔ تقریب کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے چیئرمین جسٹس بدرورریز احمد نے کی۔ انھوں نے کہا کہ آج کے دور میں یہ غلط فہمی عام ہو چکی ہے کہ اردو کوئی بیرونی زبان ہے، جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ انھوں نے واضح کیا کہ اردو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئی، پروان چڑھی اور آج بھی اسی سرزمین کی تہذیب اور شناخت کا حصہ ہے۔ اس سے قبل انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ اس سلسلے کا مقصد ایسی علمی شخصیات کو دعوت دینا ہے جن کے خیالات سماجی اور فکری سطح پر نئی راہیں کھولنے کا سبب بنیں انھوں نے کہا کہ فخرالدین علی احمد کا خواب تھا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ ہر دانشور کے مکالمے کا مرکز بنے۔ تقریب میں متعدد علمی، ادبی اور سماجی شخصیات نے بھی شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 نومبر 2025

فروغ اردو کی عملی تدبیریں

نئی دہلی: اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے زیر اہتمام 9 نومبر کو غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں عالمی یوم اردو کی پروقار تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر مقررین نے کہا کہ اردو ہماری مادری زبان ہے، یہ کسی مخصوص مذہب کے ماننے والوں کی نہیں بلکہ تمام مذاہب کے پیروکاروں کی زبان ہے۔ لہٰذا اہل اردو کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے تحفظ اور فروغ کی کوشش کریں۔ اس موقعے پر حسب روایت ایک وقیع مجلّے کا اجرا ہوا جو کہ اس عہد کے جید صحافی عالم نقوی کی حیات و خدمات پر شائع کیا گیا ہے۔

'فروغ اردو کی عملی تدبیریں' کے زیرعنوان منعقد ہونے والے قومی سمپوزیم میں ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان میں قومی سرمایہ اور ہمارا بہت بڑا مذہبی سرمایہ بھی موجود ہے۔ ہمیں اس کی بھی حفاظت کرنی ہے اور اردو زبان کی بھی کرنی ہے۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے سربراہ اور اس تقریب کے روح رواں ڈاکٹر سید احمد خاں نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے اس بات کا جائزہ لیا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اردو تعلیم کا سلسلہ کمزور ہو گیا۔ اردو گھرانوں سے اردو کیوں ختم ہوتی جارہی ہے۔ انھوں نے اردو اخبارات کی اشاعت میں مسلسل گراوٹ اور قارئین کی تعداد میں کمی پر اظہار تشویش کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو کی ترویج و ترقی کا انحصار اردو اسکولوں کی تعداد پر ہے۔ جن ریاستوں میں اردو میڈیم اسکولوں کی تعداد زیادہ ہے وہاں اردو پھل پھول رہی ہے۔

بزرگ ادیب اور قلم کار پروفیسر محسن عثمانی نے یوم اردو کی مناسبت سے نہایت مفید باتیں کہیں، انھوں نے کہا کہ اردو کے متقدمین ادبا و شعرا کی تخلیقات کا مطالعہ

بھی کریں تاکہ آپ کے علم کے میں اضافہ ہو۔ پروفیسر اخترالواسع نے کہا کہ اردو کا تعلق معدے سے نہیں بلکہ دل سے قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اردو کی زبوں حالی کے لیے دوسروں کو موردِ الزام ٹھہرانے کے بجائے اپنے رویے پر غور کرنا چاہیے۔ سینئر صحافی اور ادیب معصوم مرادآبادی نے کہا کہ اردو کی زبوں حالی کے لیے ہم صرف غیروں کو قصوروار قرار نہیں دے سکتے۔ ہماری بے حسی نے شمالی ہندوستان میں اردو کو خود اپنے بچوں کے لیے اجنبی بنایا ہے۔ سینئر صحافی و ادیب سہیل انجم نے پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے کہا کہ آج کا دن جہاں ہمیں خوشی ومسرت کے اظہار کا موقع دیتا ہے وہیں یہ ہمیں خود احتسابی کی دعوت بھی دیتا ہے۔ ڈاکٹر سید فاروق نے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں گھر گھر اردو تعلیم کا بندوبست کرنا چاہیے۔ دوحہ قطر سے آنے والے مہمان اعزازی ڈاکٹر وصی الحق وصی نے اردو زبان پر اپنی نظم پیش کی۔ مولانا علیم الدین اسعدی نے اردو کی موجودہ صورت حال اور اس کے تعلق سے اہل اردو کے رویے کا جائزہ لیا۔ ممبئی سے آنے والے یاسین مومن نے کہا کہ مہاراشٹر میں اردو تعلیم کا سب سے اچھا نظام ہے۔ ڈاکٹر عبدالحی خان، مولانا سراج الدین ندوی اور دیگر مقررین نے بھی اظہار خیال کیا۔

اس موقعے پر اردو کے سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دینے والی تقریباً تین درجن شخصیات کو مومنٹو، شال اور سرٹیفکیٹ پیش کیا گیا۔ جبکہ متعدد نئی کتابوں اور رسالوں کا اجرا بھی عمل میں آیا اور چند طلبہ کو دسویں اور بارہویں جماعت میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے پر حوصلہ افزائی ایوارڈز دیے گئے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی درجہ چہارم کی طالبہ انعم فاطمہ نے اردو پر ایک نظم سنائی۔ متین امروہوی اور دیگر نے اپنا کلام پیش کیا۔ آخر میں ایڈووکیٹ شاہ جبیں قاضی اور ڈاکٹر عبدالمجید علیگ نے سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: حکیم سید احمد خان، دہلی، 10 نومبر 2025

یوم تعلیم پر مذاکرہ

نئی دھلی: حکیم اجمل خاں فورم فار پیس اینڈ کمیونل ہارمنی کی جانب سے دریا گنج، نئی دہلی میں واقع آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے دفتر میں ممتاز قومی رہنما، بھارت کے پہلے وزیر تعلیم مولانا آزاد کی یوم پیدائش

کے مناسبت سے منسوب یوم تعلیم پر 11 نومبر 2025 کو ایک مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت بھیونڈی شہر کے معروف ملی رہنما ایڈووکیٹ یسین مومن نے کی۔ انھوں نے کہا کہ بھارت میں 11 نومبر کو ہر سال یوم تعلیم کے طور پر منایا جانا خوش آئند ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش کو یوم تعلیم کے طور پر منایا جانا ان کو بہترین خراج عقیدت پیش کرنا ہے۔ مولانا ایک عظیم مفکر اور علم وعرفان کے روشن چراغ تھے۔ نئی نسلوں کو مولانا کی شخصیت اور قومی خدمات کے بارے میں معلومات فراہم کیا جانا چاہیے۔ بھوپال شہر کے معروف لیڈر خالد خاں نے کہا کہ تعلیم کامیابی کی کنجی ہے۔ مولانا نے نسل نو کو یہ مثبت پیغام دیا تھا جسے اختیار کیا جانا لازمی ہے۔ مولانا علیم الدین اسعدی نے کہا کہ مولانا آزاد کی تعلیمی فکر کو آگے بڑھانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ڈاکٹر سیّد احمد خاں نے کہا کہ مولانا آزاد کی تعلیمی پالیسی ملک کے سیکولر کردار کے عین مطابق تھی۔ مولانا آزاد ملک میں قومی یکجہتی کے علمبردار تھے۔ آج کے ماحول میں اُن کے افکار کو عام کیا جانا نہایت ضروری ہے۔ اس موقعے پر ایڈووکیٹ شاہ جبیں قاضی، اسرار احمد اُجینی، حکیم محمد مرتضیٰ دہلوی، ڈاکٹر شکیل احمد اور ڈاکٹر غیاث الدین صدیقی وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔ تمام شرکا کا شکریہ محمد عمران قنوجی نے ادا کیا۔

ڈاکٹر سیّد احمد خاں، جنرل سکریٹری، حکیم اجمل خاں فورم فار پیس اینڈ کمیونل ہارمنی، دہلی، 11 نومبر 2025

ریسرچ اسکالر سمینار

نئی دھلی: غالب اکیڈمی، نئی دہلی کے ریسرچ اسکالر سمینار کی صدارتی تقریر میں پروفیسر محمد معظم الدین

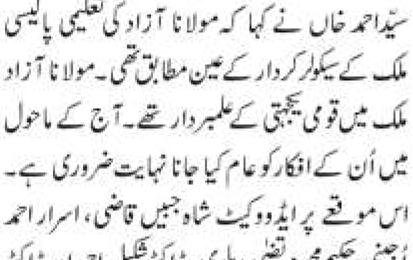

نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ تحقیق بہت ذمے داری کا کام ہے اس میں قوت انتخاب، قوت حافظہ، قوت استدلال، قوت استنباط کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ نتیجے کے طور پر تردید بھی ہوسکتی ہے اور تائید بھی۔ پڑھے گئے مقالات پر انھوں نے سیر حاصل گفتگو کی۔ سمینار میں انزلابی نے زاہدہ خاتون پر ایک مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ زاہدہ خاتون پہلے اپنا کلام زخ ش کے نام سے لکھتی تھیں۔ عبدالرحمان نے کلام مجذوب میں تصوف کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے محمد ناظم نے ظفر احمد صدیقی کے انتخاب کردہ کلام مومن پر مضمون پیش کیا۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے کلیم احمد نے محمد بہاؤالدین صفی اورنگ آبادی کی شاعری پر مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ صفی اورنگ آبادی قادرالکلام شاعر تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی صائمہ یوسف نے مابعد جدیدیت پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ مابعد جدید تنقید نے متن وقاری کے بیچ رشتے کو بحال کیا۔ علی گڑھ کے طاہر حسین نے شمیم حنفی کے مطالعہ اقبال پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اقبال کا شعری آہنگ خود ساختہ ہے وہ عالمی منظر نامے پر ممتاز شخصیت کے حامل ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی یاسمینہ ایوب نے سریندر پرکاش کے افسانے دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کے افسانے ڈرامائی اور نفسیاتی انداز کے ہوتے ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ سات مقالے پڑھے گئے جو ریسرچ اسکالر کے اپنے تحقیق کے موضوع سے متعلق تھے۔ ان مقالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ طلبا بڑی محنت اور لگن سے تحقیق میں مصروف ہیں۔

روزنامہ ’صحافت‘ دہلی، 7 دسمبر 2025

جشن یوم ذوق

نئی دہلی: انجمن ترقی اردو دہلی شاخ کے زیر اہتمام اور بہ تعاون غالب انسٹی ٹیوٹ وغالب اکیڈمی ’یوم ذوق‘ کا انعقاد 22 نومبر 2025 کو غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں ہوا۔ جلسے کی صدارت فارسی کے معروف محقق ونقاد پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کی۔ انھوں نے کہا ذوق کی شخصیت اپنے زمانے میں سب سے زیادہ ممتاز سمجھی جاتی تھی۔ پروفیسر محمد کاظم نے کہا کہ درجہ بندی تنقید کا ایک فریضہ ہے لیکن یہ ضروری

نہیں کہ ایک شاعر کا امتیاز ثابت کرنے کے لیے دوسرے سے موازنہ کیا جائے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ ذوق غالب کے معاصر بھی ہیں اور حریف بھی اس لیے اس عہد کو سمجھنے کے لیے اس زمانے کے رائج تمام رجحانات کو نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ انجمن ترقی اردو (دہلی) کے صدر اقبال مسعود فاروقی نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہم ہر سال 'یوم ذوق' کا اہتمام کرتے ہیں اور اس طرح اردو کے ایک نہایت ممتاز شاعر کا کلام اور ان کی زندگی زیر بحث آتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس بار بھی جو گفتگو ہو اس سے ذوق فہمی کا کوئی نیا گوشہ سامنے آئے۔ غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ ذوق کا عہد اردو کا زریں عہد ہے۔ ذوق کا دیوان دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں مختلف اصناف میں کیسی قدرت حاصل تھی۔ خصوصاً قصیدے کے میدان میں تو وہ بہت ممتاز ہیں۔ اجلاس کے بعد طرحی مشاعرے کا انعقاد ہوا جس کی صدارت جناب ظفر مرادآبادی نے کی اور جناب معصوم مرادآبادی نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ مشاعرے کی نظامت معین شاداب نے کی۔ وقار مانوی، متین امروہوی، اقبال فردوسی، اسد رضا، صہیب احمد فاروقی، پروفیسر عفت زریں، شاہد انور، ڈاکٹر دلدار دہلوی اور ارون شریواستو وغیرہ نے کلام پیش کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 25 نومبر 2025

رفعت سروش کی تقریب صد سالہ

نئی دہلی: اردو کے مشہور شاعر، ادیب، ڈرامہ نگار اور براڈ کاسٹر رفعت سروش کی 17 ویں برسی اور صد سالہ یوم پیدائش کی تقریب انڈیا ہیبی ٹیٹ سینٹر دہلی میں منعقد ہوئی۔ جس کا اہتمام پرواز شاہین رفعت سروش اکیڈمی

نے کیا تھا۔ انڈیا ہیبی ٹیٹ سینٹر کے ہال میں ادب اور موسیقی کی ایک حسین شام منعقد کر کے رفعت سروش کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر رفعت سروش کے ادبی سرمائے کو محفوظ کرنے اور ان کی شاعری اور ادبی سرمائے کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس موقعے پر پروفیسر شہپر رسول (سابق صدر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے رفعت سروش: 'ادب وشعر کا ایک ہمہ رنگ آئینہ' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ نظامت پروفیسر شاہینہ خان نے کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر خان رضوان، عادل حیات، ڈاکٹر فرزانہ، سرفراز احمد وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 دسمبر 2025

علم العروض پر توسیعی لیکچر

نئی دہلی: شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی میں 'علم العروض: اصول ومبادی' کے عنوان سے ایک نہایت اہم توسیعی لیکچر منعقد ہوا، جس میں عروض اور فن شعر کی باریکیوں کے ماہر پروفیسر احمد محفوظ (شعبہ اردو، جامعہ ملیہ

اسلامیہ) نے اپنا پر مغز لیکچر دیا۔ پروگرام کی صدارت شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر محمد نعمان خان نے کی۔ اس سے قبل شعبہ عربی میں توسیعی لیکچر کی روایت کا تذکرہ اور مہمان مقرر کا استقبال کرتے ہوئے صدر شعبہ پروفیسر سید حسنین اختر نے کہا کہ شاعری در اصل خیالات کو مؤثر اور خوبصورت موسیقیت کے سانچے میں پیش کرنے کا نام ہے۔ تاریخی روایت کے مطابق ساتویں صدی عیسوین میں سب سے پہلے عربی زبان کے مشہور عالم خلیل بن احمد فزاہیدی نے اس فن کے اصول وضوابط مرتب کیے۔ فن عروض ایک مشکل فن ہے اور ہندوستان میں پروفیسر احمد محفوظ ان چنندہ اساتذہ میں ہیں جو اس فن کی باریکیوں سے بخوبی واقف ہیں اور اس موضوع پر ان سے بہتر کوئی انتخاب نہیں ہوسکتا۔ پروفیسر احمد محفوظ نے فن عروض کے تاریخی پس منظر، بنیادی اصولوں اور اوزان وبحور کی ساخت پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ 'عروض' شعر کی موزونیت اور آہنگ کو جاننے کا فن ہے۔ انھوں نے زور دیتے ہوئے کہا کہ اگرچہ شاعری کے لیے اس فن کا جاننا ضروری نہیں، چنانچہ اس فن کے اصول مرتب کیے جانے سے قبل بھی عربی شاعری کا بڑا ذخیرہ ہمارے درمیان موجود ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ شعرا اپنی داخلی اور فطری موسیقیت کا سہارا لیتے ہوئے موزوں شاعری کرتے رہے ہیں۔ تاہم اس علم کی اہمیت وافادیت کا اندازہ اشعار کی صحیح تقطیع اور ان کے فنی تجزیے سے ہوتا ہے۔ پروفیسر محمد نعمان خان نے اپنے صدارتی خطاب کے دوران عروض کو ایک عملی فن قرار دیتے ہوئے کہا کہ شاعری داخلی استعداد کا بیرونی اظہار ہے، اسی وجہ سے اسے الہامی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ موضوع کے تناظر میں پروفیسر احمد محفوظ کا انتخاب نہایت عمدہ ہے اور انھوں نے اس خشک موضوع کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ عربی وسنسکرت کے درمیان مماثلت کا ضمنی تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ دونوں زبانوں کی فیملی جدا ہیں اور اس دعوے کا کوئی ثبوت نہیں ہے خلیل فزاہیدی نے یہ فن سنسکرت سے اخذ کیا تھا۔ قبل ازیں پروگرام کے کنوینر ونقیب ڈاکٹر مجیب اختر نے مقرر کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ پروفیسر احمد محفوظ ان چنندہ اہل علم میں شامل ہیں جنھوں نے اردو کے نامور ادیب وناقد پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی سے کسب فیض کیا ہے اور آج اردو ادب میں ایک مستند ومعتبر نام ہے۔ پروگرام میں شعبہ عربی کے سابق صدر پروفیسر نعیم الحسن، ڈاکٹر محمد اکرم وغیرہ کے علاوہ بڑی تعداد میں طلبہ، اسکالرز اور جامعہ ملکہ اسلامیہ ودیگر یونیورسٹیوں اور کالجوں کے ریسرچ اسکالرز نے شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی 28 نومبر 2025

بزم صوفی فیسٹویل

نئی دہلی: شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی میں خواجہ احمد فاروقی میموریل لائبریری میں بزم صوفی فیسٹویل کا انعقاد کیا گیا۔ یہ پروگرام بہ اشتراک بزم لیٹریچر فاؤنڈیشن اور شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے تعاون سے منعقد کیا گیا۔ اس تقریب میں ڈاکٹر ملیکا مشرا (لکسواوا کے فاؤنڈر)

مہمان خصوصی کے طور پر شامل ہوئے۔

یہ تقریب ایک کوی سمیلن۔ مشاعرہ اور صوفی بینڈ کی کارکردگی پر مشتمل تھا۔ پروگرام کا افتتاح انوشا دسنوی نے کیا۔ وسیم سید حارتھ نگری نے مشاعرے کی نظامت کی۔ محفل کی شروعات شاعرہ ایشیکا بھارتی نے اپنے کلام کے ذریعے کیا۔ بعدازاں محترمہ مسکان مجید، ثاقب مجید اور محترم کبیر وغیرہ نے اپنے اپنے کلام پیش کیے۔

اس کے بعد عاشق معشوق کے عنوان پر صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ابوبکر عباد نے اپنی نظم پیش کی۔ اس کے بعد کرنل سنجے چترویدی اور آرون شریواستو، بزم لیٹریچر فاؤنڈیشن کے فاؤنڈر رشبھ سیٹھ اور محترم معین شاداب وغیرہ نے اپنی شاعری سے محفل کی رونق کو خوب بڑھایا۔ پھر صوفی بینڈ کی محفل سجی جس میں دانش خان، وشال شرما، بھاشکر ورما اور روینے نے غزل، گیت اور صوفی قوالی سے مجمع کو مسحور کر دیا۔ آخر میں پروگرام کے صدر محترم الوک اوبرال نے صدارتی خطبہ پیش کیا اور اپنے کلام سے نوازا۔ رشبھ سیٹھ نے تمام مہمان، اساتذہ اور طلبہ کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ صحافت 2 دسمبر 2025

قومی تعلیمی پالیسی پر سمینار

نئی دہلی: شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں قومی تعلیمی پالیسی اور زبانوں کی تعلیم کے موضوع پر ایک خصوصی سمینار منعقد ہوا جس میں این سی ای آر ٹی کے شعبۂ تعلیم،

لسانیات کے سربراہ پروفیسر محمد فاروق انصاری نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے اپنے خطاب میں قومی تعلیمی پالیسی 2020 نیشنل کریکولم فریم ورک 2023 اور سہ لسانی فارمولہ اور کثیر اللسانیات کے نفاذ پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے بتایا کہ نئی پالیسی کا بنیادی مقصد تنقیدی سوچ، تخلیقی صلاحیت اور اقدار پر مبنی تعلیم کو فروغ دینا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ پہلے نصابی مواد صرف چار زبانوں میں تیار ہوتا تھا، اب 22 زبانوں میں میں مواد مرتب کیا جا رہا ہے تاکہ علاقائی اور مقامی زبانوں کو مزید تقویت مل سکے۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر خالد اشرف نے قومی تعلیمی پالیسی کو زبانوں کی تدریس کے لیے نئی جہتوں کا آغاز قرار دیتے ہوئے کہا کہ مختلف زبانوں میں نصاب سازی تدریسی عمل کے معیار کو بہتر بنائے گی۔ پروگرام کی نظامت پروفیسر ابوبکر عباد نے کی جب کہ شکریے کی رسم پروفیسر مشتاق عالم قادری انجام دیے۔

روزنامہ انقلاب 28 نومبر، 2025

اترپردیش

پروفیسر اعجاز حسین یادگاری خطبہ

پریاگ راج: شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی میں 14 اکتوبر 2025 کو پروفیسر اعجاز حسین یادگاری خطبہ کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں بنارس ہندو یونیورسٹی کے سابق

صدر شعبۂ اردو پروفیسر نسیم احمد نے اٹھارویں صدی کی اردو شاعری پر کلیدی خطبہ دیا۔ علاوہ ازیں انھوں نے تحقیقی اصول اور مسائل پر بھی گفتگو کی۔ کلاسکی شعرا کے دواوین پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ صحیح متن دریافت کرنا ہم سب کی ذمے داری ہے۔ یادگاری خطبے کی صدارت اردو کے مشہور ترقی پسند نقاد، سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر علی احمد فاطمی نے کی۔ اپنی صدارتی تقریر میں فاطمی نے اٹھارویں صدی کی اردو شاعری کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ہر صدی کی شاعری اپنی پچھلی صدی کی شاعری سے وابستہ ہوتی ہے۔ ایک کے بغیر دوسری کا وجود ناممکن ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ میر کی شاعری کا عکس فراق کی شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر سودا نے نظم نگاری کی شروعات نہ کی ہوتی تو آگے چل کر اردو نظم نگاری کا فروغ مشکل ہوتا۔ تقاریر سے قبل پروفیسر نسیم احمد کی دو کتابیں انتخاب کلیات سودا اور مصحفی کا دیوان ششم کی رسم اجرا کی گئی۔ یادگاری خطبہ کے کنوینر ڈاکٹر سنجے کمار نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ معاون کنوینر ڈاکٹر ظفراللہ انصاری نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ شکریے کی رسم ڈاکٹر محمد کاشف نے ادا کی۔ اس موقعے پر شعبہ کے تمام ریسرچ اسکالرا ور طلبہ وطالبات موجود رہے۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر سنجے کمار، الہ آباد، 25 نومبر 2025

اردو میں افسانہ نگاری کی روایت

وارانسی: 13 نومبر 2025 کو ڈی اے وی پی جی کالج، وارانسی میں شعبۂ اردو اور IQAC کے زیر

اہتمام ایک خصوصی لکچر کا انعقاد کیا گیا، جس میں بطور مہمان خصوصی ڈاکٹر مشرف علی، ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی شامل ہوئے۔ اس خصوصی لکچر 'اردو میں افسانہ نگاری کی روایت' کے سرپرست کالج کے سکریٹری اور منیجر عالی جناب شری اجیت سنگھ رہے جب کہ صدارت کالج کے پرنسپل جناب پروفیسر مشری لال نے کی۔ صدارتی خطبے میں پروفیسر مشری لال نے بڑے ہی موثر اور آسان لفظوں میں ادب اور افسانوں کے حوالے سے انسانی زندگی اور انسانیت کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔

مہمان خصوصی ڈاکٹر مشرف علی نے اپنے خصوصی لیکچر میں کہا کہ اردو میں افسانہ نگاری کی ایک مستحکم روایت رہی ہے۔ پریم چند کے زور قلم سے جس صنف نے چلنا سیکھا اور سماجی و معاشرتی زندگی کی حقیقتوں کی عکاس بنی، آج وہ ایک تناور درخت کی شکل میں موجود ہے۔ پریم چند سے لے کر موجودہ عہد تک اردو افسانہ نگاروں نے زندگی کے حالات و مسائل کو اپنی فکری و فنی مہارت سے افسانے کے کینوس پر بخوبی پیش کیا ہے اور کئی شاہکار افسانے تخلیق کیے ہیں۔

مہمانوں اور شرکا کے لیے استقبالیہ کلمات ڈاکٹر شمشیر علی، شعبۂ اردو ڈی اے وی پی جی کالج نے ادا

کیے اور نظامت کا فریضہ بھی انجام دیا۔ اظہارِ تشکر کی رسم ڈاکٹر نجم الحسن، شعبۂ انگریزی، ڈی اے وی جی کالج نے ادا کی۔ اس خصوصی لیکچر میں کالج کے طلبہ و طالبات اور مختلف شعبۂ کے اساتذہ شامل رہے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر شمشیر علی، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، ڈی اے وی پی جی کالج، وارانسی، 13 نومبر 2025

محفلِ اعزاز

علی گڑھ: البرکات سینٹر آف کمپیوٹر سائنس اینڈ لینگویجز میں محفلِ اعزاز کے سلسلے میں ایک خوب صورت پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ اس نشست کی

صدارت البرکات سید حامد کمیونٹی کالج کے ڈائریکٹر ڈاکٹر سیّد محمد عثمان نے کی۔ اس موقعے پر البرکات ایجوکیشنل سوسائٹی کے جوائنٹ سکریٹری، ڈاکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی، خطبۂ استقبالیہ کے لیے تشریف لائے۔ انھوں نے محفل کے مہمانِ خصوصی، ڈاکٹر شمس اقبال (ڈائریکٹر قومی اردو کونسل، دہلی) کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا اور ان کی آمد کو ادارے کے لیے باعثِ سعادت قرار دیا۔ انھوں نے اپنے خطاب میں قومی اردو کونسل دہلی کی اردو زبان کے لیے نمایاں قومی خدمات کا ذکر کیا اور اس بات پر اطمینان ظاہر کیا کہ البرکات ایجوکیشنل سوسائٹی کے تحت دہلی کی قومی کونسل کا سینٹر گزشتہ دس برس سے زائد عرصے سے پوری ذمے داری کے ساتھ خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس کے بعد اردو ڈپلومہ کی طالبہ عالیہ نے مرزا غالب کی غزل کے چند منتخب اشعار پیش کیے۔ پھر مبشر خان نے قومی اردو کونسل دہلی کا تفصیلی تعارف پیش کیا اور اس کی علمی و ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر شمس اقبال نے اپنے خطاب میں طلبہ کو نصیحت کی کہ ہر زبان سیکھنی چاہیے، ہر علم حاصل کرنا چاہیے؛ لیکن اپنی تہذیب اور ثقافت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ انھوں نے اے ایم یو میں منعقد ہونے والے بک فیئر کے بارے میں بھی طلبہ کو آگاہ کیا اور مطالعے کی عادت اپنانے پر زور دیا۔ اس کے بعد چیف کنوینر عبید الرحمٰن نے اپنے تمام کورسز کی رپورٹ پیش کی۔

آخر میں ہدیۂ تشکر کے لیے ڈاکٹر فہیم عثمان صدیقی، کوآرڈینیٹر انسٹیٹیوشنل البرکات، نے تمام اساتذہ کرام اور مہمانِ خصوصی کا شکریہ ادا کیا۔ اختتام پر البرکات پبلک اسکول کے چند طلبہ و طالبات نے ترانۂ البرکات اور قومی ترانہ خوش آوازی کے ساتھ پیش کیا۔

رپورٹ: محمد عاصم، استاد شعبۂ اردو، البرکات این سی پی یو ایل، علی گڑھ، 22 نومبر 2025

اردو ہندی عالمی کانفرنس

لکھنؤ: پانچویں بین الاقوامی اردو۔ ہندی عالمی کانفرنس کا افتتاحی اجلاس 30 نومبر کو ایرا میڈیکل یونیورسٹی، لکھنؤ میں نہایت کامیابی کے ساتھ منعقد ہوا۔ ملک وبیرون ممالک برطانیہ، خلیجی ممالک، تاشقند و ترکمنستان وغیرہ کی ممتاز علمی، ادبی اور سماجی شخصیات کی شرکت نے اس اجلاس کو یادگار اور تاریخی بنا دیا۔

نظامت کے فرائض ڈاکٹر ریشماں پروین نے انجام دیے۔ افتتاحی لمحات میں اردو کے معروف شاعر جناب عمر انصاری مرحوم کی مشہور نظم 'اردو کی کہانی اردو کی زبانی' نظم کے چند منتخب اشعار معروف غزل گو ڈاکٹر پربھا سریواستو نے پیش کیے۔ جس پر سامعین نے بھرپور داد دی۔ مہمان خصوصی سابق وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر مرکزی وزیر غلام نبی آزاد نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو اور ہندی صرف زبانیں نہیں، بلکہ ملک کی تہذیب و یکجہتی کی بنیاد ہیں۔ دنیا کے مختلف ممالک اپنی زبانوں کو مضبوط بنا کر اپنی تہذیب ثقافت اور علمی شناخت کو محفوظ کر رہے ہیں اور یہی مقصد ہمیں بھی اردو اور ہندی دونوں کے فروغ کے لیے پیش نظر رکھنا چاہیے۔

کانفرنس کے چیئرمین اور سابق کارگزار وزیر اعلیٰ ڈاکٹر عمار رضوی نے اپنے خطاب میں موجودہ لسانی چیلنجز پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آج اردو نامہ نگاروں کی تعداد کم ہو رہی ہے اور اردو اخبارات کی کمی ہمارے لسانی و فکری، بحران کی نشاندہی کرتی ہے۔ انھوں نے زور دیتے ہوئے کہا کہ وقت آ گیا ہے کہ ہندوستان میں ایک بین الاقوامی 'ترجمہ ہاؤس' قائم کیا جائے تاکہ نئی نسل کو معیاری زبان، عالمی ترجمے اور لسانی تربیت کا مضبوط پلیٹ فارم فراہم ہو سکے۔ اگر اردو کو آنے والی نسلوں میں زندہ رکھنا ہے تو ایسے علمی اداروں کا قیام ناگزیر ہے۔

پروگرام کی صدارت سابق رکن پارلیمنٹ اور سابق وزیر برائے خواتین فلاح وسیاحت پروفیسر ڈاکٹر ریتا بہوگنا جوشی نے کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو اور ہندی ہندوستان کی روح میں بسی ہوئی زبانیں ہیں، جنھوں نے ہمیشہ مشترکہ تہذیب اور بھائی چارے کو تقویت بخشی ہے۔ اٹل بہاری واجپئی میڈیکل یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر سنجیو مشرا اور ایرا میڈیکل یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر عباس علی مہدی نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ مقررین کا کہنا تھا کہ اردو اور ہندی وہ مضبوط تہذیبی ستون ہیں جنھوں نے ہندوستانی معاشرے کو ہمیشہ جوڑے رکھا ہے اور اس عالمی کانفرنس کے ذریعے زبانوں کے ڈیجیٹل مستقبل کی نئی راہیں کھلیں گی۔ بین الاقوامی کانفرنس کے اسی اجلاس میں پدم شری پروفیسر مہدی حسن کو ان کی علمی، ادبی اور سماجی خدمات کے اعتراف میں خصوصی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ شرکا نے ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے انھیں اردو اور ہندی کی مشترکہ تہذیبی روایت کا روشن چراغ قرار دیا۔

روزنامہ صحافت 'اتر پردیش'، 2 دسمبر 2025

اسمٰعیل میرٹھی کا یومِ پیدائش

میرٹھ: اسماعیل نیشنل مہیلا پی جی کالج کے بانی مولانا محمد اسماعیل میرٹھی کے یوم پیدائش کے موقعے پر شعبۂ اردو اور بی ایڈ کے زیر اہتمام ایک پروگرام کا انعقاد کالج

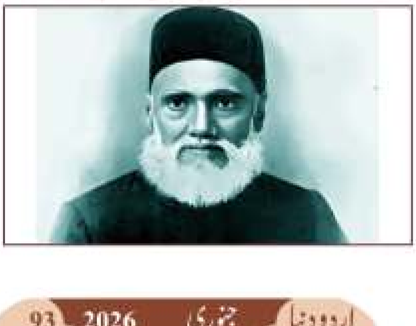

کی پرنسپل پروفیسر انیتا راٹھی کی رہنمائی میں کیا گیا جس میں سب سے پہلے اسماعیل میرٹھی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی تصویر پر پھول چڑھائے گئے۔ پروگرام کی کو آرڈینیٹر ڈاکٹر عفت ذکیہ نے کالج کے بانی اسمٰعیل میرٹھی کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم کے لیے بنیادی طور پر تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ نمبر ایک تعلیمی ادارہ، دوم نصاب اور سوم استاذ اسمٰعیل میرٹھی نے ان تینوں ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ انھوں نے اسمٰعیل نیشنل مہیلا پی جی کالج قائم کرکے تعلیمی ادارے کی کمی کو پورا، کیا نصاب کے خلا کو پر کرنے کے لیے ریڈرس اور نظمیں تحریر کیں اور بطور استاذ اپنی خدمات پیش کیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر عفت ذکیہ نے اسمٰعیل میرٹھی کی غزل 'نتیجہ کیوں کر اچھا ہونہ ہو جب تک عمل اچھا' ترنم میں پیش کرکے ماحول کو مترجم کر دیا۔ ڈاکٹر شاذیہ نے بین مذاہب دعائیہ اجتماع کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہمیں تمام مذاہب کا احترام کرنا چاہیے، اتحاد، بھائی چارہ اور محبت کو اپنانا چاہیے۔ ہندوستان ایک ایسا ملک جہاں بہت سے مذاہب، ذات اور ثقافتوں کے لوگ رہتے ہیں، پھر بھی ہم سب متحد ہیں۔ یہ ہماری سب سے بڑی طاقت ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 نومبر 2025

تہذیب الاخلاق کی عصری معنویت

میرٹھ: جو حال پر توجہ دیتا ہے اس کا مستقبل روشن ہوتا

ہے۔ سرسید نے ایک رسالہ نہیں نکالا بلکہ انسان کے جینے کا طریقہ ایجاد کیا۔ اردو میں سب سے پہلے تبصرہ نگاری کی شروعات تہذیب الاخلاق سے ہوئی۔ یہ الفاظ تھے معروف محقق و ناقد پروفیسر مجید بے دار کے جو آیوسا اور شعبہ اردو کے زیر اہتمام منعقد 'رسالہ تہذیب الاخلاق کی عصری معنویت' موضوع پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبہ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی اور صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ مہمانان خصوصی کے بطور معروف ناقد پروفیسر مجید بے دار سابق صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد اور معروف شاعر پروفیسر فاروق بخشی سابق صدر شعبہ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد نے شرکت فرمائی۔ مقررین کے بطور آفاق احمد خاں اور لکھنؤ سے ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین موجود رہیں۔ جب کہ مقالہ نگار کے بطور علمہ نصیب ریسرچ اسکالر شعبہ اردو، سی سی ایس یونیورسٹی اور عظمیٰ مہدی، مظفرنگر نے شرکت کی۔ استقبالیہ اور تعارفی کلمات ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور نظامت کے فرائض شعبے کے ریسرچ اسکالر شاہ زمن اور آسیہ میمونہ نے شکریے کی رسم انجام دی۔ اس موقعے پر معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' نے اپنے مضامین کے ذریعے نیا اور بڑا کارنامہ انجام دیا۔ آج تک یہ رسالہ جاری ہے۔ اس رسالے نے دیگر رسائل کے مقابلے میں زیادہ مقبولیت حاصل کی۔

یہ رسالہ پوری قوم کی تہذیب اور اخلاق کی بات کرتا ہے۔ اس میں سنجیدہ قسم کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ آفاق احمد خاں نے کہا کہ اگر آج ہم دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ معاشرہ آج بھی پیچیدہ حالات میں گھرا ہوا ہے۔ سرسید کے نظریے کی مانند آج بہت کم رسالے سامنے آئے ہیں مگر سرسید کے خیالات اور جدید تعلیم کو عام کرنے میں رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کی بڑی اہمیت ہے۔ پروفیسر فاروق بخشی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ سرسید احمد خاں ادبی دنیا میں ایک ایسی شخصیت ہیں جن کے حوالے سے سینکڑوں کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

روزنامہ ہمارا سماج 'اتر پردیش'، 7 نومبر 2025

مدھیہ پردیش

ادب میں ترجمے کی روایت

بھوپال: مدھیہ پردیش اردو اکادمی سنسکرتی پریشد محکمہ ثقافت کے زیر اہتمام اردو اور دیگر زبانوں کے باہمی

تعلق کے تحت ادب میں ترجمے کی روایت کے موضوع پر مبنی سمینار اور شعری نشست کا انعقاد مہادیوی ورما ہال، ہندی بھون، پولی ٹیکنک چوراہا بھوپال میں کیا گیا۔ پروگرام کی شروعات میں اردو اکادمی کی ڈائرکٹر ڈاکٹر نصرت مہدی نے پروگرام کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو اکادمی کے زیر اہتمام منعقدہ اس پروگرام کا مقصد ترجمہ کی ثروت مند روایت کو آگے بڑھانا اور اردو ہندی کے ثقافتی پل کو مزید مستحکم کرنا ہے، کیونکہ ترجمہ محض الفاظ کا تبادلہ نہیں بلکہ خیالات اور ثقافت کا فروغ ہے۔ آج کے دور میں علم اور ادب کی وسیع پیمانے پر رسائی ترجمہ کے بغیر ممکن نہیں۔ اس مقصد کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اکادمی نئے مترجمین کی تیاری اور لسانی مکالمے کو فروغ دینے کے لیے پرعزم ہے۔ پروگرام کی صدارت کر رہے ممتاز ادیب و دانشور ڈاکٹر تقی عابدی، کناڈا نے 'اردو میں ترجمے کی روایت ابتدا تا حال' موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو میں تراجم کو وہ اہمیت کبھی نہیں ملی جو ملنی چاہیے تھی اور اسے اردو میں اکثر دوئم درجے کا ادب ہی سمجھا گیا، حالانکہ اردو زبان اپنی ابتدا سے ہی ترجمے کی زبان رہی ہے۔ انھوں نے آگے کہا کہ اکیسویں صدی میں جب دنیا گلوبل ویلیج بن چکی ہے تو آج اردو ترجمہ کے میدان میں بھی کئی مسائل کا سامنا ہے کیونکہ اب مصنوعی ذہانت (آرٹیفیشیل انٹلیجنس) کی وجہ سے مشینی ترجمہ بھی عام ہو گیا ہے، لیکن مشینی ترجمہ کبھی بھی انسان کے کیے ہوئے ترجمے کی جگہ نہیں لے سکتا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ جب ترجمہ میں تخلیقیت آجاتی ہے تو ترجمہ سونے پر سہاگہ ہو جاتا ہے۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 28 نومبر 2025

مہاراشٹر

سلور جبلی تقریب

پونے: دی دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ، پونے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے کمپیوٹر سنٹر کے قیام کے 25 سال مکمل ہونے پر ایک پروقار سلور جبلی تقریب ہوٹل ٹاؤن پلازہ، پونے میں نہایت ہی تزک و احتشام

کے ساتھ منعقد کی گئی۔ اس تقریب میں ادارے کے قدیم وجدید طلبہ وطالبات کے علاوہ شہر واطراف کے معززین نے بھی بڑی تعداد میں شرکت کی۔ تقریب کی صدارت محترمہ عابدہ انعام دار صاحبہ (صدر دی دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ) نے کی، جب کہ نظامت کے فرائض محترمہ ڈاکٹر عظمت دلال اور محترمہ آمنہ خان نے بالترتیب نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیے۔

اس اہم تقریب میں جناب وویک ساونت (چیف میٹر، مہاراشٹر نالج کارپوریشن لمیٹڈ (MKCL) نے مہمان خصوصی اور جناب اسلم شیخ صاحب فاؤنڈر اینڈ سی ای او۔ الف اوورسیز ممبئی) اور جناب رضوان خان صاحب (وائس پریسیڈنٹ ڈچ بینک انڈیا) نے مہمانانِ اعزازی کے طور پر شرکت کی۔ اس سلور جبلی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے جناب وویک ساونت نے انٹرنیٹ اور اس سے وابستہ جدید ترین ٹیکنالوجیز پر نہایت مفصل اور معلوماتی گفتگو کی۔ انھوں نے خاص طور پر مصنوعی ذہانت (AI) مشین لرننگ، ڈیجیٹل ٹرانسفارمیشن اور ان کے روزمرہ زندگی میں استعمالات پر روشنی ڈالی۔ جناب ساونت صاحب نے حاضرین کو بتایا کہ مستقبل میں تعلیم، روزگار اور کاروبار کے میدانوں میں AI کس طرح انقلاب برپا کرسکتی ہے۔

جناب اسلم شیخ نے دی دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ اور اُس کے کمپیوٹر سینٹر کی شاندار خدمات اور اس کے قابل فخر کارناموں کو زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ ادارہ ریاست مہاراشٹر، بالخصوص پونے شہر میں جدید تعلیم کا ایک مثالی اور معتبر مرکز بن چکا ہے۔ محترمہ عابدہ انعامدار صاحبہ نے اپنے صدارتی خطبے میں انفارمیشن ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر سائنس کی تعلیم کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اگر انسان اس جدید تعلیم سے آراستہ ہو جائے تو وہ کامیابی اور ترقی کی نئی منزلوں کو حاصل کرسکتا ہے۔

اس پچیس سالہ تعلیمی سفر کی تکمیل کے موقعے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر شمس اقبال نے ویڈیو کانفرنسنگ کے ذریعے اپنی دلی خوشی اور مسرت کا اظہار کیا۔ انھوں نے دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ کی جدید تعلیمی خدمات کو خوب سراہا اور ادارے کے تمام اساتذہ منتظمین اور طلبہ وطالبات کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کی۔ اس تاریخ ساز تقریب میں وویک ساونت کے ہاتھوں پلیسمنٹ بک کا رسم اجرا بھی عمل میں آیا۔ اخیر میں محترمہ شیخ نوشاد نصیر صاحبہ (ممبر دی دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ) کے کلمات تشکر کے ساتھ سلور جبلی تقریب باضابطہ طور پر اختتام پذیر ہوئی۔

پریس ریلیز، دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ پونے

سری نگر

'راہی کی وراثت'

سری نگر: ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے نوجوانوں کو خواب دیکھنے کی ترغیب دی۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا تھا کہ 'نئی نسل تو ہماری نسل سے بھی زیادہ خسارے میں ہے۔ ہمارے پاس کوئی خواب نہیں تھا مگر ان کے پاس تو جھوٹ ہیں'۔ راہی چاہتے تھے کہ نوجوان اپنی قوت ارادی کو پہچانیں اور آگے بڑھیں۔

اس سمینار میں بھی راہی کے نظریات اور وژن کو عام لوگوں تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔ یہ باتیں جموں کشمیر کے لیفٹننٹ گورنر منوج سنہا نے 'راہی کی وراثت' کے افتتاحی اجلاس میں بطور مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے کہیں۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر پروفیسر نیلوفر خان (وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی) نے کی جب کہ پروفیسر نوین چندر لونی (وائس چانسلر اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی) اور برج موہن شرما (پرنسپل سکریٹری کلچر، جموں وکشمیر) بطور مہمان اعزازی موجود تھے۔ مشہور بالی ووڈ نغمہ نگار سمیر انجان نے کلیدی خطبہ دیا۔ آصف اعظمی (ڈائرکٹر آئیڈیا کمیونیکیشن) نے استقبالیہ خطبہ پیش کیا اور پروفیسر پرویز احمد (ڈین اسٹوڈنٹس ویلفیئر، کشمیر یونیورسٹی) نے شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر شاہد علی خان نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر نور امروہوی (معروف اردو شاعر) اجیت سنگھ (ایڈیٹر بھوجپوری سنگم) وجے دھر (ماہر تعلیم وچیئرمین ڈی پی ایس۔ ڈائرکٹر آئی این او ایکس ملٹی پلیکس) اور پروفیسر مرزا محمد زماں آزردہ (اردو ادیب و ماہر راہی ادب) کو علمی، ادبی اور سماجی خدمات کے اعتراف میں تعریفی اسناد سے نوازا گیا۔

پروفیسر نیلو خان نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ راہی معصوم رضا جیسے ادیب ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ ادب صرف سماج کا آئینہ نہیں بلکہ اس کا رہنما بھی ہے۔ سمیر انجان نے کہا کہ راہی صاحب نے لفظوں کو جس طرح روح سے جوڑا ہے وہی انھیں منفرد بناتا ہے۔ فلمی نغموں سے لے کر ناولوں تک، ان کی زبان عام آدمی کی دھڑکن بن جاتی ہے۔

مجلس فخر بحرین کے بانی وصدر شکیل احمد صبرحدی نے اپنے پیغام میں کہا کہ راہی صاحب کا ادب زمین کی سوندھی سانسوں سے پھوٹنے والا وہ نغمہ ہے جس کے سبھی سروں میں انسانیت اور یکجہتی کا نور ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں گنگا کی طہارت اور مٹی کی صداقت کو اس طرح یکجا کردیا کہ گنگا جمنی تہذیب کا احساس

امرت بن کر دل و دماغ میں پھیل جاتا ہے۔ پروفیسر نوین چندر لوہنی نے کہا کہ راہی صاحب کا ادب سرحدوں کا نہیں بلکہ احساسات کا ادب ہے جو آج کے دور میں اور زیادہ معنویت اختیار کر چکا ہے۔ آصف اعظمی نے کہا کہ اس بین الاقوامی سمینار کا مقصد راہی کے صد سالہ جشن کا بگل بجانا ہے، جو اگست 2026 سے شروع ہوگا۔ ان کی فکر آج میں مکالمے کی زبان میں زندہ ہے۔ راہی کی وراثت کے اس سہ روزہ بین الاقوامی سمینار میں قطر سے عزیز نبیل، امریکہ سے ڈاکٹر نور امروہوی، دہلی یونیورسٹی سے پروفیسر ابوبکر عباد، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پروفیسر شافع قدوائی، مغربی بنگال اسٹیٹ یونیورسٹی کلکتہ سے پروفیسر ارون ہوتا، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے ڈاکٹر مشیر احمد، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی دہلی سے پروفیسر جتیندر شریواستو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد سے پروفیسر غضنفر علی خان، دین دیال اپادھیائے یونیورسٹی گورکھپور سے پروفیسر دیپک پرکاش تیاگی، کشمیر یونیورسٹی سے پروفیسر اعجاز محمد شیخ اور خلیل الرحمٰن کے علاوہ دہلی اور دیگر مقامات سے اردو ہندی کے تقریباً چالیس پروفیسر و اسکالرز نے اپنے مقالے پیش کیے۔ پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ راہی معصوم کے علمی اور تخلیقی کارناموں کا اردو تنقید میں ذکر بہت کم جاتا ہے اور ان کی تعین قدر ابھی اردو تنقید کے ناخن پر قرض ہے۔ اس سمینار میں راہی معصوم رضا کی تفہیم کی سنجیدہ کوشش کی جا رہی ہے تاکہ ہندوستانی ادبیات کی آبیاری میں راہی کے کردار کو واضح کیا جا سکے۔ پروفیسر نوین چندلوہنی نے اپنے خطاب میں کہا کہ اس سمینار میں پڑھے گئے سبھی مقالوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ثابت ہوتا ہے کہ راہی معصوم رضا کی ضرورت آج کے اس سماجی، تہذیبی اور معاشی منظرنامے میں بہت زیادہ ہے۔ ان کی تخلیقات کا مطالعہ ہمارے وقت کا مطالعہ اور سماجی رواداری کی سہی سمت فراہم کرتا ہے۔ پروفیسر جتندر سریواستو نے کہا کہ راہی معصوم رضا کے تعلق سے ان کی وراثت کو سنبھالنے کے لیے اور اس کو آگے بڑھانے کے لیے جو کوشش آئیڈیا کمیونکیشنز نے کی ہے وہ قابل ستائش ہے، اس وقت راہی کی تخلیقات کی بہت زیادہ معنویت اور اہمیت ہے ان کی تمام تر تحریریں ایسی ہیں جن پر غور کرنا چاہیے اور نئی نسل کو اس پر غور کرنا چاہیے کہ نئے ہندوستان کی تعمیر میں کیسے رول ادا کرتا ہے۔

روزنامہ صحافت 11/11/2025، ص۔03

ہریانہ

نشہ اور اردو ناول

چنڈی گڑھ: پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ کے شعبۂ اردو میں مصنف سے ملاقات کے تحت 'نشہ اور اردو ناول' کے موضوع پر ایک خصوصی مذاکرے کا انعقاد کیا

گیا جس میں مہمانِ خصوصی کے طور پر مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر رینو بہل شامل ہوئیں۔ رینو بہل کے نئے ناول 'دشت بے نوا' کو اس موقعے پر خصوصیت سے زیر بحث لایا گیا ہے۔ واضح ہو کہ اس ناول میں انھوں نے پنجاب میں روز بروز بڑھتے ہوئے نشہ اور اس سے متاثرین کی جہنم آسا زندگیوں کو موضوع بنایا ہے۔ رینو بہل نے بتایا کہ اس کہانی کے تمام کردار حقیقی ہیں۔ محض نام بدل کر کہانی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ گفتگو کے دوران ڈاکٹر بہل نے بتایا کہ اس ناول کو کاغذ پر اتارنے سے پہلے انھوں نے پنجاب کے مختلف گاؤں اور شہروں کا دورہ کیا اور متاثرین سے ملاقات کرنے اور ان کی کہانیاں سننے کے بعد محسوس ہوا کہ اسے ناول کا روپ دینا بے حد دشوار ہے لیکن اپنی تخلیقیت کے جوہر دکھاتے ہوئے انھوں نے نشہ کرنے والے ایک مردہ شخص کی روح کو کردار کی صورت میں اس طرح پیش کیا کہ جو گھر کے آنگن میں پیڑ کے اوپر بیٹھ کر اپنے گھر کے معاملات اور اپنی ماں بیوی اور بہن کو تکلیف میں دیکھتا مگر کچھ کر نہ سکتا تھا۔ اس طرح نشہ محض ایک فرد پر نہیں بلکہ اس کے پورے گھر اور سماج کی زندگیوں پر کس طرح منفی اثر ڈالتا ہے، دیکھا جا سکتا ہے۔ اس پروگرام میں پروفیسر ریحانہ پروین نے صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے سماج میں بڑھتے نشے اور نوجوانوں کی تباہ حالی پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ سماج کا ہر شخص اپنی ذمے داری سمجھے اور جہاں بھی کوئی بچہ اس طرف جاتا ہوا نظر آئے اسے اس دلدل سے بچانے کی کوشش کی جائے۔ صدر شعبہ ڈاکٹر علی عباس نے ابتدائی گفتگو میں آئے ہوئے مہمانوں کا استقبال کیا اور ڈاکٹر رینو بہل کی ادبی خدمات پر مبارکباد پیش کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ذوالفقار علی نے بخوبی انجام دیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 13 نومبر 2025

اعزاز و اکرام

ڈاکٹر انا دہلوی

نئی دہلی: کل آل انڈیا پوئٹس کانفرنس گوہاٹی میں بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعرہ ڈاکٹر انا دہلوی کو 2025 کا سلور جوبلی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ اس

موقعت پر ادبی و شعری خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے تنظیم کے فاؤنڈر ڈاکٹر لاری آزاد نے تاج پہنا کر اور ڈیڑھ لاکھ روپے کا چیک دے کر عزت افزائی کی جہاں چیئرپرسن ڈاکٹر منووتی، سکریٹری ڈاکٹر سروجا وغیرہ موجود تھے۔ واضح ہو کہ 25 سال قبل بھی اسی تنظیم کے تحت 500 شاعرات کا انتخاب کیا گیا تھا، ان سب میں ڈاکٹر انا دہلوی پہلے ممبر کی اردو شاعرہ منتخب ہوئیں۔ ڈاکٹر انا دہلوی کو سلور جوبلی ایوارڈ ملنے پر امیر امروہوی نے مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر انا دہلوی کو سلور جوبلی ایوارڈ ملنا تعجب خیز بات نہیں بلکہ وہ اس ایوارڈ کی حقدار ہی تھیں کیونکہ انھوں نے بطور اردو شاعرہ پوری دنیا کی چھوٹی بڑی ادبی محفلوں میں جا کر جس طرح اردو کی زلف پریشاں کو سنوارا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 نومبر 2025

رسم اجرا

لولاک: چندر بھان خیال کی شاہکار نعتیہ نظم کا تجلیلی اور تنقیدی جائزہ'

نئی دہلی: نعت کہنا پل صراط سے گزرنا ہے، یہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے، یہ تو توفیق کی بات ہے۔ وہ بہت مبارک لوگ ہیں جن کے قلم سے نعت کا تعارف ہوتا ہے۔ چندر بھان خیال نے پردۂ نور میں جھانک کر جو کچھ دیکھا اسے انھوں نے اپنے نعتیہ کلام 'لولاک' میں قلم بند کردیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز اسلامی اسکالر، خطیب، مدبر و سابق ممبر پارلیمنٹ مولانا عبیداللہ اعظمی نے سید تقی عابدی کی کتاب 'لولاک: چندر بھان خیال کی شاہکار نعتیہ نظم کا تجلیلی اور تنقیدی جائزہ' کی رسمِ اجرا کے موقعے پر کیا۔ جناب سلمان خورشید نے کہا کہ آج جبکہ لوگوں کے درمیان دوریاں بڑھ رہی ہیں، اس طرح کی محفل کو آراستہ کرکے قومی ہم آہنگی کو پروان چڑھانا لائق ستائش ہے۔ انھوں نے چندر بھان خیال کو ان کی کتاب کے لیے اور سید تقی عابدی کو اس کے تجزیے کے لیے مبارکباد پیش کی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام منعقدہ اس پروگرام کی صدارت پدم شری پروفیسر اخترالواسع نے کی جبکہ نظامت کے فرائض معروف شاعر معین شاداب نے اپنے منفرد انداز میں انجام دیے۔

اس موقعے پر سید تقی عابدی نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ لولاک چار بحروں کی 750 اشعار پر مشتمل اور چھ حصوں میں منقسم ایک طویل نظم ہے جس میں چندر بھان خیال نے کئی نئی صنعتیں متعارف کرائی ہیں۔ وہ کچھ الفاظ کا گچھا بناتے ہیں اور اس میں معنی آفرینی خلق کرتے ہیں۔ شاعر نے دو آئینوں کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کردیا ہے۔ انھوں نے سامعین سے گزارش کی کہ وہ لولاک کا تنہائی میں مطالعہ کریں اور ایک ایک لفظ سے مستفید ہوں۔ مہمانانِ اعزازی مفتی عمران ظفر قاسمی اور ونود کمار ترپاٹھی 'بشر' نے چندر بھان خیال کو بخرنغگی سے پُر نعتیہ نظم 'لولاک' کے لیے مبارکباد پیش کی اور کہا کہ یہ کتاب خیال صاحب کے لیے باعثِ سعادت ہے۔ اس موقعے پر چندر بھان خیال نے سبھی معزز مہمانان اور سامعین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ حضرت محمدؐ سے میری عقیدت اندھی عقیدت نہیں بلکہ کھلی آنکھوں والی عقیدت ہے۔ آخر میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے تمام مندوبین کا شکریہ ادا کیا۔ اس پروگرام میں شہر کے معروف ادبی شخصیات نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، موسیٰ رضا، ساہتیہ اکادمی دہلی، 17 نومبر 2025

بچوں کی زمیں سے

حیدرآباد: آل انڈیا ادب اطفال سوسائٹی، نئی دہلی کی جانب سے شعبہ اردو حیدرآباد یونیورسٹی میں منعقدہ جشن بچپن میں مختلف کتابوں کا اجرا عمل میں آیا جس میں انشائیہ نگار محمد اسداللہ کی نظموں کا مجموعہ 'بچوں کی زمیں سے' بھی شامل تھا۔ معروف محقق اور ادیب ڈاکٹر

تقی عابدی کے ہاتھوں اس کتاب کا اجراء ہوا۔ پروفیسر یوسف زئی نے اس پر وقار تقریب کی صدارت کے فرائض انجام دیے۔

محمد اسداللہ کی نظموں کا مجموعہ 'بچوں کی زمیں سے' مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی ممبئی کی مالی اعانت سے منظر عام پر آیا ہے۔ کتاب کا پیش لفظ جناب سراج عظیم نے تحریر کیا ہے۔ اس میں بچوں کے لیے لکھے گئے منظوم ڈرامے اور نظمیں شامل ہیں۔ اس کتاب کی بیشتر تخلیقات اردو کے رسائل میں شائع ہوچکی ہیں۔

پریس ریلیز: جاوید حسین، ناگپور، 18 نومبر 2025

سنگ آتش

رامپور: صولت پبلک لائبریری میں افسانہ نگار ایس فضیلت کی 21 ویں کتاب 'سنگ آتش' کا رسم اجرا عمل میں آیا۔ سکریٹری ڈاکٹر عدنان ضیائی نے لائبریری کی

جانب سے مہمانان کا خیر مقدم کیا۔ صدارت ڈاکٹر محمود علی خاں صدر لائبریری نے کی جب کہ پروفیسر حسن احمد نظامی مہمان خصوصی رہے اور معروف ناظم مشاعرہ سید شکیل غوث نے نظامت کے فرائض بحسن و خوبی انجام دیے۔ ارم نعیم نے ایس فضیلت کی حیات، شخصیت اور ان کی کتب پر تفصیلی مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر الف ناظم، عتیق جیلانی سالک، اسرار احمد، پروفیسر ظہیر رحمتی نے ایس فضیلت اور ان کی تصنیف آتش سنگ پر مقالات پیش کیے۔ خلیق النسا نے منظوم خیالات پیش کیے۔ پروفیسر حسن احمد نظامی نے کہا کہ ایس فضیلت اردو طنز و مزاح نگاری کا ایک اہم نام ہیں۔ موجودہ دور میں لکھنے والوں کو چاہیے کہ ایس فضیلت کو پڑھیں۔ ڈاکٹر محمود علی خاں نے کہا کہ میں نے آتش سنگ کے ابتدائی مضامین پر نظر ڈالی تو کتاب کے مزید مطالعے کی تحریک ملی، نئی نسل کو ایس فضیلت کی کتب پڑھنا چاہیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 25 نومبر 2025

وفیات

سید راحت ہاشمی

دیوبند: دارالعلوم دیوبند کے سابق ناظم محاسبی اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے مشیر خاص سید محمد شفیع کے فرزند جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے سابق پروفیسر نیز آل انڈیا ریڈیو کے سابق ٹرانسلیٹر ومعروف اسکالر سید راحت ہاشمی کا طویل علالت کے بعد اپنے آبائی وطن دیوبند محلّہ میں علی الصبح تقریباً 88 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ بعد نماز فجر جیسے ہی راحت ہاشمی کے انتقال کی خبر عام ہوئی تمام عزیز و اقارب، رشتے دار، متعلقین، دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم وقف دیوبند، دیگر دینی مدارس کے علمائے کرام، ذمے داران واساتذہ،شہر کی علمی، ادبی وسماجی شخصیات نے اس سانحہ وفات پر اظہار افسوس کرتے ہوئے جملہ پسماندگان سے اظہار تعزیت کیا۔ مرحوم راحت ہاشمی یونین پریس دیوبند کے پروپائٹر فیصل مہدی کے حقیقی ماموں اور دیوبند کے مشہور ومعروف استاذ قاری محمد وامق صدیقی کے حقیقی خالو تھے۔

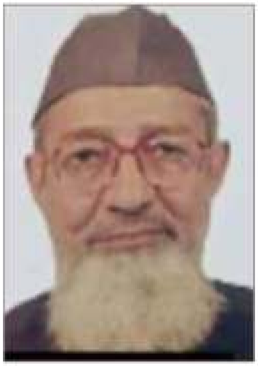

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 30 اکتوبر 2025

عبدالغفور ایڈووکیٹ

دیوبند: مظفرنگر کے دوھیڑوکی دینی علمی وسماجی شخصیت عبدالغفور ایڈووکیٹ آج اس دارفانی سے رخصت ہوگئے۔ عبدالغفور ایڈوکیٹ کی زندگی میں علم کی ترویج، تعلیمی اداروں کے قیام اور سماج میں پھیلی برائیوں کوختم کرنے کے لیے وقف تھی۔آپ ایک اچھے ایماندار وکیل تھے اور لمبے وقت تک وکالت کے پیشے سے منسلک رہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کو سماج کی فلاح وبہبود کے لیے وقف کردیا تھا۔ بچوں کی تعلیم پر خصوصاً لڑکیوں کی تعلیم پر بہت زیادہ فکرمند تھے اوراسی پر وہ کام کررہے تھے لیکن خدا کی مرضی ایسی ہی تھی کہ وہ اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ وہ اردوزبان وادب کے لیے عملی کوشش کرتے تھے،کورٹ پریکٹس کے دوران اپنا زیادہ تر دفتری کام اردو زبان میں کرتے تھے۔عملاً آپ اردو کے حقیقی علمبردار تھے۔ اقبالیات کے ماہر تھے، آپ کے ڈرائنگ روم میں علامہ اقبال کے اشعار دیکھنے پڑھنے کو ملتے، علامہ اقبال اسلامک لائبریری قائم کرکے آپ نے طلبہ ونوجوانوں میں اردو ادب اورفکر اقبال کو پروان چڑھانے کی کوشش کی۔

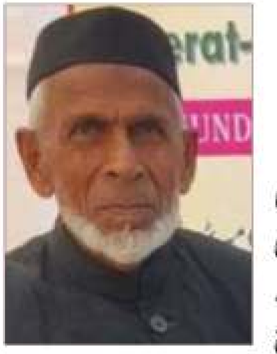

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 3 دسمبر 2025

پروفیسر دیوان حنان خاں

نئی دھلی: این سی ای آر ٹی سے وابستہ پروفیسر دیوان حنان خاں کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ساٹھ برس تھی۔ وہ کووڈ کے زمانے میں اپنے ایک دوست کی تیمارداری کے دوران اس مہلک وبا کا شکار ہوگئے تھے اور تب سے زیرعلاج تھے۔ دیوان حنان خاں کی پیدائش بہار کے بھبھوا ضلع میں یکم جنوری 1965 کو ہوئی تھی۔ انھوں نے کافی عرصہ اتر پردیش کے بنارس اور غازی پور میں گزارا۔ اعلیٰ تعلیم نئی دہلی کی جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے حاصل کی جہاں انھوں نے پروفیسر نصیر احمد خاں کی سرپرستی میں اردو میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ان کا سب سے اہم کارنامہ 'نیرنگ خیال' کا موضوعاتی اشاریۂ مرتب کرنا تھا۔ یہ اشاریہ 1924 تا1947 کے شماروں پر مشتمل ہے۔ یہ رسالہ جولائی 1924 میں حکیم یوسف حسن کی ادارت میں شائع ہوا تھا اوراس نے ادبی دنیا میں کئی سنگ میل قائم کیے۔ دیوان حنان خاں نے عبدالقوی دسنوی کا مونوگراف بھی لکھا جسے ساہتیہ اکادمی نے شائع کیا تھا۔تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ این سی ای آر ٹی سے بطور پروفیسر وابستہ ہوگئے جہاں انھوں نے کم وبیش اردو کی بیس درسی کتابوں کی صورت گری کی۔ دیوان حنان خاں کی تدفین 27 /نومبر کو بھبھوا ضلع کے بیور میں عمل میں آئی۔

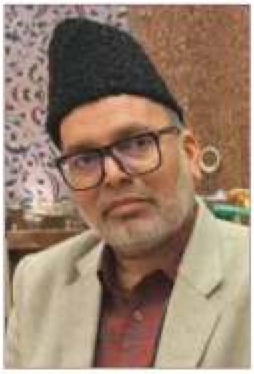

پریس ریلیز: معصوم مرادآبادی، دہلی، 1 دسمبر 2025

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

جن کتابوں نے متاثر کیا

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت ومعنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبان علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبان ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی ومعروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

علی گڑھ اردو کتاب میلہ کی تصویری جھلکیاں

उर्दू दुनिया, जनवरी–2026,वर्ष:28, अंक:01
URDU DUNIYA Monthly, January-2026, Vol.28, Issue:01
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/12/2025
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 A/C: ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Salasar Imaging Systems, A-97, Sector-58 Noida-201301(UP)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6